WWW.PAKSOCIETY.COM
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
مئی 2015
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظمہ — آذر ریاض

مدیرہ اعزازی — امت الصبور

قانونی مشیر — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

مستقل سلسلے

مئی 2015
جلد 29 شمارہ 9
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی-3، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726817, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع کا مئی کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔

ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ شعر ہو یا مصوری، تمام فنونِ لطیفہ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک حساس تخلیق کار زندگی کی ہر جہت کیفیات، مشاہدات اور تجربات کو خوبصورت الفاظ کا پیراہن عطا کرتا ہے اور کروڑوں دلوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

ادب کا ایک کام ذہنوں کو انبساط اور تفریح فراہم کرنا بھی ہے تاکہ زندگی کی کرب ناک سچائیوں اور تلخیوں سے نظر چرا کر کچھ دیر کے لیے خوابوں کے جزیرے میں پناہ لے سکیں۔ روشن اور خوشگوار پہلو بھی تو زندگی کا حصہ ہیں۔ کہانیوں میں مسائل کا تجزیہ ہونا چاہیے لیکن امید کے پیغام کے ساتھ۔ مایوسی بے عملی کو جنم دیتی ہے اور ایک بار ملنے والی قیمتی زندگی کو بے عملی کی نذر نہیں کیا جا سکتا۔

محمود ریاض صاحب،

وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدلتا جاتا ہے۔ ہر گزرنے والا لمحہ بہت کچھ پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتا ہے۔ کائنات میں کسی شے کو دوام نہیں۔ یہاں آنے والوں کو ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔

لیکن کچھ لوگ اس حیات مختصر میں ایسے نقش چھوڑ جاتے ہیں جو ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی ان کے نام کو زندہ رکھتے ہیں۔

ریاض صاحب کا شمار بھی ان ہی خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن علم، تہذیب اور شائستگی کے جو چراغ انہوں نے روشن کیے وہ آج بھی راہ دکھانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ، کرن اور شعاع نے خواتین اور نوعمر لڑکیوں کو صاف ستھری تفریح فراہم کی، ان میں مطالعے کا رجحان پیدا کیا اور نیکی اور سچائی کا راستہ دکھایا۔ ایک مثبت، تعمیری سوچ عطا کی۔

اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے سامنے آنے والے بہت سے نام میڈیا، چینلز پر چھائے ہوئے ہیں۔

محمود ریاض صاحب نے جو سوچ متعین کی تھی، ہم آج بھی اس سوچ اور فکر کو سامنے رکھ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔

اس شمارے میں،

- راشدہ رفعت کا مکمل ناول ۔ ہے زندگی کتنی حسین،
- سحرش خان بھٹو کا مکمل ناول ۔ چاند میری چوکھٹ پر،
- نگہت سیما کا مکمل ناول ۔ خواب تھا کوئی ۔ دوسری اور آخری قسط،
- صائمہ اکرم کا ناولٹ ۔ سیاہ حاشیہ،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- ایمل رضا، قرۃ العین خرم ہاشمی، حمیرا قریشی، دیناز محمد سلیم اور روشن ناز اختر کے افسانے،
- مقبول فنکارہ مدیحہ اشرف اسطارق کا بندھن،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- آپ کے سوال اور سیرا حمید کے جواب ۔ دو بدو،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

مئی کا شمارہ آپ کو کیسا لگا، خطوط کے ذریعے آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

اے خالقِ دو عالم ہے التجا تجھی سے
ہم کو بچالے یا رب ہر گمرہی بدی سے

تو ہی ہے سننے والا، بندوں کی سن دعائیں
عیبوں کو تو چھپالے اور بخش دے خطائیں

ستار نام تیرا، غفار نام تیرا
عیبوں کی پردہ پوشی بے شک ہے کام تیرا

آسان مشکلیں کر، عزت ہمیں عطا کر
رسوا نہ کر ہمیں تو، تو ہی ہے اپنا یاور

ہم ہیں حقیر بندے، بندہ نواز تو ہے
ہم پر نظر کرم کی، آمرزگار تو ہے

کہتا ہے پھول یا رب ہر شر سے تو بچالے
ہے کارساز تو ہی اب کچھ ترے حوالے

تنویر پھول

نعت رسول مقبولؐ

ہے کون شاہ دوسرا آپ کی طرح
کوئی نہیں رسولِ خدا، آپ کی طرح

اس واسطے حضورؐ کو بعثت عطا ہوئی
دنیا میں کوئی اور نہ تھا آپ کی طرح

اے امتِ حبیبِ خدا، تیرے واسطے
مانگے گا اور کون دعا آپ کی طرح

کیسے کوئی دلوں میں اتارے خدا کی بات
اوروں کی خامشی نہ صدا، آپ کی طرح

ثابت ہوئی یہ بات بھی قرآن پاک سے
واجب نہیں کسی کی ثنا آپ کی طرح

انسانیت کی راہ دکھانے کے باوجود
کوئی ہوا نہ راہ نما، آپ کی طرح

بندوں کا جو خدا کے رکھے ہر طرح خیال
خاور ہے کون بعید خدا آپ کی طرح

رحمان خاور (ملیگ)

طلاق کی اقسام

(1) مسنون طلاق

ایسی طلاق جو بیوی کو ایسے طہر میں دی جائے جس میں خاوند نے اس سے مقاربت نہ کی ہو اور ایک طلاق دے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں یا تجھے طلاق ہے اس کے بعد بیوی کا نان و نفقہ دیتا رہے اور عدت (تین حیض یا تین ماہ) تک اپنے گھر میں رکھے۔ عدت کے بعد جدا ہو۔ یہ طلاق کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ اس طرح دی گئی طلاق میں بالاتفاق عدت کے اندر رجوع کرنا اور عدت گزرنے کے بعد یہ نکاح جدید دوبارہ صلح کرنا جائز ہے۔

(2) غیر مسنون طلاق

ایسی طلاق جو عورت کو ایام حیض میں دی جائے یا اس طہر میں دی جائے جس میں مرد نے عورت سے قربت کی ہو یا ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں۔

(3) باطل طلاق

ایسی طلاق باطل ہو گی جسے مجبوری کی حالت میں دیا جائے یا نکاح سے پہلے ہی طلاق دے دے۔ نابالغ بچے، مجنون اور مدہوش کی طلاق بھی باطل ہو گی۔

(4) ایک ہی مجلس میں بیک وقت تین طلاقیں دینا

یہ بالاتفاق ناپسندیدہ اور ناجائز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر سخت ناراضی کا اظہار فرمایا اور اسے کتاب اللہ کے ساتھ کھیلنا قرار دیا ہے، تاہم اگر کوئی شخص اس طرح بیک وقت تین طلاقیں (زبانی یا تحریری) دے گا تو طلاق واقع ہو جائے گی لیکن احناف وغیرہ کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور اہل حدیث کے نزدیک یہ ایک ہی طلاق رجعی ہو گی۔ احناف کے نزدیک اس کے بعد رجوع اور صلح کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اہل حدیث کے نزدیک عدت کے اندر رجوع کرنا اور عدت گزرنے کے بعد ان کا باہم نکاح کرنا جائز ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے "ایک مجلس میں تین طلاقیں" از حافظ صلاح الدین یوسف)

طلاق سے متعلق احکام و مسائل

رجوع کرنا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی، پھر رجوع فرمالیا۔

(ابوداؤد)

فوائد و مسائل: امام العصر شیخ ناصر الدین البانی رحمتہ اللہ نے ایک روایت بیان کی ہے جس میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ رجوع فرمائیں اور کہا تھا کہ وہ روزہ رکھنے والی اور عبادت کرنے والی خاتون ہیں اور جنت میں آپ کی بیوی ہیں۔ اس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو انہیں زوجیت میں رکھنے کا حکم دیا۔

1۔ طلاق دینا جائز ہے' لیکن بلاوجہ طلاق دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

2۔ طلاق کے بعد رجوع کر لینے سے بیوی کو وہ تمام حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو طلاق سے پہلے حاصل تھے۔

ناپسندیدہ کام

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حلال کاموں میں سے اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند کام 'طلاق ہے۔" (حاکم)

طلاق دینے کا صحیح طریقہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"میں نے اپنی عورت کو طلاق دی جب کہ وہ ایام حیض میں تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اسے حکم دو کہ اس سے رجوع کرلے (اور اسے طلاق نہ دے) حتی کہ وہ (حیض سے) پاک ہو جائے' پھر اسے حیض آئے' پھر وہ پاک ہو' پھر اگر چاہے تو اس سے قربت کرنے سے پہلے طلاق دے اور چاہے تو اسے (نکاح میں) روک لے۔ یہ وہ عدت ہے' جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔"

فوائد و مسائل : اللہ تعالیٰ نے نکاح کا تعلق دائمی بنایا ہے' یعنی نکاح اس لیے کیا جاتا ہے کہ پوری زندگی اکٹھے گزاری ہے۔ اس تعلق کو پائیدار بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے احکام و آداب نازل کیے ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

نکاح کرتے وقت نیک' دین دار بیوی تلاش کرنے کا حکم دیا گیا۔

نکاح کا تعلق انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بنایا گیا ہے' یعنی ایک مرد کا ایک عورت سے تعلق نہیں بلکہ ایک خاندان کا دوسرے خاندان سے تعلق قائم کیا گیا ہے۔

اس مقصد کے لیے عورت کے سرپرستوں کی اجازت' گواہوں کی موجودگی اور دعوت ولیمہ جیسے احکام جاری کیے گئے ہیں۔

عورت کو مرد کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور مرد کو عورت کی غلطیاں اور کوتاہیاں برداشت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

عورت کی اصلاح کے لیے فوراً" سختی کرنے کے بجائے اصلاح کا تدریجی طریق کار تجویز کیا گیا ہے' یعنی زبانی وعظ و نصیحت' اظہار ناراضی اور بستر میں علیحدگی اور آخر میں معمولی جسمانی سزا۔

اگر معاملات میں بگاڑ اس حد تک پہنچ جائے کہ دوسروں کی مداخلت ضروری ہو جائے تو ثالثی' یعنی پنچایت کے طریق پر مرد اور عورت دونوں کی شکایتیں سن کر جس کی غلطی ہو' اسے سمجھایا جائے اور صلح کرادی جائے۔ (النساء 4:35)

اگر طلاق دینا ضروری ہو جائے تو ایک ہی بار تعلق ختم کر دینے کے بجائے ایک رجعی طلاق دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کے بعد دوبارہ تعلق بحال کرنے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

ایام حیض میں اور جس طہر میں مقاربت کی گئی ہو' اس طہر میں طلاق دینے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اگر وقتی غصہ ہو تو ختم ہو جائے اور اگر جدائی کا فیصلہ ہو تو غور و فکر کرنے کی مہلت مل جائے اور اس طرح تعلقات بحال رکھنے کے امکانات بڑھ جائیں۔

دوسری طلاق کے بعد بھی رجوع کی اجازت دی گئی ہے۔

تیسری طلاق کے بعد رجوع کا حق نہیں رکھا گیا تاکہ مرد اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ طلاق دے اور اسے معلوم ہو کہ اس کے بعد تعلقات بحال کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

اگر ایام حیض میں یا اس طہر میں جس میں مقاربت

کی گئی ہو' طلاق دی جائے تو یہ طلاق کا غلط طریقہ ہے' جسے علماء کی اصطلاح میں "بدعی طلاق" یا "طلاق بدعت" کہتے ہیں۔ ایسی طلاق کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ واقع ہو جائے گی یا نہیں' بہت سے علماء اس کے واقع ہو جانے کے قائل ہیں لیکن اس طرح طلاق دینے والے کو گناہ گار قرار دیتے ہیں۔ دوسرے علماء کہتے ہیں کہ یہ طلاق واقع ہی نہیں ہوتی' کیونکہ سنت کے مطابق نہیں دی گئی۔ امام ابن حزم اور امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ (حاشیہ سنن ابن ماجہ "از نواب وحید الزمان خان)

ایک مجلس کی تین طلاقیں

حضرت عامر شعبی رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے کہا: مجھے اپنی طلاق کے بارے میں بتائیے۔ انہوں نے فرمایا۔

"میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دے دیں جب کہ وہ یمن گئے ہوئے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نافذ قرار دے دیا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل: صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ بن قیس رضی اللہ عنہا کے خاوند حضرت ابو عمرو بن حفص بن مغیرہ مخزومی رضی اللہ نے دو طلاقیں پہلے دی ہوئی تھیں اور تیسری طلاق یمن سے حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے بھیجی۔ تین طلاقیں اکٹھی نہیں دی تھیں۔ (صحیح مسلم حدیث ۳۶۸۰)

اسی تفصیل کی رو سے کئی محققین نے اس روایت کو بھی صحیح کہا ہے کیونکہ اس روایت کا ابہام صحیح مسلم کی روایت سے دور ہو گیا۔ بہرحال صحیح مسئلہ یہی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوں گی۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "ایک مجلس میں تین طلاقیں" تالیف: حافظ صلاح الدین یوسف۔)

طلاق جس طرح عورت کو براہ راست مخاطب کر کے دی جا سکتی ہے' ایسے ہی کسی قابل اعتماد شخص کے ذریعے سے طلاق کا پیغام بھی بھیجا جا سکتا ہے اور لکھ کر بھی طلاق بھیجی جا سکتی ہے۔ ہر صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی۔

رجوع کرنے کا بیان

حضرت مطرف بن عبداللہ بن شخیر رحمتہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور پھر اس سے قربت کرتا ہے مگر طلاق دینے یا اس سے رجوع کرنے پر گواہ نہیں بناتا۔ (اس کا حکم کیا ہے؟) حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے سنت کے خلاف طلاق دی اور سنت کے خلاف ہی رجوع کیا۔ اس کی طلاق پر بھی گواہ مقرر کر اور رجوع پر بھی۔"

فائدہ: جس طرح نکاح کے موقع پر گواہوں کا تقرر ہوتا ہے' اسی طرح طلاق اور رجوع بھی گواہوں کی موجودگی میں ہونا چاہیے۔

کیا تین طلاق والی عورت کو رہائش اور خرچ ملے گا؟

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے خاوند نے انہیں تین طلاقیں دے دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رہائش اور خرچ نہ دلوایا۔

فوائد و مسائل: طلاق بائن کے بعد عدت میں عورت کو خرچ دینا مرد کے ذمے نہیں۔

بعض علماء نے طلاق بائن کے بعد بھی عدت میں عورت کا خرچ اور رہائش وغیرہ کا انتظام مرد کے ذمے قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل سورۃ طلاق کی پہلی آیت ہے "انہیں ان کے گھروں سے مت نکالو' نہ وہ خود نکلیں'

سوائے اس کے کہ وہ کھلی برائی کا ارتکاب کریں۔"
لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت رجعی طلاق والی عورت کے بارے میں ہے کیونکہ اس کے بعد یہ فرمان ہے۔
"تم نہیں جانتے' شاید اس کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی نئی بات پیدا کر دے۔" اس آیت میں نئی بات سے مراد یہ ہے کہ ایک گھر میں رہنے سے امید ہے کہ میاں بیوی کے درمیان محبت کے جذبات پیدا ہو کر رجوع ہونے کا امکان ہو گا۔ بائن طلاق کے بعد یہ امکان نہیں کیونکہ رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔
اگر عورت حمل سے ہو تو عدت کے دوران میں اس کا خرچ مرد کے ذمے ہے' خواہ طلاق بائن ہی کیوں نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اگر وہ حمل سے ہوں تو بچہ پیدا ہونے تک انہیں خرچ دیتے رہو۔"

اگر آدمی کہے کہ اس نے طلاق نہیں دی

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب عورت خاوند سے طلاق مل جانے کا دعویٰ کرے اور ایک قابل اعتماد گواہ پیش کر دے تو اس کے خاوند سے قسم اٹھانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر اس نے قسم کھائی (کہ میں نے طلاق نہیں دی) تو گواہ کی گواہی کالعدم ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے قسم سے انکار کیا تو اس کا انکار دوسرے گواہ کے قائم مقام ہو جائے گا اور اس کی طلاق نافذ کر دی جائے گی۔"

عورت سے مقاربت نہ کرنے کی قسم کھالینا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ آپ ایک مہینہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم کے پاس تشریف نہیں لے جائیں گے' چنانچہ آپ انتیس دن ٹھہرے رہے۔ جب تیسویں دن کی شام ہوئی تو آپ میرے ہاں تشریف لے آئے۔ میں نے عرض کی۔
"آپ نے قسم کھائی تھی کہ مہینہ بھر آپ ہمارے پاس تشریف نہیں لائیں گے۔ (اور ابھی انتیس دن پورے ہوئے ہیں' صبح تیسواں دن ہو گا۔) تو آپ نے تین بار انگلیوں کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "مہینہ اتنا ہوتا ہے (تیس دن کا) اور (دوسری بار) ساری انگلیوں سے (دوبار) اشارہ فرما کر تیسری بار ایک انگلی بند کی' اور فرمایا "اور مہینہ اتنا بھی ہوتا ہے۔ (انتیس دن کا)۔

فوائد و مسائل: 1: اگر خاوند کسی معقول وجہ سے ناراض ہو کر بیوی کے پاس کچھ مدت تک نہ جانے کی قسم کھالے تو یہ جائز ہے اسے ایلاء کہا جاتا ہے۔
2۔ ایلاء کی زیادہ سے زیادہ مدت چار مہینے ہے۔ اگر غیر معینہ مدت کی قسم کھائی ہو تو چار مہینے گزرنے کے بعد عورت اس کے خلاف دعویٰ دائر کر سکتی ہے اور عدالت اسے حکم دے گی کہ بیوی سے تعلقات قائم کرے یا طلاق دے۔ (مفہوم سورۃ بقرہ آیت: ۲۲۶' ۲۲۷)
3۔ اگر خاوند نے چار مہینا اس سے کم مدت کے لیے قسم کھائی ہو اور مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے وہ تعلقات قائم کرے تو اسے قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ اور اگر مقررہ مدت تک اپنی قسم پر قائم رہے تو کفارہ نہیں' ہو گا' نہ طلاق پڑے گی۔
4۔ ایلاء طلاق کے حکم میں نہیں۔ اس سے نہ ایک طلاق پڑتی ہے' نہ زیادہ۔

ظہار کرنا (بیوی کو ماں یا بہن کہنا)

"ظہار" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو کہے "تو میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ" اس کا مطلب یہ ہے کہ تو مجھ پر اسی طرح حرام ہے' جس طرح ماں حرام ہوتی ہے۔
ظہار کرنا گناہ ہے لیکن اس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔

صرف اس وقت تک مقاربت منع ہو جاتی ہے جب تک کفارہ ادا نہ کرلیا جائے۔

اس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ دوبارہ ازدواجی تعلقات قائم کرنے سے پہلے ایک غلام آزاد کیا جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو دو ماہ تک مسلسل روزے رکھے۔ اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو ساٹھ مسکینوں کو ایک وقت کھانا کھلا دے۔

جس شخص پر کسی وجہ سے کفارہ واجب ہو جائے اور وہ اتنا غریب ہو کہ ادا نہ کرسکتا ہو تو مسلمانوں کو چاہیے کہ صدقات وزکاۃ سے اس کی مدد کریں تاکہ وہ کفارہ ادا کرسکے۔

اگر مقررہ مدت کے لیے ظہار کیا جائے' پھر اس مدت میں مقاربت سے پرہیز کیا جائے تو کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

اگر ظہار میں مدت کا ذکر نہ ہو تو جب بھی بیوی سے ملاپ کرنا چاہے گا' ضروری ہوگا کہ اس سے پہلے کفارہ ادا کرے۔

ظہار کرنا

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ بڑی برکتوں والا ہے جو سب کچھ سنتا ہے۔
جب حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے خاوند (حضرت اوس بن صامت رضی اللہ عنہ) کی شکایت کررہی تھیں تو میں بھی ان کی باتیں سن رہی تھی لیکن کچھ باتیں (قریب ہونے کے باوجود) میری سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔
"اے اللہ کے رسول! (میرا خاوند) میری جوانی کھا گیا میں نے اس کے لیے (بچے جن جن کر) پیٹ خالی کردیا۔ اب جب کہ میں بوڑھی ہوگئی ہوں اور مجھے اولاد ہونا بند ہوگئی ہے تو اس نے مجھ سے ظہار کرلیا ہے۔ یا اللہ! میں تجھی سے شکایت کرتی ہوں۔ وہ ابھی وہیں تھیں کہ جبرائیل علیہ السلام یہ آیات لے کر آگئے۔ ترجمہ: "یقیناً" اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے شوہر کے بارے میں تکرار کررہی تھی اور اللہ کے آگے شکایت کررہی تھی۔"

فوائد و مسائل 1۔ اللہ تعالیٰ سننے کی صفت سے متصف ہے اور اس کی سماعت بندوں کی طرح محدود نہیں بلکہ لامحدود ہے۔

2۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بڑھاپے کا ذکر اس لیے کیا کہ اگر وہ جوان ہوتیں تو ان کے لیے دوسرا نکاح کرلینا آسان ہوتا' کوئی نہ کوئی ان کی جوانی کے پیش نظر یا اولاد کی امید میں ان سے نکاح کرلیتا' اس طرح ان کے لیے بچوں کی دیکھ بھال آسان ہو جاتی۔

3۔ مصیبت میں اللہ ہی سے دعا کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ تمام مشکلات حل کرنے والا ہے۔

4۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے جو حکم نازل ہوتا تھا اسی پر عمل کرتے اور کرواتے تھے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"کہہ دیجیے: مجھے یہ حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس (قرآن) میں ترمیم کروں میں تو اسی کی پیروی کروں گا جو کچھ میرے پاس وحی کے ذریعے سے پہنچا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔"

اللہ کا عذاب

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری امت کے کچھ لوگ شراب پئیں گے۔ وہ اس کا کوئی اور نام رکھ لیں گے۔ ان کو گانے والیاں ساز بجا کر گانے سنائیں گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے بعض کو بندر اور خنزیر بنا دے گا۔"

رُوبرو

سمیرا حمید

رفیعہ شعیب نے کراچی سے پوچھا ہے کہ "سمیرا جی آپ نے شروع سے ہی ایسی اینڈ کا سوچ رکھا تھا یا فینز کے اصرار پر کیا؟"

"آپ کے سوال پر میں نے ایک قہقہہ لگایا ہے۔ شاید اصرار کی جگہ آپ "ڈر" کا لفظ لکھنا چاہ رہی تھیں۔ قارئین اصرار کر رہے تھے، محبت میں کر رہے تھے اور میں ان کی محبت کی قدردان ہوں۔ صاف گوئی سے جواب دوں تو میں اپنی تخلیقات میں بے انتہا ضدی ہوں۔ میں بنیادی کہانی میں کسی صورت تبدیلی نہیں کرتی۔ کہانی یہ ہی تھی جو آپ نے پڑھی اس کے مرکزی خیال میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی گئی۔ اگر عانیان اور امرحہ نے مرنا ہوتا تو وہ ہر صورت مرتے چاہے پھر اختتام لکھ کر مجھے کہیں روپوش ہو جانا پڑتا۔"

ہما سرور نے بعد از دعا پوچھا ہے کہ "یارم کے سب کرداروں میں سے مجھے کون سا سب سے زیادہ پسند ہے۔ ایک قاری نے پوچھا ہے کہ مارگریٹ کی ڈائری جو عانیان ماما مہر سے مانگتا ہے اس ڈائری میں کیا تھا؟"

"ہما! دعا کے لیے بہت شکریہ۔ سب کے سب کردار مجھے بہت پسند ہیں اور یہ حقیقت ہے۔ میں ان سب کرداروں کی کردار نگاری سے مطمئن ہوں۔ مارگریٹ کی اس ڈائری میں کیا ہو سکتا ہے سوائے ونید البشر کی یادوں اور مارگریٹ کی سسکتی ہوئی محبت کے۔ یہ ڈائری تخلیق اس معنی میں تھی کہ وہ ڈائری اتنی دردناک ہے کہ ماما مہر عانیان کو اس سے دور رکھنا چاہتی ہیں۔"

معطلہ طفیل ڈیرہ غازی خان سے پوچھ رہی ہیں کہ "کیا ناول لکھنے سے پہلے پوری کہانی سوچتی ہیں یا صرف تھیم سوچ کر باقی کا ایڈ کرتی جاتی ہیں، کہانی شروع کرتے ہوئے آپ کو معلوم ہوتا ہے اینڈ کیا ہو گا۔"

"جب باقاعدہ لکھنے کے لیے قلم اٹھائیں تو کہانی مکمل تصویر میں ڈھل چکی ہوتی ہے۔ کہانی لکھتے ہوئے یہ توقع سے بہتر لکھی جا سکتی ہے، لیکن اصل کہانی اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور لکھتے ہوئے وہ مزید مکمل اور جامع ہوتی جاتی ہے۔ چند سینز آگے پیچھے ہو جاتے ہیں، لیکن ایسے کہ اصل کہانی پر اثر انداز نہ ہوں، بلکہ اور بہتر ہوں۔ کہانی لکھتے ہوئے اختتام معلوم ہوتا ہے، اسی لیے واقعات اس اختتام کی طرف جاتے ہیں۔"

ماہ نور آفتاب گوجرانوالہ سے کہتی ہیں۔ "آپ کی کہانیاں پڑھ کر لگتا ہے، آپ کے پاس بہت معلومات ہیں، جیسے کہ آپ نے شیاما گائے کے بارے میں بھی لکھا اور اب یارم میں بھی اتنا کچھ لکھا، آپ کے پاس اتنی معلومات کیسے آئیں۔"

"زیادہ معلومات نہیں ہیں میرے پاس ماہ نور۔ بلکہ اکثر معمولی چیزوں کے لیے مجھے سرچ انجن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص شعبے کو لے کر جو معلومات آپ کے پاس ہوں وہ میرے پاس نہ ہوں۔ ہم سب کے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا ہے ایک دوسرے سے مختلف، لیکن کچھ ضرور۔ جیسے جو لوگ گاؤں میں رہتے ہیں، ان کے پاس مویشیوں، درختوں، فصلوں، زمین، بارشوں، سبزیوں اور موسموں سے متعلق جو معلومات ہوتی ہیں وہ قابل رشک ہوتی ہیں اور جو لوگ پہاڑوں میں رہتے ہیں وہ پہاڑوں، آبشاروں وغیرہ کے بارے میں کسی بھی کتابی انسان سے زیادہ جانتے ہیں۔"

علیان خان چوہدری کا سوال ہے کہ۔ "آپ کے احساسات کیا تھے جب یہ ناول لکھ رہی تھیں۔ کیا سچ میں ایک ایسے ماحول سے نکلی ہوئی لڑکی خود کو اس مقام تک لے جاسکتی ہے؟"

"یارم کی تصویر آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی تھی اور میں اس تصویر کی تکمیل پر تشکر کے ساتھ خوش ہوتی تھی۔ امرحہ ہی کیوں؟ کوئی بھی خود کو کسی بھی مقام تک لے جاسکتا ہے' کامیاب ہوسکتا ہے۔ ہم سب باصلاحیت ہیں۔ تمام عظیم شخصیات کی زندگیوں کو کھنگال کر دیکھ لیں۔ انہوں نے کبھی خود کو جھکنے یا رکنے نہیں دیا۔ وہ جرات مند اور ہمیشہ مائل بہ عمل رہے ہیں۔ کسی ذریعے سے مجھ تک یہ کہانی آئی کہ گاؤں کی ایک لڑکی کی شادی اپنے رشتے داروں میں جو لندن میں رہتے تھے ہوگئی اور لڑکی بھی لندن چلی گئی۔ کچھ عوامل کار فرما ہوئے اور لڑکی کو انٹیریر ڈیزائننگ کا کورس کرنے کا موقع دیا گیا۔ گاؤں کی سادہ سوچ اور کم تعلیم یافتہ لڑکی نے مغربی اور دیسی انداز کو مدغم کرکے انٹیریر ڈیزائننگ میں نئے رجحانات متعارف کروا کر سب کو حیران کردیا' تو میں ذاتی طور پر اس پر یقین رکھتی ہوں کہ ہر انسان اپنے اندر بیش بہا صلاحیتیں رکھتا ہے۔ ضرورت ہے تو صرف انہیں ابھار کر سامنے لانے کی۔ آخر انسان کو اشرف کے لقب سے نوازا گیا ہے اور یہ کوئی معمولی لقب نہیں۔"

"برازیلا شہر پاکستان میں کافی مشہور ہوچکا ہے کیا سندری امرحہ بھی برازیلا میں مشہور ہوچکی ہیں؟" نعیمہ قیوم کراچی۔

"سندری امرحہ جب اپنی کہانی بنام یارم لے کر برازیلا جائیں گی تو پھر شاید۔"

حنا جتوئی فیصل آباد سے پوچھ رہی ہیں کہ۔ "آپ کا لکھنا قدرتی ہے یا خواہش؟"

"میرا لکھنا قدرتی ہے۔"

کرن اسحاق کینٹ پنڈی کا سوال ہے کہ۔ "سائی زمینی فرشتے کا کردار کہاں سے ملا آپ کو۔ میں بھی اپنی دوستوں کے لیے سائی ہوں۔"

سائی مجھے "سے لٹ آن" کے لفظ میں ملا اور اسی لفظ سے میں نے سائی کو بنانا شروع کیا۔ سائی کے کردار کا محرک "سب کہہ دو" کا تصور تھا۔

عنبرین انور رحیم یار خان سے پوچھتی ہیں۔ "مارگریٹ کا کردار بہت زبردست ہوا تھا' کیا کوئی حقیقی کردار ایسا دیکھا ہے؟"

"مارگریٹ حقیقی کردار نہیں ہے' لیکن چند انسانوں کے دکھوں کی حقیقی تصویر ضرور تھی۔"

خدیجہ شاد مانچسٹر سے شکوہ بھی کر رہی ہیں اور سوال بھی کہ۔ "میں واپس پاکستان کب آئی اور مانچسٹر میں میری رہائش کہاں تھی اور میں نے ناول کا اینڈ اتنی جلدی کیوں کردیا۔"

"میں مانچسٹر نہیں گئی تھی اور ناول کا اختتام اب نہیں ہوتا تو کبھی تو ہونا۔ ایک اچھی قاری ہونے کی حیثیت سے آپ بھی جانتی ہیں کہ ہر کہانی کی ایک حد ہوتی ہے' اگر اسے اس حد سے نکال لیا جائے تو پھر وہ اپنی اصل شکل کھودیتی ہے۔"

"امرحہ کی سائیکل ریس کیوں ضروری تھی اور آپ قصہ گو بنی کہانی میں شامل ہوتی رہیں' اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟" مریم منیر لاہور۔

"تاکہ امرحہ کارل کو ہرا سکے اور یہ جان سکے کہ مقابلہ اہم ہے نہ کہ ہار جیت۔ کہانی میں شامل ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں رہی' صرف ایک انداز تو لکھتے لکھتے میں خود بھی کہانی کا حصہ بن جاتی تھی اور جہاں میں آئی وہاں میں موجود ہونا چاہتی تھی' خاص کر سینٹرز کے ٹریبوٹ میں۔"

فیصل آباد سے صاعقہ نور فاطمہ کا کہنا ہے کہ۔ "آپ نے بہت اچھے اور مختلف الفاظ کا چناؤ کیا' لیکن کہیں کہیں اردو سمجھنے میں مجھے مسئلہ ہوا۔ آپ نے مشکل اردو کا استعمال کیوں کیا کہانی میں۔ آپ نے اردو کہاں سے سیکھی ہے؟"

"صائمہ! بادشاہی مسجد میں نکاح کی تقریب کا اسکیچ

بہت اچھا بنایا ہے آپ نے۔ ناول میں سب کے سب جملے بے حد سادہ انداز میں بیان کیے گئے۔ کوئی ایک بھی جملہ ایسی اردو میں نہیں تھا جو اجنبی لگتی۔ زبانیں اس وقت مشکل ہو جاتی ہیں جب وہ رائج نہ ہوں یا جس کے بہت سے حصے یا لفظوں کو استعمال کرنا چھوڑ دیا جائے۔ جیسے لفظ آبخورہ۔ ہم سب نے اب گلاس یا کپ کہنا شروع کر دیا ہے' اس لیے لفظ آبخورہ مشکل لگتا ہے۔ ہم لائٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے لفظ قمقمہ یا قندیل مشکل اردو میں جا شامل ہوئے ہیں۔ پاسپورٹ کا لفظ آسان ہے اور اس کی اردو جواز السفر کو کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ بینک لفظ آسان ہو گیا ہے' لیکن اس کی اردو ساہوکارا مشکل تر ہے۔ اردو بھی مشکل نہیں ہے' بس ہم نے اس کا عام استعمال چھوڑ دیا ہے۔ لکھنا' پڑھنا اور بولنا' تو زبانیں اس وقت مشکل ہو جاتی ہیں' جب انہیں ترک کرنا شروع کر دیا جائے۔ جب وہ اپنے ہی زبان دانوں کے لیے بولنے والوں کے لیے اجنبی ہو جائیں۔ میں نے تو ناول میں اپنی ہی زبان کو رائج کیا ہے' بس۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے کچھ ایسے لفظوں کا استعمال کیا ہے' جن کا عام استعمال بالکل ترک کیا جا رہا ہے اور جو پڑھنے والوں کے لیے اجنبی ہیں۔ لیکن یہ لفظ لغت میں قید ہونے کے لیے تو وجود میں نہیں آئے نا؟ اگر انہیں لکھا' بولا یا پڑھا نہیں جائے گا تو ان کے وجود میں آنے کا مقصد کیا ہو گا؟

میری اردو بہت اچھی نہیں ہے' لیکن میں کوشش کر رہی ہوں کہ میں اچھی اردو لکھنا' بولنا اور پڑھنا سیکھ لوں۔ کوئی بھی کتاب' رسالہ یا کچھ بھی پڑھتے ہوئے میں نئے لفظ پر نشان لگا دیتی ہوں اور اسے یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے اپنی زبان اردو کو سیکھنا۔ ناول یا کتاب یا رسالہ یہ تو ایک اچھا ذریعہ ہیں سیکھنے اور سکھانے کا۔ اگر ہم ہماری زبان کو نہیں سیکھیں گے تو کون سیکھے گا۔ اگر ہمارے لیے ہماری ہی زبان اجنبی ہو گی ہم سے ۔ لفظ مشکل ہوں گے تو دوسرے کیسے سیکھیں گے۔ اردو کے لیے میں نے کافی کوشش کی ہے۔ آپ کے حصے میں تو نسبتاً" سہل کام آیا۔ "پڑھنے کا" کسی بھی دوسری زبان سے زیادہ میری زبان اردو کا مجھ پر پہلا اور امتیازی حق ہے کہ میں اس پر دسترس حاصل کروں۔ میں اردو کے سیکھنے میں اپنی کوشش کو جاری رکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔"

کراچی سے ثمینہ اکرم اپنے پراثر خط اور انداز تحریر کے ساتھ پوچھ رہی ہیں کہ۔ "امرحہ کا کردار لکھتے ہوئے ذہن میں کیا خیال تھا۔ کیا کارل جیسے کردار دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کسی خاص موڈ میں لکھتی ہیں یا بحروقت اور موڈ کی قید نہیں کیا اس کا اینڈ قارئین کی آراء پر لکھا؟"

"محبت من محرم' یارم اور ناول کے اختتام پر لکھی سطروں پر آپ کی رائے پر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ کم عقلی' بے چارگی' لاعلمی اور کم ہمتی سے شعور' علم اور بلندی کی طرف سفر کے خیالات ذہن میں تھے۔ امرحہ کو لکھتے ہوئے۔ بے چارگی پیدائشی نہیں ہوئی' خود ساختہ ہوتی ہے یہ بھی۔ امرحہ کا کردار ایک شاگرد کا کردار ہے وہ ہر نئے موڑ پر نئے واقعے پر سیکھتی چلی جاتی ہے۔ کچھ کم ہوتے ہیں' کچھ زیادہ' لیکن کارل جیسے بہت سے کردار ہماری دنیا میں موجود ہیں۔ یارم کا اختتام پہلے سے ہی طے تھا۔ قارئین کی آراء پر نہیں لکھا۔ یارم کے لیے میں نے موڈ دیکھا نہ ہی وقت' بلکہ ہر چیز کو بالائے طاق رکھ کر اسے لکھا۔ ویسے میں موڈ کے زیر اثر آ جایا کرتی ہوں۔"

ماریہ عباسی اور مسز جبین اجمل لاہور سے پوچھ رہی ہیں کہ ناول میں لکھا ہے کہ۔ "میں اسی قلم سے دوبارہ آنے کے لیے جا رہا ہوں' میرا انتظار کیا جائے۔" کیا کارل آئے گا؟"

"جی کارل دوبارہ آئے گا۔ نئی جگہ' نئے لوگوں میں' نئی کہانی کے ساتھ۔ جہاں وہ انتظار کرنے والوں کا انتظار ختم کرنے جا رہا ہے۔"

گوجرانوالہ سے حمیرا شہزادو نے بعد از دعا کہا ہے کہ۔ "آپ کلاسک ناول مثلاً "رومیو جولیٹ" ہیر رانجھا کو اپنے سحر انگیز طرز اسلوب میں ڈھالیں۔"

"دعاؤں کے لیے شکریہ۔ آپ کا مشورہ قابل قدر ہے۔"

نارووال سے شفیقہ ادریس نے پوچھا ہے کہ۔ "کہانی میں کیا ہونا ضروری ہے؟"

"کہانی میں عالمگیریت کا ہونا ضروری ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں بیٹھ کر لکھی جائے اور اسے دنیا کے کسی بھی حصے میں بیٹھ کر کوئی بھی پڑھے تو کہانی اس کے لیے اجنبی نہ ہو۔ یعنی جو طاقت بانو قدسیہ کے قلم میں ہے کہ شنگھائی میں بسنے والے اور نیویارک میں رہنے والے راجہ گدھ کو پڑھتے قوم کی کیفیات میں خود کو بھی مبتلا پائیں گے اور قیسی کے سرہانے سر رکھ کر روئیں گے۔"

جڑانوالہ سے عظمیٰ شفیق پوچھتی ہیں کہ۔ "کارل سے کب ملوائیں گی؟"

"کارل سے ملنے کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔"

سید والا سے فرحت اشرف گمن نے پوچھا ہے کہ۔ "میں کہاں رہتی ہوں اور میں نے لکھنے کا آغاز کہاں سے شروع کیا؟"

"میں لاہور میں رہتی ہوں اور لکھنے کا باقاعدہ آغاز خواتین ڈائجسٹ کے ادارے سے کیا۔ مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوگی۔ آپ کا خط میرے لیے کسی ملاقات سے کم نہیں ہے۔"

"امرحہ نے لاہور میں برف باری کروادی تھی۔ اب آپ کے اگلے کسی ناول کی ہیروئن کیا کروائے گی لاہور میں؟" کومل نعمان، میاں چنوں۔

"شاید وہ لاہور کی سڑکوں پر بل فائٹنگ کروادے اور اس پر اصرار کرے کہ بل ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"رباب خلیل کا کہنا ہے کہ ویرا کی بہادری کے بعد پاکستان میں ضرور تبدیلی آئے گی، وہ بھی لڑکیوں میں۔ سائی جیسے بے غرض انسان ضرور ہونے چاہئیں۔ رباب کے ساتھ وجیہہ انور ہاشمی نے کراچی سے پوچھا ہے کہ کارل جیسا کردار تخیل ہے یا ایسا کوئی انسان سچ میں موجود ہے؟"

"رباب آپ کا ہاتھ سے بنا کر بھیجا فوٹو کالج بہت خوب صورت ہے۔ سب کرداروں کی تصویریں بہت کیوٹ ہیں۔ کارل کی تصویر آپ نے عین اس کے کردار کے مطابق بنائی ہے۔ کارل کا کردار میرا تخیل ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس جیسے انسان دنیا میں پائے نہیں جاتے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور کریں تو مشاہدہ کریں گی کہ آج کل کے بچے بہت زیادہ شرارتی ہیں۔ بہت ذہین اور حیران کن حد تک چونکا دینے والے۔ ایسے ہی بچوں جیسا کارل ایک بڑا بچہ ہے۔"

"آپ کا مطالعہ بہت وسیع لگتا ہے۔ اب تک کتنی کتابیں پڑھ چکی ہیں؟" بانیہ جواد، سرگودھا۔

"میں نے پڑھا زیادہ نہیں، سوچا زیادہ ہے۔ زیادہ مشاہدہ کیا ہے، زیادہ بوجھا ہے اور زیادہ پوچھا ہے۔"

ملتان سے رمشا اسلم کا سوال ہے کہ۔ "گھر والوں میں سے کبھی کسی نے لکھنے سے روکا؟"

"لکھنا ایک معتبر عمل ہے اور میرے گھر والے اس کے قائل ہیں۔ وہ میرے فیصلوں اور میرے کام کا احترام کرتے ہیں۔"

ستارہ امین پیر محل کا کہنا ہے کہ۔ انہوں نے یارم سے انتخاب کرکے ایک شاعری ترتیب دی، جسے بہت پسند کیا گیا۔ پوچھا ہے برازیلا کا واقعہ سچا تھا یا آپ نے خود تحریر کیا۔ یارم کو لکھتے وقت کیا مشکلات آئیں؟"

برازیلا کا واقعہ سچا نہیں ہے۔ اس سے ملتے جلتے واقعات فٹ بال کی تاریخ میں بہت ہو چکے ہیں۔ لیکن یارم کے لیے اسے میں نے خود تخلیق کیا اور اسے حکومت مخالف گروپ کے ساتھ منسلک کیا۔ باطنی مشکلات کا تعلق کچھ تخلیق اور وارد ہونے کے عوامل سے رہا کہ کئی بار مجھ سے میرا مطلوبہ جملہ نہیں لکھا جاتا

تھا۔ دماغ بالکل خاموش ہو جاتا تھا اور ایک لفظ بھی سوچ کر لکھنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ ظاہری طور پر میں نے یارم لکھتے ہوئے ایک مشکل مسلسل جھیلی۔ ”بے خوابی کی۔“ گہری نیند یا مکمل نیند میرے لیے خواب ہو چکی تھی۔ نہیں میں کبھی سندھ گورکھ پل نہیں گئی‘ لیکن موقع ملا تو ضرور جاؤں گی۔

حافظ آباد سے زیب النساء نے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ۔ ”ہمارے معاشرے میں ہر لڑکا عالیان جیسا کیوں نہیں ہے۔ امرحہ اور عالیان کی شادی پر شکریہ ادا کیا ہے اور پوچھا ہے کہ کیا آپ نے اپنے آس پاس ایسا ہوتا دیکھا یا پھر صرف تخلیق کار کے ذہن کا کمال ہے۔“

”آس پاس جو ہوتا ہے وہ مشاہدے میں رہتا ہے۔ سوجھ بوجھ کے بے شمار ذرائع ہوتے ہیں۔ مشاہدات‘ تجربات‘ سوجھ بوجھ اور اپنے تخیل کو تخلیق کار اپنے طرز اور اسلوب پر کہانی کی صورت میں بیان کرکے کمال کرتا ہے۔“

قصور سے اقصیٰ اور حفصہ کہتی ہیں کہ۔ ”کبھی میرا دل کرتا ہے کارل بن جاؤں اور کبھی دل کرتا ہے سائی۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ کیا مارگریٹ کے ساتھ اس کی محبت بھی مر گئی اور ولید البشر کو تھوڑا سا تو پچھتاوا ہونا چاہیے تھا مارگریٹ اور اپنے بیٹے کو چھوڑنے کا۔“

”اقصیٰ میرا خیال ہے آپ سائی بن جائیں اور حفصہ آپ کارل۔ جس محبت کی قدر نہ کی جائے اور کرنے والا اس کے لیے خود کو ختم کردے‘ اس کا انجام کم و بیش یہی ہوتا ہے۔ جو مارگریٹ کی محبت کا ہوا۔ ولید البشر کو اگر پچھتاوا ہوتا تو وہ واپس آجاتا‘ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کم ظرف انسانوں کی پہلی نشانی بے حسی ہوتی ہے اور وہ بے حس تھا۔“

خان پور سے عائشہ‘ مریم‘ سحر‘ نسترن‘ ماریہ‘ رومیصہ‘ اریج کے گروپ نے پوچھا ہے کہ۔ ”کارل کو اکیلا کیوں چھوڑا‘ اس کو بھی اس جیسے شیطانی دماغ والی کارل مثنی چاہیے تھی۔ امرحہ اور عالیان پاکستان سے اتنی جلدی کیوں چلے گئے۔ عالیان نے تو لاہور کے علاوہ باقی کچھ دیکھا ہی نہیں اور پنڈی سے۔۔۔ سلمیٰ زاہد کا کہنا ہے کہ میں کارل کو پاکستان کیوں نہیں لائی۔“

”کارل اکیلا! کہاں ہے؟ ساری دنیا ہے نا اس کے پاس اس کا شکار بننے کے لیے۔ عالیان اور امرحہ اس لیے جلدی چلے گئے کیونکہ انہیں یونیورسٹی جاکر اپنی تعلیم مکمل کرنی تھی۔ عالیان بھی کبھی آپ کے خان پور آجائے گا۔ کارل اس لیے پاکستان نہیں آیا کیونکہ اس کا آنا کہانی کا حصہ نہیں تھا۔“ کوئٹہ سے شمائل احمر کا سوال ہے ”کون سا کردار لکھنا مشکل تھا۔“

”وہ کردار تھوڑی مشکل میں ڈال دیتے ہیں جو ارتقا سے گزر رہے ہوں اور کہانی میں امرحہ اور عالیان ارتقا کا شکار رہے۔ خاص طور پر عالیان کیونکہ امرحہ کے انکار کے بعد اس میں گاہے بگاہے تبدیلیاں آرہی تھیں اور اس کی ذہنی رو ہر نئے واقعے اور سانحے کے بعد بدل رہی تھی۔“

سرگودھا سے عائشہ‘ سائرہ اور مریم مقبول پوچھ رہی ہیں کہ۔ ”کارل سے پوچھئے نا جب وہ پاکستان آئے گا تو سرگودھا کا چکر لگانے گا نا؟ آخر ہم بھی دیکھیں جب یہ آفت نازل ہوگی ہمارے شہر کا کیا حال ہوگا۔ آپ کے ناول کا ہر لفظ‘ ہر کردار ہمارے ذہن پہ کبھی نہ مٹنے کے لیے نقش ہوگیا ہے۔ آپ نے اتنے ہیرے موتی‘ پھول کلیاں کہاں سے اکٹھے کیے؟“

”کیا آپ کو اپنے شہر کا سکون عزیز نہیں ہے؟ سارے ہیرے موتی عطا کرنے والے کی دین ہیں۔“

لیہ سے سدرہ بھٹی کا سوال ہے کہ۔ ”ایک کہانی میں بنیادی خصوصیت کیا ہونی چاہئیں۔“

”ہر کہانی اپنے مرکزی خیال کے ساتھ بنیادی خصوصیات کا تعین کرتی ہے۔ لیکن اگر میں عام بات کروں تو کہانی کی روح کو مستحکم اور جامع ہونا چاہیے۔ کردار نگاری عروج پر ہونی چاہیے۔ بیانیہ مستند ہونا

چاہیے اور کہانی کے ہر حصے پر گرفت ہونی چاہیے۔"
خانیوال سے فروا وقار کارل اور عالیان کی کوئی ایک خامی پوچھ رہی ہیں۔

"کارل تو ایک معصوم سا انسان ہے، اس میں کوئی خامی کہاں ہے؟ عالیان کی یہ کہ وہ کافی سخت دل ہو گیا تھا۔"

"نارووال سے عشرت طاہرہ کا کہنا ہے۔" ویرا نے اپنی اعلا ظرفی سے پورے روس کی عزت رکھ لی۔" انہوں نے پوچھا ہے کہ "یہ ناول میرے ذاتی تجربے کا نچوڑ ہے یا علم کا؟ کیا میں برطانیہ کی شہری ہوں۔"

"مجھے لیڈی کا خطاب دینے کے لیے شکریہ۔ میں برطانوی شہری نہیں ہوں اور یہ ناول میرے ذاتی تجربات، علم، مشاہدے، تخیل اور تخلیق کا نچوڑ ہے۔"

سرگودھا سے رانیہ، فائزہ اور ایمن پوچھتی ہیں کہ۔
"بادشاہی مسجد میں دونوں کے نکاح نے حیران کر دیا کہ نکاح کا منظر ایسے بھی لکھا جا سکتا ہے۔ شاہی قلعے کو بھی شامل کر دیا آپ نے؟ یہ نادر خیال کیسے آیا آپ کو؟"

"مسجد میں نکاح ایک قابل قدر روایت ہے۔ تاریخی شہر کی تاریخی مسجد میں نکاح کا خیال میرے لیے بہت خاص تھا۔ اس لیے میں اس میں تاریخ کو لے آئی۔ راوی کا واپس بہنا، شاہی قلعے کا آباد ہو جانا اور پانی کا جہانگیر کے دور میں بنائے حوضوں میں واپس بہنا اسی کی ایک کڑی تھی۔"

ثریا راجپوت ضلع ننکانہ صاحب سے پوچھ رہی ہیں کہ آپ کا بچپن کہاں گزرا اور اگر قارئین فرمائش کریں کہ۔ "آپ کا اگلا ناول کارل پر ہو تو کیا پوری کریں گی۔"

"ثوبیہ کی طرح آنکھوں کو میں نے بھی کرنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے ہوا نہیں اور آپ کے تھری پوزر سوال میں واقع کئی سوالات ہیں۔ میرا بچپن لاہور میں ہی گزرا ہے۔ آپ نے جو فرمائش کی ہے اس پر۔ میں آپ سے درخواست کرنا چاہوں گی کہ اگلا ناول کارل کا نہیں ہو سکتا اس لیے ابھی سے کارل کا انتظار نہ کیا جائے۔"

"میرپور خاص سے ماہم حمید نے یارم کے ختم ہونے پر دکھ کا اظہار کیا ہے۔ چیچہ وطنی سے عروہ عثمان نے اپنی بہنوں، کزنز اور دوستوں کے ساتھ مل کر یارم پڑھا ہے اور خط میں یارم کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ لاہور سے مہوش طالب نے کارل کی بدمعاشیوں، لیڈی مہرکی بے غرض محبت، امرحہ کے مانچسٹر میں اور یونیورسٹی میں جدوجہد کرنے پر بہت اچھوتے انداز میں رائے دی ہے۔ اوکاڑہ سے حیا نے خط میں یارم کے لیے اپنے جذبات کا بہت خوب صورتی سے اظہار کیا ہے۔ سرگودھا سے گوشی کیان کا کہنا ہے کہ ان کی آپی کا نام بھی میرا ہے اور وہ بہت بہادر ہیں۔ انہوں نے فرمائش کی ہے کہ میں کارل کو ضرور کسی اور ناول میں لاؤں۔"

ماہم، مہوش، عروہ اور گروپ آپ کے جذبات اور رائے کی قدردان ہوں میں۔ حیا آپ کی تعریف اور طویل خط کے لیے شکریہ۔ مجھ تک آپ کے چند الفاظ نہیں پورا خط ہی آیا ہے۔ گوشی! کارل اپنے قدموں کے ساتھ ان شاء اللہ آئے گا۔

سیالکوٹ سے منیرہ بٹ کا کہنا ہے کہ کہانی کی جان ویرا اور کارل اب ان کے بھی دوست بن چکے ہیں۔ انہوں نے جاپانی فقرے کا ترجمہ پوچھا ہے اور یہ کہ جاپان سے کیا میرا اتنا تعلق ہے۔ سب کرداروں کے نام کیسے سوچ کر رکھے۔"

"جاپانی جملے کا مطلب "میں خود کو تمہارے رنگوں سے سجاتی ہوں۔" ہے۔ سب کرداروں کے نام کرداروں کی شخصیات کو سوچ کر رکھے۔ سائی کا نام وہ واحد نام ہے جو میں نے خود بنایا۔ جاپان سے میرا اتنا تعلق اس طرح سے ہے کہ میں بچپن سے ہی گھر میں جاپانیوں کے کام اور مہارت کی مثالیں سنتی رہی ہوں۔ محنت، کاملیت اور کمال فن کے اولین اصولوں میں سے بہت سے میں نے جاپانیوں سے سیکھے ہیں۔ میں جاپانیوں کی بہت بڑی مداح ہوں۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بیادِ محمود ریاض

خوشبو کی صورت

نادیہ مرزا

دنیا میں خوشی کی نسبت غم بہت زیادہ ہے۔ مگر یہ شمع تمام شب' خندہ صبح دم بھر' دنیا کس قدر بے ثبات' اس کی ثروت کس درجہ عارضی' اس کی خوشیاں پانی کی سطح پر بننے والا بلبلہ اور اس میں قیام کس قدر مختصر ہوتا ہے۔

فلک سے شکوہ جور و ستم کیا
زمیں چکر میں جب خود ہے تو ہم کیا

ریاض صاحب سے میری ایک بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ بذلہ سنج خوب صورت جملے بولنے والے اور زندہ دلی کی تصویر نظر آنے والے اس مشفق شخص سے وہ مختصر مگر خوب صورت ملاقات اب بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے۔

میرے ذہن میں ان کی آواز' ان کا شفیق' مگر بارعب و لب و لہجہ ان کی ہنسی' ان کی سنجیدگی' ان کے لہجے کی شیرینی اجاگر ہو کر روشنی پیدا کر رہی ہے۔

آپ کسی کو قلم پکڑا کر کہیں کہ یہ جو سامنے زندہ بیٹھا ہوا شخص ہے' اس کی موت کا قطعہ لکھیے۔ تو یقیناً" اس کا قلم بے حرکت اور نگاہیں ورطہ حیرت میں پڑ جائیں گی' مجھے بھی سمجھ نہیں آرہا کہ میں ماتم پرسی کس سے کروں کہ یہ غم میرا اپنا بھی ہے' بلکہ سب کا یکساں ہے' ہر انسان کا غم ہے۔ (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) آمین۔

تسلی و تشفی کا معاملہ بھی خدا کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ انسان جو خود کسی طرح تسلی پا نہیں سکتے دوسروں کو کیا تسلی دے سکتے ہیں۔ ہمارے کھوکھلے الفاظ' ہمارے جملوں کی کم مائیگی کسی کے زخموں پر انگلیاں تو رکھ سکتی ہے' مگر مسیحائی نہیں کر سکتی۔ اس غم کو سمیٹ نہیں سکتی' جو کلم قدرت کی طرف سے ہوتا ہے' جو بڑا غم دے سکتا ہے۔ وہ اسی غم کا مداوا بھی عمدگی سے کرنا جانتا ہے' جو مایوسی' کرب اور اطمینان

ڈال سکتا ہے۔ بلکہ ڈالتا ہے۔ اس کی انگلیاں غموں کو اس طرح سمیٹ لیتی ہیں، جس طرح پانی خشک زمین کی پیاس کو، بادل سورج کی تمازت کو۔

ہم سب کو ہی گزر جانا ہے، کسی کو نہیں ٹھہرنا، آپ کو، مجھے، ہم سب کو، اس سرائے میں کچھ دیر ٹھہر کر چلے جانا ہے، اس کے گھر پر فنا لکھ دی گئی ہے، مگر فنا ہو جانے والے لوگ اپنی یادیں مختلف روپ اور صورتوں میں دلوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے رہ جانے والوں کے اندر زندہ رہ جاتے ہیں۔

کبھی خوشبو کی صورت
کبھی ٹھنڈے بادل کی طرح
بہتے میٹھے چشمے کی صورت
جس سے آپ انہیں کبھی نہیں بھلاتے، مختلف حوالوں سے وہ شخص مختلف لوگوں کے دلوں میں جگمگاتا رہتا ہے۔

کہیں محبوب شوہر کے حوالے سے
کہیں شفیق باپ کے
تو مہربان بھائی کے
کہیں سچے پرخلوص دوست کے
کہیں نیک اچھے ہمسائے کے
کہیں بطور عمدہ انسان کے

اور ریاض صاحب یقیناً" ہر حوالے سے دلوں میں اپنی جگمگاہٹ چھوڑ گئے ہیں۔

روشنی جیسے لوگ

عروسہ شہوار

اداس رات، اداس زندگی، اداس وقت، اداس موسم کتنی چیزوں پہ الزام لگ جاتے ہیں اک دل کے اداس ہونے سے!

ادب نواز شخصیت جناب محمود ریاض کو ہم سے بچھڑے ایک سال اور بیت گیا۔ ایسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ان کی مثال تو آک کے کوپے کی سی ہے جس کے چٹخنے سے زندگی جاگتی ہے اور ہوا کوپے سے نکلنے والے نرم و ملائم ریشے اٹھا کر ہر طرف بکھیر دیتی ہے۔ ہر ریشے کے ساتھ بیج ہوتا ہے جو جہاں گرتا ہے وہیں آک کا ایک اور نیا پودا جنم لیتا ہے جناب محمود ریاض کی زندگی بھی اسی کوپے کی طرح تھی نہ جانے کتنے لوگ ان سے روشنی اور خوشبو کے بیج لے کر اردو ادب کی سرزمین زرخیز و شاداب کرتے رہے ہیں۔

کتنی ہی رائٹرز ہیں جنہوں نے شعاع خواتین اور کرن سے اپنے تحریری سفر کا آغاز کیا اور جناب محمود ریاض نے ان کی حوصلہ افزائی اور راہنمائی کی اور ہی بدولت آج کامیابیوں کے سفر پر گامزن ہیں گو کہ میں ان سے کبھی نہیں ملی مگر کچھ لوگ نہ مل کر بھی ہمیں بہت کچھ دے جاتے ہیں جن کے لیے اپنے احساسات و تاثرات کو الفاظ میں ڈھالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے جتنے پھول محبتوں اور چاہتوں کے انہوں نے بانٹے ہیں وہ سارے پھول دعاؤں کے گلدستے کی صورت ان کے لیے نچھاور ہیں۔ محمود ریاض صاحب نے علم و ادب کی دنیا میں جتنے چراغ روشن کیے ہیں ان کی تابانی سے علم و ادب کا افق روشنیوں سے جگمگاتا رہے گا قلم کاروں کا یہ کارواں یونہی رواں دواں رہے گا۔ جناب محمود ریاض ایسے سفر پہ جا چکے ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہیں مگر کامیاب اور خوش نصیب ہیں وہ جو یہاں رہے تو سب ان سے خوش اور چلے گئے تو ان کے لیے دعا گو۔

بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم بطور خاص یاد کرتے ہیں دعاؤں عقیدتوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں محمود ریاض صاحب ان خوش نصیب لوگوں میں شامل ہیں۔ جنہیں میرے سامنے خواتین، کرن، شعاع روشنی بکھیر رہے ہیں ان میں موجود موتیوں کی طرح چنے لفظ موت کے مدمقابل کھڑے ہیں فنا ایک حقیقت ہی سہی مگر یہ علم و قلم کی روشنی ہمیشہ ان پر سایہ فگن رہے گی۔

جناب محمود ریاض صاحب کی مغفرت کے لیے ڈھیر ساری دعائیں اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

بندھن

روبینہ اشرف ہمراہ طارق

شاہین رشید

کچھ فنکار ایور گرین ہوتے ہیں جیسے بشریٰ انصاری جیسے صبا حمید اور جیسے روبینہ اشرف جو جب کسی سیریل، کسی ٹیلی فلم یا سوپ میں آئیں اس ضمانت کے ساتھ کہ اس نے کامیاب ہونا ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ ہر وقت اسکرین پہ رہنے والی فنکارائیں نہیں ہیں۔ روبینہ اشرف بہترین پرفارمر، بہترین انسان اور بہترین بیوی اور ماں بھی ہیں۔ بہترین ماں اور بیوی اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جب "بندھن" کے لیے ان کا انٹرویو کیا تو ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انہیں اپنے گھر، اپنے شوہر اور اپنے بچوں سے کتنا پیار ہے اور 27 سالہ ازدواجی زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔

"کیسی ہیں روبینہ اشرف صاحبہ!"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"بہت شکریہ کہ آپ نے مصروفیات سے ٹائم دیا، ماشاء اللہ سے کتنے سال ہو گئے شادی کو؟"

"ہماری شادی ہوئی تھی 20 جنوری 1987ء میں۔"

"ماشاء اللہ کہتے ہیں کہ اتنے سالوں میں تو شکلیں بھی ملنے لگتی ہیں اور میاں بیوی، بہن بھائی لگنے لگتے ہیں؟"

"یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں۔ جو ساتھ رہتے ہیں، انہیں تو پتا نہیں چلتا، ہاں عادت و اطوار ایک

دوسرے سے ضرور ملنے لگتی ہیں' تو واقعی بہن' بھائی لگنے لگتے ہیں' کیونکہ کوئی ایک دوسرے کی طرح ہو جاتا ہے یا دونوں ایک دوسرے کی عادتیں اپنا لیتے ہیں۔"

"تبدیل کون ہوتا ہے' مرد یا عورت؟"

"دونوں ہی تبدیل ہوتے ہیں تو شادی کامیاب ہوتی ہے۔ ہمارے کیس میں تو ہم دونوں تبدیل ہوئے ہیں۔ کچھ طارق چینج ہوئے' کچھ میں ہوئی' لگتا تھا کہ طارق کو بدلنا مشکل ہوگا۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں کہ جن کے لیے لگتا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہوگا' مگر ہو جاتا ہے۔ مثلاً" مجھے گھر سے باہر کھانا بہت پسند ہے' جبکہ طارق کو بالکل بھی پسند نہیں ہے اور بہت سے مردوں کو نہیں ہوتا۔ وہ ایسے آدمی ہیں کہ جو کہتے ہیں مجھے گھر میں کھانا کھلا دو' میں تمہیں باہر کھانا کھلا دوں گا۔ تو میں اپنے میں تبدیلی لائی۔ میں نے گھر میں پکانا اور کھانا شروع کر دیا۔ تو جہاں ضروری ہوتا ہے' ہم دونوں اپنے میں تبدیلیاں لائے۔ اور شادی نام ہی اس کا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو ساتھ لے کر چلیں۔"

"کہتے ہیں کہ پہلے لڑکی خود چینج ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ سب کو چینج کر لیتی' ایسا ہے؟"

"ہاں۔ بالکل ایسا ہے۔ پہلے دس سال آپ کو دینے پڑتے ہیں نئی جگہ کو' نئے انسان کو اور ایسے نہیں دینے پڑتے کہ آپ دس سال ان کی مانتے رہو اور دس سال کے بعد کہو کہ اب میری باری ہے۔ پھر کچھ نہیں ہوتا۔ ایسے دینے پڑتے ہیں کہ آپ کو سمجھنا پڑتا ہے۔ اپنا پوائنٹ جہاں آپ ضروری سمجھتی ہیں۔ رجسٹرڈ کرانا پڑتا ہے' وہاں آپ کو بولنا پڑتا ہے۔ جہاں ضرورت نہیں ہے وہاں سوچنا پڑتا ہے کہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے' اسے چھوڑا جا سکتا ہے' وہاں چھوڑنا پڑتا ہے' تو اسٹریجی عورت کو ہی چینج کرنا پڑتی ہے اور پھر دس سال بعد آپ ایک مضبوط جگہ بنا لیتی ہیں۔ لیکن دس سال اگر آپ صرف لڑ کے گزار دیں گی اور سوچ لیں گی کہ صرف اپنی ہی منوانی ہے تو پھر آپ کے لیے باقی کی زندگی بھی مشکل ہوگی۔"

"تو کیا آج کل کی لڑکیوں میں ایسا کرنے کا حوصلہ یا برداشت ہے یا نہیں؟"

"ساری دنیا کے انسان تو ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں' تو میں ماں' باپ کی برداشت کو تھوڑا الزام دوں گی۔ کیونکہ جو چینج آیا ہے وہ ماں' باپ میں آیا ہے۔ بچوں میں نہیں آیا۔ بچے خود بخود نہیں بدلے' بلکہ ہم ماں' باپ بدلے ہیں۔ ہم نے اپنا ٹرینڈ بدلا ہے۔ اپنا رویہ بدلا۔ ہمارے ماں' باپ نے جس طرح ہمیں ٹرینڈ کیا تھا ہمیں جس طرح پالا تھا ہم نے اس سے ہٹ کر اپنے بچوں کو پالا ہے' تو چینج بچے سے شروع نہیں ہوا۔ ایک بچے کو اگر آپ بچپن سے کہہ دیں گی کہ تم نے میرے آگے جواب نہیں دینا تو اسے تو کوئی دوسری بات پتا ہی نہیں ہوگی اور ایک بچہ ہے کہ جس کو ہم کہتے ہیں کہ ہم آپ کے دوست ہیں آپ ہر بات کہہ دیں۔ تو چینج ہمیشہ بڑوں سے آتا ہے۔"

"آپ کی پسند سے ہوئی شادی؟ اور اپنے بچوں کے لیے وہی کریں گی کہ جو آپ نے کیا؟"

"میری ارینج میرج ہے اور یہ کوئی رول نہیں ہے کہ میری ارینج ہے تو میرے بچوں کی بھی ارینج ہو۔ یہ تو بچوں پر منحصر ہے' اگر وہ اپنی پسند سے کرنا چاہیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر وہ ارینج کرنا چاہیں گے تو ظاہر ہے کہ مجھے ارینج کرنا پڑے گا۔ میں بہت لبرل ہوں اور میری امی بھی بہت لبرل تھیں اور وہ کہتی تھیں کہ کوئی پسند آئے تو ضرور بتانا۔ مگر میں نے تو زندگی میں اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔"

"رشتے داروں میں شادی ہو تو لڑکا' لڑکی ایک دوسرے کو جانتے ہیں' لیکن اگر غیر برادری میں ہو تو دونوں ایک دوسرے سے ناواقف ہوتے ہیں تو آپ کو کوئی مسئلہ ہوا؟"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میرے حساب سے تو یہ بات اور یہ سوچ ہی غلط ہے۔ کیونکہ جب کسی کو پسند کرتے ہیں یا کسی کو جانتے ہو تب بھی آپ اس کے

بارے میں بہت تھوڑا جانتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے ہم اسکول و کالج میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں تو زیادہ نہیں جانتے۔ تو شادی بھی ایسا ہی سلسلہ ہے جب تک ایک دوسرے کے ساتھ وقت نہیں گزارتے ہمیں ایک دوسرے کے مزاجوں کا اور دیگر باتوں کا علم نہیں ہوتا۔"

"آج کل میں نے دیکھا ہے اور گزرے زمانے میں بھی ایسا ہی تھا کہ ادھر لڑکی کی شادی ہوئی ادھر باپ کی جگہ شوہر نے لے لی۔ نیا شناختی کارڈ نیا پاسپورٹ مگر آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا کیوں؟"

ہنستے ہوئے۔۔۔ "کچھ لوگوں کا دماغ زیادہ کام کرتا ہے دیگر لوگوں سے تو شاید میرا دماغ بھی ایسا ہی تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کیا بکواس ہے۔ میری اپنی ایک پہچان ہے اور مجھے یہ پہچان پسند تھی اور زندگی میں مجھے اپنی پہچان

کسی سے چھپانی نہ ہو تو میں نے کبھی کسی سے نہیں کہا کہ میں "مسز فلاں" بول رہی ہوں۔ دیکھیں دنیا میں ہر کوئی اپنی ایک پہچان لے کر آیا ہے۔ میری پہچان "روبینہ" ہے۔ اس کے آگے کیا لگا ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور معذرت کے ساتھ کہ چاہے اشرف ہو چاہے طارق ہو دونوں ہی اہمیت نہیں رکھتے ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہ بات بری لگی ہو مگر میری یہ ہی سوچ ہے اور مجھے کبھی مشکل پیش نہیں آئی کسی بھی جگہ پہ۔"

"اتنے سالوں میں کبھی خیال آیا کہ نہیں شادی نہیں ہونی چاہیے تھی یا خیال آیا کہ بہت اچھا ہوا کہ میری شادی ہوئی ہے؟"

"بہت دفعہ دونوں باتیں سوچیں بعض دفعہ سوچا کہ بہت برا ہوا جو شادی ہو گئی اور بعض دفعہ سوچا کہ شکر ہے اللہ کا کہ میں اپنے گھر والی ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ ایک بات اگر ہم "دل" سے باندھ لیں خواہ وہ مرد ہو عورت ہو نوجوان ہو یا بچہ ہو کہ ہم اپنی خوشیوں کے لیے اور پریشانیوں کے لیے خود ذمہ دار ہیں دنیا میں کوئی دوسرا ہے اور نہ ہی ہم اسے ٹھہرا سکتے ہیں نہ ماں کو نہ باپ کو اور نہ ہی کسی اور کو۔ اگر ہم کسی اور کی وجہ سے خوش یا ناخوش ہو رہے ہیں تو یہ بہت غلط بات ہے۔ اگر میں غلط کر رہی ہوں تو مجھے اپنی غلطی کو خود درست کرنا ہے اور اگر میں خوش ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ میں اچھا کر رہی ہوں۔"

"شادی کے نقصانات زیادہ ہیں یا فائدے زیادہ ہیں؟"

"شادی کے تو فائدے ہی فائدے ہیں۔ نقصانات نہیں ہیں اور یہ بھی آپ پر ہی منحصر ہے۔ اگر آپ نے ایک انسان کو برا بنا دیا ہے تو یہ آپ کا قصور ہے اور اگر اسے اچھا بنا دیا ہے تو وہ آپ کا بہت بڑا محافظ ہے۔ آپ ایک سے دو ہو جاتے ہو پھر دنیا کی سب سے بڑی نعمت آپ کو اولاد کی صورت میں مل جاتی ہے جو کہ شادی کے بغیر ناممکن ہے تو ویسے بھی زندگی میں ایک کاندھا چاہیے ہوتا ہے تو ایک انسان کے ساتھ جو اور بہت سے پیارے لوگ آجاتے ہیں آپ کی زندگی میں وہ بہت پیارے ہو جاتے ہیں۔ پھر شادی کو کیسے غلط کہہ

سکتے ہیں۔"

"لیکن جب تنگ دستی ہوتی ہے۔ غربت ہوتی ہے۔ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، تب تو انسان سوچتا ہی ہے کہ شادی نہ ہی کی ہوتی تو اچھا تھا ایسا ہے؟"

"اگر آپ کم ہمت انسان ہیں اور ہمیشہ اپنے سے اوپر والوں کو دیکھیں گے تو پھر آپ ایسا سوچ سکتے ہیں۔ آپ کو کم ہمت اللہ نے پیدا نہیں کیا اور آپ اپنی ضرورتیں مت بڑھائیں، خوشی چیزوں میں نہیں ہے۔ دو وقت کی روٹی تو اللہ کا وعدہ ہے اور چرند پرند بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ تو نہیں سوچتے کہ اگلے دن کے لیے کیا کرنا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ متوسط طبقے کے بچے بہت اوپر جاتے ہیں، بہت ترقی کرتے ہیں۔"

"مجھے اس بات سے اختلاف ہے کہ چرند پرند کل کی فکر نہیں کرتے۔ انسانوں اور چرند پرند میں فرق ہے۔ انسان کو اچھی زندگی، ایک معیاری زندگی چاہیے، دو وقت کی روٹی تو کسی بھی انسان کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تو مل ہی جاتی ہے۔"

"آپ یہ دیکھیں کہ یہ معیار کس نے بنایا؟ یہ ہم نے بنایا ہے اور بڑھایا ہے اور بڑھایا ہے۔ یہ ہمیں بیٹھ کر سوچنا چاہیے کہ کتنا بڑھانا ہے اور کہاں پر روک دینا ہے اور آپ کہتی ہیں کہ پرندوں کی مثال غلط ہے تو ایسا نہیں ہے۔ عموماً" یہ کہا جاتا ہے کہ زندگی گزارنے کا طریقہ ہمیں پرندوں سے سیکھنا چاہیے۔ آپ یہ دیکھیں کہ چڑیا کو پتا ہوتا ہے کہ کتنے دن تک اپنے بچے کے منہ میں دانہ دینا ہے اور کب بچے اسے گھونسلے کے باہر ہلکا سا دھکا دینا ہے کہ یہ لڑکھڑائے گا اور پھر اڑنے کی کوشش کرے گا۔ اور پھر اڑنے لگے گا اور دنیا میں لوگ یہ ہی کر رہے ہیں کہ جب بچے سولہ سے اٹھارہ سال کے ہوتے ہیں تو والدین ان پر ذمہ داریوں کا احساس ڈال دیتے ہیں، تو اگر ہم کہیں غلط کر رہے ہوتے ہیں تو پھر بھگتے بھی تو ہم خود ہی ہیں۔"

"شادیاں جو ٹوٹ جاتی ہیں ان میں قصور کس کا ہوتا ہے۔ میاں، بیوی کا یا کسی تیسرے فرد کا؟"

"بیچ جاؤں... میں بیویوں کو موردالزام ٹھہراؤں گی۔ معذرت کے ساتھ، جب میں ارد گرد ایسے کیس دیکھتی ہوں اور بہت سوچتی ہوں اس بارے میں اور لوگوں کی مثالیں اپنے دماغ میں رکھ کر جب تجزیہ کرتی ہوں تو میں عورت کو ہی غلط پاتی ہوں۔ حالانکہ میں خود عورت ہوں، مگر میں انصاف کی بات کروں گی، مرد بھی غلط ہوتے ہیں، مگر زیادہ تر عورتیں غلط ہوتی ہیں۔ لڑکیاں ہوتی ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ والدین کی غلط تربیت ہے۔ اور جب لڑکیاں رخصت ہونے لگیں تو پہلے زمانے والے سخت جملے استعمال نہ کریں، بلکہ یہ ضرور کہیں کہ "بیٹا یہاں تک کی ذمہ داری میری تھی۔ اب آپ اپنا گھر خود بنائیں، اپنی ذمہ داریاں خود اٹھائیں۔" یعنی ایک لحاظ سے ہم انہیں خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔ اب جن لڑکیوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے تو ایسی کوڑھ مغز لڑکیوں کے لیے پھر یہ ہی جملے ٹھیک رہتے ہیں کہ اب سسرال سے تمہارا جنازہ ہی نکلے۔ بے چارے ماں، باپ کو سانس لینے دو، زندگی تم سے نہیں چل رہی تو خود کام کرو۔ ماں، باپ کہاں سے آگئے بیچ میں۔ کیوں اپنی پریشانیاں بتا کر ماں، باپ کو پریشان کرتی ہیں۔ پریشانی کی وجہ تلاش کریں۔"

"اور ساسوں کے بارے میں کیا کہیں گی، وہ بدنام ہیں، زیادہ تر بری ہوتی ہیں؟"

"ایک زمانے میں کچھ ساسیں بری ہوتی بھی تھیں۔ اور آپ یہ سوچ لیں کہ بہو اچھی ہوگی تو ساس کتنی بھی بری ہوگی، وہ جو آپ کا شریک سفر ہے اسے بھی تو سب کچھ نظر آ رہا ہے اور بھی تو لوگ ہیں جو سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے کہ زیادتی کس کی ہے۔ شادی کر کے آپ کسی پلانٹ پہ تو نہیں چلے گئے نا۔"

"آپ نے شادی کے بعد بھی کام کو جاری رکھا۔ تو جوائنٹ فیملی کام آئی یا سب کچھ خود مینج کیا؟"

"سب کام آئے، جوائنٹ فیملی بھی کام آئی اور میرے اپنے بھی کام آئے۔ اور ہم نے خود بھی کیا، آج سے 27، 28 سال پہلے یہ تصور بالکل بھی نہیں تھا کہ ہم اپنے بچے بے بی سنٹر میں چھوڑ دیتے اور ہمیں

عادت بھی نہیں تھی' تو میرے سسرال والوں نے بہت ساتھ دیا میرا۔"

"عموماً" سسرال میں ہوتا ہے کہ لو جی ہم تو بچے سنبھالیں اور یہ صبح ہی صبح کام پہ نکل جائیں؟"

"ہاں۔۔ ہاں۔۔ ہوتا ہے ایسا۔۔ لیکن میرے ساتھ اس کا الٹ ہوا تھا۔ شادی کے بعد مجھے ایک کمرشل کی آفر آئی تو مجھے لگ رہا تھا کہ پتا نہیں میں کر سکوں گی کہ نہیں' تو میرے سسرال میں میری نندوں نے خاص طور پر کہا تھا کہ آپ کام کریں۔ آپ گھر کی فکر نہ کریں۔ اور میری نندیں ابھی بھی ایسی ہی ہیں۔ میرا پورا پورا ساتھ دیتی ہیں۔ سسرال میں جب بھی کوئی تقریب ہونی ہوتی ہے تو سب سے پہلے مجھے کال آتی ہے کہ ہم نے یہ تقریب کرنی ہے۔ آپ کون سا ٹائم ہمیں دے سکتی ہیں یا اس ٹائم میں آپ آسکیں گی؟ ایسا ہو سکتا ہے اور میں نے کبھی بھی ایسا نہیں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں تو میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں ان کا خیال رکھوں۔"

"بچوں کی تربیت میں کس کا ہاتھ ہوتا ہے؟ کیونکہ بگڑے بچوں کے لیے شوہر بیوی پہ برس رہے ہوتے ہیں کہ تم نے بگاڑا ہے؟"

"تربیت کی ذمہ داری تو ماں پر ہی عائد ہوتی ہے اور یہ بہت زیادہ ذمہ داری کا کام ہے اور مرد ذرا کم ہی یہ ذمہ داری لیتے ہیں اور جو لیتے ہیں' میں سمجھتی ہوں کہ وہ بہت ہی بہادر ہوتے ہیں۔۔ تو اچھی تربیت ہو تو ماں کو ہی شاباش ملتی ہے اور خراب ہو تو الزام بھی ماں پر ہی آتا ہے۔ مگر ذمہ داری یہ دونوں کی ہے۔"

"بچے ماشاء اللہ دو ہیں آپ کے' ان کے بارے میں بتائیں۔"

"بیٹی ہے منیٰ طارق۔۔ جس نے فلم میکنگ میں گریجویشن کیا ہے اور بیٹا ہے۔ نوال جس نے بزنس میں ڈگری حاصل کی ہے۔"

"تو ابھی نانی' دادی یا ساس بننے کے ارادے نہیں ہیں آپ کے؟"

قہقہہ۔۔ "میرا ارادہ تو آج سے دس سال پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ مجھے بچے بہت ہی پیارے لگتے ہیں' بہت ہی پسند ہیں اور پانچ' دس سال پہلے تو میرا جی چاہتا تھا کہ میں کوئی بچہ گود لے لوں۔ اپنے بچے اس لیے دو ہی کیے کہ میں کام میں مصروف ہو گئی اور اب میری زندگی کا مقصد یہ ہی ہے کہ کچھ تبدیلی آنی چاہیے۔"

"تو پھر لے آیئے ایک عدد بہو اور ایک عدد داماد؟"

"بالکل۔۔ ضرور۔۔ ان شاء اللہ بہت جلد یہ خواب شرمندۂ تعبیر کروں گی۔ ان شاء اللہ ویری سون۔ میں تیار ہوں اس کے لیے۔"

"کھانا گھر میں ہی پکتا ہوگا۔۔ تو آپ پکاتی ہیں؟"

"ہمارے یہاں گھر میں کھانا پکتا ہے اور ایک ہیں ہمارے یہاں جو بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں' وہ ہماری زندگی ہیں' ان کے بغیر ہم چل نہیں سکتے' لیکن نگرانی میری ہوتی ہے' تو میں نے ان کی زندگی مشکل بنائی ہوئی ہے۔ ہم سب کا ٹیسٹ بہت الگ سا ہے' اور ہم سب کھانے میں بہت نخرے کرتے ہیں' اور ایک وقت میں ہم سب ٹیبل پہ ہوتے ہیں۔ وہ سہ پہر یا رات دونوں میں سے ایک وقت ایسا ضرور ہوتا ہے کہ ہم سب ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں۔"

"جن لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے آپ کیا کہنا چاہیں گی کہ کس طرح زندگی گزاریں؟"

"میرے نزدیک کامیاب زندگی کا جو گُر ہے اور جو ہم سب کو سمجھ لینا چاہیے کہ اپنی خوشی کے لیے آپ خود ذمہ دار (Responssible) ہیں کوئی اور نہیں۔ اب اس بات کا کوئی غلط مطلب لے لے تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ محبت ہر بات کا حل ہے۔ یہ نہ کہیں کہ جب میں بہو تھی تو ساس اچھی نہیں ملی اور جب میں ساس بنی تو بہو اچھی نہیں ملی۔ میرے نزدیک محبت ہی مسائل کا حل ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے روبینہ اشرف صاحبہ سے اجازت چاہی' اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

✡

شعاع کے ساتھ

ادارہ

نوشین فاطمہ کراچی

1۔ جہاں تک شعاع سے وابستگی کا تعلق ہے تو یہ کم از کم بیس سالوں پر محیط ہے' رسالے پڑھنے کا شوق مجھے میرے ابو سے ملا جو پہلے خود مجھے "بچوں کی دنیا" لاکر دیتے اور اس میں سے کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ان کہانیوں کے شوق نے مجھے بہت ہی چھوٹی عمر میں اردو پڑھنا سکھا دیا۔ گریڈ ون یا ٹو سے ہی میں خود مطالعہ کرنے لگی۔ نونہال' تعلیم و تربیت اور بچوں کی دنیا کے علاوہ ہر ماہ میں بے شمار اسٹوری بکس خریدتی اور یہی شوق میں نے اپنے بچوں میں منتقل کیا۔ آج میں ان کے لیے بے شمار اسٹوری بکس خریدتی ہوں۔

جہاں تک سب سے پہلے شعاع خریدنے کا تعلق ہے تو میں گریڈ فور میں ایک بک شاپ پر نونہال کا خاص شمارہ خریدنے گئی تو وہاں میں نے شعاع دیکھا' دونوں رسالے پندرہ روپے کے تھے۔ وہ ابتدا تھی میری ان رسالوں سے تعارف کی۔ اس وقت میں صرف انٹرویوز پڑھا کرتی تھی یا اینڈ میں جو چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہوتی ہیں وہ پڑھا کرتی تھی۔ اس کے بعد سے باقاعدگی سے تو نہیں البتہ وقتاً" فوقتاً" بھی خواتین تو کبھی شعاع خریدتی اور اس طرح پتا ہی نہیں چلا کہ کس طرح اور کب یہ رسالے میری زندگی کا لازمی جز بن گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ رسالوں سے پڑھائی متاثر ہوتی ہے۔ جبکہ میں نویں اور دسویں جماعت میں ہر ماہانہ ٹیسٹوں اور امتحانات میں ٹاپ آف دا کلاس رہی۔ ڈائجسٹ بھی خوب پڑھے اور ٹی وی بھی خوب دیکھا۔ اس زمانے میں ہما کوکب' شازیہ چوہدری' غزالہ نگار اور نگہت عبداللہ کو بہت شوق سے پڑھتی تھی اور آج کل فرحت اشتیاق اور نمرہ احمد کے ناولز کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔

2 میری صبح تقریباً" سوا چھ بجے ہوتی ہے۔ سب سے پہلے بچوں کے لنچ باکسز بناتی ہوں۔ بیگ وغیرہ سیٹ کرتی ہوں' پھر نو سالہ بیٹی بختاور کو جگا کر تیار کرتی ہوں۔ سات بجے اس کی وین آجاتی ہے۔ پھر ایک صبر آزما مرحلہ شروع ہوتا ہے پانچ سالہ کشمالہ کو جگانے کا۔ جب بھی اس کو اٹھاتی ہوں وہ "تھوڑی دیر اور سونے دو" کہہ کر پھر سو جاتی ہے۔ آخر کار آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد میں اس کو جگانے میں کامیاب ہو جاتی ہوں۔ اس کو واش روم بھیج کر اس کا ناشتا تیار کرتی ہوں' پھر اس کو آج کے ٹیسٹ کا ریوائس کروانے کے دوران ناشتا کرواتی ہوں۔ آٹھ بجے تک وہ اسکول چلی جاتی ہے۔ پھر ناشتا تیار کرتی ہوں اور خود ناشتا کرتی ہوں۔

پھر کام والی ماسیوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ ان سے کام کروانے کے دوران گھر سمیٹتی ہوں' جو کہ بچوں کی بکھری چیزوں کی وجہ سے میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ اکثر اس دوران کھانا بھی بن جاتا ہے۔ ٹی وی پر مارننگ شوز دیکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ گیارہ سے ایک بجے تک کا ٹائم فارغ ہوتا ہے۔ اس دوران کبھی ٹی وی تو کبھی بچوں کے کپڑوں کی ڈریسنگ چلتی رہتی ہے۔ پھر کچن کے برتن وغیرہ سمیٹتی ہوں۔ نماز ظہر ادا کرتی ہوں۔ چھوٹی کشمالہ اسکول سے آجاتی ہے اور آتے ہی اس کا فرمائشی پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ چاکلیٹ' کینڈیز یا بسکٹس وغیرہ سے وہ بہلتی ہے۔ پھر اس کا اسکول بیگ چیک کرتی ہوں۔ نہلا کر کپڑے چینج کرتی ہوں۔ روٹیاں پکاتی ہوں۔ تین بجے بختاور کے آنے پر دونوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہوں۔ دونوں آتے ہی کارٹونز میں مگن ہو جاتی ہیں۔ پھر دونوں کو ساڑھے تین بجے مدرسے چھوڑ کر آتی ہوں۔ ایک گھنٹے بعد لینے جاتی ہوں۔ واپسی پر دونوں دکان سے چیزیں خریدتی ہیں۔ لہٰذا پانچ منٹ کی مسافت آدھے گھنٹے میں طے

ہوتی ہے۔ پھر بچے کھیلتے ہیں۔ میں غسل لے کر عصر کی نماز ادا کرتی ہوں۔ اگر بختاور کے ٹیسٹ ہو رہے ہوں تو پھر رات تک کا ٹائم اس کو پڑھانے میں صرف ہوتا ہے ورنہ رات سے آٹھ کشمالہ کو پڑھاتی ہوں۔ پھر رات کا کھانا اور ٹی وی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

رات کو بچوں کو سلانے کے بعد میں ہوتی ہوں اور میرے ڈائجسٹ۔ عموماً ڈائجسٹ شام کو آتا ہے اور ایک ہی رات میں دو بجے تک جاگ کر میں ڈائجسٹ پورا پڑھ لیتی ہوں۔ باقی مہینہ پرانے ڈائجسٹوں سے گزارا کرنا پڑتا ہے۔ نیا ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی آج بھی سویٹ سکسٹین کی طرح ڈائجسٹ میں اس طرح مگن ہوتی ہوں کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہوں۔ میری کوئی بیٹی بیڈ روم سے جاگ کر باہر بھی آجائے تو اے سی کے بغیر ڈرائنگ روم میں ہی سلا لیتی ہوں، لیکن کہانی ادھوری چھوڑ کر جانا مجھے منظور نہیں ہوتا۔ بختاور کو اے سی کے بغیر نیند نہیں آتی۔ وہ ہر تھوڑی دیر بعد پوچھتی ہے کہ مما کتنے پیج رہ گئے ہیں۔ لیکن میں جب تک رسالہ پورا ختم نہ کرلوں، مجھے چین نہیں آتا۔

3 شعاع کی ایسی بہت سی تحریریں ہیں جو ذہن پر آج بھی نقش ہیں۔

جہاں تک تعلق ہے کسی کردار میں اپنے کردار کی جھلک کا تو ایسا بارہا ہوا لیکن افسانہ ذہن میں محفوظ نہیں۔ البتہ فرحت اشتیاق کی محبتوں سے گندھی کہانیوں میں ہیرو جس طرح کیئرنگ اور ٹوٹ کر چاہنے والے ہوتے ہیں، وہ بہت متاثر کرتے ہیں۔

4 خامیوں میں سرفہرست خامی یہ ہے کہ میرے لیے کسی کی زیادتی کو بھلا دینا اور اس کو معاف کر دینا ایک دشوار ترین عمل ہے۔ میرے ساتھ جس جس نے زیادتی یا حق تلفی کی میں آج تک اس کو بھلا نہیں سکی۔ حتیٰ کہ مجھ پر ظلم کرنے والے کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا انجام بھی مجھے اس کی زیادتیاں بھلا دینے کا سبب نہیں بن سکا۔ (اف! محبت کی کہانیاں پسند کرنے والی اس قدر منتقم مزاج اور سخت؟)

مجھے اپنے اندر سب سے بڑی خوبی یہ لگتی ہے کہ اب مجھ میں برداشت، صبر اور ہمت بہت آگئی ہے۔ اب اگر میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا یہ کٹھن ترین دور جو آٹھ سال پر مبنی تھا کیسے گزارا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دور مجھ میں شکر گزاری کی خوبی بھی پیدا کر گیا۔ آج اچھے وقت میں، میں ہر لمحہ خدا کا شکر ادا کرنا نہیں بھولتی کہ مجھے اس دردناک ماضی سے نجات مل گئی۔

اپنے بچوں کی میں ایک کیئرنگ مما ہوں۔ دونوں بچے میرے بنا ایک لمحہ نہیں رہ سکتے۔ نیند سے جاگنے کے بعد وہ دونوں مجھے ہی پکارتے ہیں اور اگر میں کبھی شاپنگ پر چلی جاؤں تو دونوں گھر والوں کے لاکھ اصرار کے باوجود بھوکی بیٹھی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں اور میری بہن ایک دوسرے کی بہترین ہمراز ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور خوبی یہ کہ میں بہت زندہ دل خاتون ہوں۔

5 ساون کا موسم آج بھی مجھے دیوانہ کر دیتا ہے۔ شادی سے پہلے بھی میں چھت پر جی بھر کر بارش میں نہاتی تھی اور آج بھی اکثر دونوں بیٹیوں کے ساتھ برسات کے پکوان کھاتے ہوئے بارش انجوائے کرتی ہوں۔ برسات میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے آج بھی مدہوش کر دیتی ہے۔ برسات کے بعد نکھرا نکھرا سبزہ نہایت حسین لگتا ہے۔

6 پسندیدہ اقتباس عمیرہ احمد کے ایک ناول سے ہے۔

"جو لوگ دوسروں کے دلوں کو کانٹوں سے زخمی کرتے ہیں۔ ان کے اپنے اندر کیکر اگے ہوتے ہیں۔ وہ چاہیں یا نہ چاہیں ان کے وجود کو کانٹا ہی بننا ہوتا ہے۔ وہ پھول نہیں بن سکتے۔"

پسندیدہ کتاب ابو یحییٰ کی "جب زندگی شروع ہوگی"

نور آمنہ... رحیم یار خان

1۔ شعاع 2005ء میں پڑھنا شروع کیا۔ جب نانا ابو نے تعلیم اسلام ختم کروائی تو پڑھنے کا شوق شروع ہوا۔ اخبار بچوں کا رسالہ مجھ سے کچھ نہیں بچتا تھا۔ ہماری امی اور آنٹیوں نے دینی و دنیاوی تعلیم نانا ابو سے ہی حاصل کی ہے' ہمارے ہاں لڑکیوں کو گھر سے باہر بھیجنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سو امی پڑھتی تھیں شعاع۔ میں بھی جب تین سال کی ہوئی تو اسکول کے بجائے مسجد بھیجا گیا۔ یوں میں حفظ قرآن کے ساتھ اردو لکھنا پڑھنا بھی جان گئی تھی۔ شعاع تب پڑھنا شروع کیا۔ جب پتا نہیں ہوتا تھا کہ کیا پڑھ رہی ہوں۔ مجھے تو اسٹوری پڑھنی ہوتی تھی' ایک دن میں مدرسے سے آئی تو بڑا اچھا موسم تھا۔ امی شعاع پڑھ رہی تھیں۔ وہ میری فطرت سے واقف تھیں کہا۔

"بیٹا! یہ بچوں کا رسالہ نہیں ہے۔"

مجھے تو ٹائٹل اتنا پسند آیا۔ تب سے اب تک پڑھ رہی ہوں۔ دس سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے' بس جی میرے شوق شروع سے نرالے تھے۔

2۔ میری صبح کا آغاز ابو کی کال سے ہوتا ہے جو جگاتے ہیں کہ اٹھ جاؤ' جانا بھی ہے۔ نماز پڑھ کے زبانی تلاوت قرآن پاک بھی جاری رہتی ہے اور ناشتا بنانا بھی' سب کو ناشتا دے کر جلدی جلدی تیاری کرکے اسٹاپ تک جاتی ہوں۔ پوائنٹ سے یونی وہاں لیکچرز لے کے بُرا حال ہو جاتا ہے۔ گھر واپس آکے جس دن شعاع ہو یونیفارم چینج اور کھانا بھول کے شعاع میں گم امی آئیں گی۔ رسالہ گم' سوتی بن جاؤں گی وہ گئیں' رسالہ شروع' یوں رات تک رسالہ ختم کرکے میں ٹینشن فری اور گھر والے بھی' کیونکہ مہینے کی پہلی دوسری تاریخ میں معمولات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شعاع پڑھتے ہوئے مدرسہ میں قرآن پاک پڑھانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے اس وقت بند کردیتی ہوں۔ اسکول اور مدرسے کے بچوں کو چھٹی دے کے شعاع میں گم۔ رات کا کھانا چھوٹی بہن بناتی ہے۔ نمازیں میں ساتھ ساتھ پڑھتی ہوں۔ مغرب کے بعد سب چائے پیتے ہیں۔ وہ بھی میرے ہاتھ کی بنی ہوئی۔ اس لیے ایک نہیں چلتی' شعاع رکھ کے کچن میں جاتی ہوں۔ سب کو چائے بنا کر دیتی ہوں۔ اپنا کپ لیتی ہوں کہ پھر شعاع' اس کے بعد کا سارا وقت میرا اپنا ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔ سو سب جلدی عشاء کے بعد سو جاتے ہیں۔

3۔ شعاع میں ہر تحریر ہی اچھی ہوتی ہے۔ لیکن کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں۔ بھلائے نہیں بھولتیں۔ ان میں نمرہ احمد کی "بیلی راجپوتاں کی ملکہ' مصحف' جنت کے پتے" ایسی تحریریں ہیں۔ جنہوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کے بعد میں نمرہ احمد کی ہر تحریر کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی۔ اس کے بعد نمل بھی گمتی ہے ابھی نہیں' کیونکہ میں شعاع لیتی ہوں' اس کی وجہ یہ ہے کہ میں پڑھ رہی ہوں۔ وقت کم ملتا ہے۔ اس کے علاوہ "زمین کے آنسو' جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو' بلیو مون' چراغ آخری شب" یہ تحریریں کبھی نہیں بھولیں گی۔

4۔ جہاں تک بات ہے' میری خوبیوں' خامیوں کی تو جی مجھے دوستوں کی محفل میں جانا ہوگا۔ مہوش کہتی ہے کہ آمنہ تم کبھی فنکشن میں نہیں جاتیں تم لوگوں سے نہیں ملتیں۔ تم بہت معصوم ہو۔ رضیہ نے کہا کہ میں بہت ضدی اور انا پرست ہوں۔ کوئی دوست ناراض ہو جائے تو وہ ہی پہل کرتی ہیں' میں نہیں کرتی۔ مجھے لگتا ہے کہ میں مناؤں گی تو اور ناراض ہو جائیں گی۔ اقرا کہتی ہے۔ یونی آئی ہو تو اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔ اس لیے میرے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکچر ختم ہوا پکڑ کے باہر لے گئی۔ ارم کہتی ہے تم بہت پیاری ہو۔ امی کہتی ہیں کہ جلد باز ہوں۔ اس وجہ سے وہ مجھے جلد باز اور بے چین روح کہتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں بہت حساس ہوں کوئی مرجائے تو کئی دن میں اس کیفیت میں رہتی ہوں' ہائے مجھے بھی مرنا ہے۔ مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بہر حال مرنا تو اٹل ہے۔ خامیاں' خوبیاں علیحدہ کرنے کا کام آپ کی مرضی پر چھوڑتی ہوں۔ آپ خود ہی حساب کرلیجئے گا۔ میں حساب کتاب سے بہت بھاگتی ہوں۔ ہاہاہا۔

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس، بہو کا تعلق ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عدیل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کرپاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں متوقعین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آ جاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آ جائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے

جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ پاتی ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر بشریٰ اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلاتا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے۔ بشریٰ کے آنے کے بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی اچانک شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں، مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور ایک بار پھر بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی، پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ بشریٰ اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک منشی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں عمران کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً "پوش ایریا" میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا

ہے۔ مثال' واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار' وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

سیفی' مثال پر بری نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیخوں سے سب وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سیفی الٹا مثال پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اسے بہکا رہی تھی۔ احسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کرلیتا ہے۔ مثال اور بشریٰ مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ نہیں پاتیں۔ احسن کمال پوری فیملی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ بشریٰ مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں عفت اور پریشے اسے خاطر میں نہیں لاتیں۔ واثق کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور واثق کے درمیان ان کہا سا تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ واثق البتہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرچکا ہے۔ واثق' عاصمہ سے اپنی کیفیت بیان کردیتا ہے۔ عاصمہ خوش ہو جاتی ہے مگر غائبانہ ذکر پر بھی مثال کو پہچان نہیں پاتی۔ واثق عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر ملنے جاتا ہے۔ مگر دروازے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو برسوں پرانی رات یاد آجاتی ہے۔ جب زبیر نے عاصمہ کی عصمت دری کرکے اسے ویرانے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا بیتی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ کو نہیں پہچانا تھا مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیانک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے احساس سے عاصمہ کو انجائنا کا اٹیک ہو جاتا ہے۔ واثق دروازے سے ہی ماں کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے فہد سے مثال کا رشتہ طے کردیتا ہے۔ عفت' مثال کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر بری طرح جل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہ رشتہ پریشے سے طے ہو جائے۔ مثال بھی اس رشتے پر دل سے خوش نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پارہی۔ عاصمہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی فہد سے منگنی کی تقریب ہو رہی ہوتی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے واثق کی ملاقات پریشے سے ہو جاتی ہے جو کافی ناز و ادا سے واثق سے بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس فیلو وردہ جو اسے بہت پسند کرتی ہے' واثق کی بہن ہے۔ منگنی کے بعد مثال ایک دم شادی سے انکار کردیتی ہے۔ عفت خوش ہو جاتی ہے۔ عدیل بہت غصہ کرتا ہے اور بشریٰ کو فون کرکے مثال کو بھیجنے کی بات کرتا ہے۔ گھر میں ٹینشن پھیلی ہے۔ اسی ٹینشن میں مثال کالج کی لائبریری میں واثق سے ملتی ہے۔ واپسی میں عفت اسے واثق کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتادیتی ہے۔ عدیل از حد پریشان ہو جاتا ہے۔ پریشے' وردہ سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو واثق سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

چھبیسویں قسط

مثال کے قدم وہیں جیسے زمین میں جکڑے رہ گئے۔ اس نے تو یہ بات خواب میں بھی نہیں سوچی تھی کہ یوں وہ واثق کے ساتھ چل رہی ہو اور پاپا آجائیں گے وہ وہیں قدم روکے گم صم کھڑی رہی۔

عدیل اسے تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ واثق غیر ارادی طور پر تھوڑا سا مثال سے ہٹ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

"السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟" وہ واثق کی اس جرأت پر کچھ حیران و پریشان سی کھڑی رہ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر عدیل کے آگے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر باقاعدہ سلام کیا تھا۔

جواب میں عدیل کچھ حیران اور خاموش سا کھڑا رہا۔

"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں واثق عفان ہوں لاسٹ منتھ ہماری اے آر سنز کی سائٹ پر ملاقات ہوئی تھی۔ بریفنگ تھی آپ اپنے آفس کی طرف سے آئے تھے۔"

"وہ لیس آئی وی منیجر۔ واثق۔ مجھے آپ یاد رہے تھے اچھی طرح سے کیونکہ آپ نے جس طرح وہ سراہی بریفینگ دی تھی۔ میں امپریس ہوا تھا آپ کے اعتماد اور آپ کی معلومات سے۔" عدیل غیر متوقع طور پر خوش ہوا تھا۔

"تھینکس سر۔ تھینک یو ویری مچ۔" واثق گرم جوشی سے بولا۔

"یو ویلکم سر!" عدیل کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

"یہ شخص بھی دوسرے کو گھیرنے کی خوب صلاحیت رکھتا ہے۔" مثال نے کن انکھیوں سے واثق کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچا۔ کاش واثق کا تعارف بابا سے کسی اور طرح سے ہوتا تو میں اپنی زندگی کے سارے دکھ ساری محرومیاں بھول جاتی مگر ہر خواہش ہر دعا کب قبول ہوتی ہے۔

وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے اب آپس میں کچھ بات کر رہے تھے۔ مثال آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے پیچھے چلتی جارہی تھی جہاں رستہ دو سڑکوں میں تقسیم ہوا تھا۔ واثق الوداعی مصافحہ کرکے اپنی سڑک کی طرف مڑ گیا تھا۔

عدیل نے مڑ کر مثال کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اس کے پیچھے چند قدم پر کھڑی تھی۔

"آجاؤ۔ ضروری نہیں تھا کہ اب یوں باہر نکلو۔ میں اس لیے جلدی گھر آگیا تھا کہ گھر میں بہت کام ہوں گے۔" عدیل کے لہجے میں بہت کچھ جتانے والا تھا۔

"سوری بابا! لیکن مجھے لائبریری کی کچھ بکس واپس کرنی تھیں اس لیے مجھے آنا پڑا۔" وہ معذرت خواہ لہجے میں سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔

"اب تو کچھ ایسا نہیں ہے نا تمہارے پاس جو پھر سے لوٹانے کے لیے جانا پڑے؟" وہ کچھ جتا کر بولا تو اس نے خفیف سا نفی میں سر ہلا دیا۔

"بہت کچھ تو ایسا ہے جو دل ہی میں رہ گیا' واثق کی محبت' اس کی توجہ بہت سی۔ ان کہی باتیں' تشنہ خواہشیں۔"

وہ حسرت سے سوچتی چلی گئی۔

عدیل کے قدم تیز ہو چکے تھے' وہ بھی رفتار بڑھا کر اس کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"عدیل!" عفت کچھ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے خود فوزیہ کی یہ بات اچھی نہیں لگی جس طرح اس نے فون کرکے مجھے کہا کہ اگر دانی وہاں اسٹڈیز میں دلچسپی نہیں لے رہا تو آپ اسے میرے پاس بھجوا دیں۔ مجھے لگا ہیں تم نے تو اسے فون کرکے یہ سب کچھ نہیں کہا۔" وہ کچھ ناراض لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"عدیل! میں ایسا کیوں کہنے لگی۔ پھر آپ جانتے ہیں۔ میں دانی کے لیے تو ایسا کبھی بھی نہیں کہہ سکتی۔" وہ مدہم لہجے میں بولی۔

"جانتا ہوں دانی تمہاری کمزوری ہے۔ تم اسے خود سے دور کرنے کا تو کبھی بھی نہیں سوچو گی۔" وہ طعنہ نہیں دے رہا تھا مگر عفت کو کچھ ایسا ہی لگا۔

"تو کیا دانی آپ کی کمزوری نہیں۔ اکلوتا بیٹا ہے وہ آپ کا۔" وہ بھی کہے بغیر رہ نہ سکی۔

"کمزوری ہی تو بن گیا ہے وہ میری" وہ منہ میں کچھ کوفت سے بڑبڑا کر بولا۔ تو عفت کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

"آج اس کے اسکول بھی گیا تھا' وہی بات جس کی میں امید کر رہا تھا' اس کے پرنسپل نے اسکول سے فراغت کا نوٹس میرے ہاتھ میں تھمایا اور میں نے بھی ذرا اصرار نہیں کیا کہ وہ اسے رکھ لیں' اسکول میں' اچھا ہے جان چھٹی وہاں سے تو۔" وہ اسے تفصیل بتاتے ہوئے خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔

عفت کچھ پریشان سی ہو گئی۔

"لیکن عدیل اس کا سال ضائع ہو گا اس طرح تو۔"

"وہ تو ہو چکا آل ریڈی۔" وہ کچھ لاپروائی سے بولا۔

"صرف تین چار ماہ تو ہیں ایگزام میں' وہ دے لیتا پھر آپ اس کا اسکول بدل دیتے۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے اس نے ایگزامز میں نکل جانا ہے' تین چار ماہ ہوں یا کچھ دن عفت! وہ پڑھائی کے خیال سے بالکل ہٹ چکا ہے' کچھ فائدہ نہیں بیکار میں اسکول ڈیوز بھرنے کا۔" وہ جیسے طے کر چکا تھا کہ اب دانی سے کچھ بھی امید نہیں لگانی۔

"تو کیا کرے گا پھر وہ' ہو نہی آوارہ ہی تو پھرے گا' گھر میں تو وہ ٹکتا نہیں۔" عفت کو دوہری پریشانی نے گھیر لیا۔

"نہیں' میں کل جا رہا ہوں۔ بہت اچھا اسکول ہے۔ اس کا پرنسپل میرا کلاس فیلو بھی رہ چکا ہے' میں اس سے دانی کا کیس ڈسکس کر چکا ہوں۔ اس نے اسپیشل کیس کے طور پر لیتے ہوئے مجھ سے وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ دانی کو ان شاء اللہ سدھارنے میں ہماری مدد کرے گا' ہمیں بھی اب اس پر نظر رکھنی ہو گی۔ مجھے امید ہے چند مہینوں میں ہی ہمیں دانی کی طرف سے اچھے رزلٹ ملنا شروع ہو جائیں گے۔" وہ امید بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"سچ میں عدیل۔ اگر ایسا ہو جائے میں سمجھوں گی۔ اللہ نے میری ہر دعا قبول کر لی۔" عفت جذباتی ہو کر رونے ہی لگی۔

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ میں بھی اس پر توجہ دوں گا۔ تم بھی اس کا خیال رکھو۔ اسے غیر محسوس طور پر گھر کی مصروفیات میں الجھاؤ۔ کچھ کام اس کے ذمے لگاؤ۔ وہ ضرور بہتر ہو گا۔ اس عمر میں لڑکے ضرور پریشان کرتے ہیں' ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا وہ۔"

عدیل بہت ہلکا پھلکا ہو رہا تھا جیسے بہت بھاری بوجھ اس کے سر سے اترا ہو۔ عفت نے بہت دنوں بعد اسے یوں مطمئن' سادہ دیکھا تھا۔

"پھر تو آپ نے بھی نسیم آنٹی کو خوب پریشان کیا ہو گا۔" عفت اس کے موڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ شوخی سے بولی۔

"نہیں بھئی۔ میں تو شروع سے اچھا بچہ تھا۔ بہت دل لگا کر پڑھنے اور محنت کرنے والا' پھر جاب ملی تو بھی میں نے اس میں بہت دل سے کام کیا۔ بشریٰ سے شادی کے بعد تو۔"

وہ جو روانی میں بولتا جا رہا تھا۔ اتنے سال ان دونوں کو جدا ہوئے گزر چکے تھے' پھر بھی خیالات کے دباؤ اور روانی میں اکثر وہ عفت کو فراموش کر کے بشریٰ کو اس کی جگہ لے آتا۔

دونوں کچھ لمحوں کے لیے گنگ سے رہ گئے۔

"میں جانتی ہوں' آپ شروع سے بہت ذمہ دار اور خیال رکھنے والے تھے۔" عفت آہستگی سے بولی۔ "آپ نے فوزیہ کو کیا جواب دیا۔" وہ موضوع بدلتے ہوئے عدیل کو اس شرمندگی کی کیفیت سے نکال کر بولی۔

"وہی جو مجھے دینا چاہیے تھا' ابھی جب تک اس کی اسٹیڈیز مکمل نہیں ہو تیں۔ ایسا کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔" وہ پھر سے پہلے والے انداز میں بولا تو عفت بھی سہلا کر رہ گئی۔

"تم نے چیزوں کی لسٹ بنائی تھی مثال کی شادی کے لیے؟" اس نے اسے وہ کام یاد دلایا وہ جس کام کے لیے جلدی آفس سے اٹھ کر آیا تھا۔

"ہاں۔ کچھ چیزیں میں نے لکھی تو ہیں۔"

وہ اٹھ کر الماری سے ڈائری اور پین نکالنے لگی۔

"یہ آپ دیکھ لیں پھر مجھے بتادیں اور کیا کیا لکھنا ہے۔" وہ اس کو دکھاتے ہوئے بولی۔ عدیل لسٹ دیکھتے ہوئے اسے کچھ اور چیزیں لکھوانے لگا۔

☼ ☼ ☼

"خوش ہوں میں مما!" وہ آہستگی سے بولی۔ بشریٰ اب ہر کال میں اس سے یہ سوال ضرور پوچھتی تھی۔

"اگر میں ناخوش بھی ہوں گی تو آپ کیا کرلیں گی، مجھے اپنے پاس بلوالیں گی؟ یا میرے پاس آجائیں گی۔؟" وہ افسردہ سی ہو کر دل میں خود سے بولی۔

"میری یہی دعا ہے اب دن رات تمہارے لیے مثال کہ میری بیٹی کی آنے والی زندگی بہت خوش گوار، بہت شان دار ہو اُسے شوہر کی سسرال کی بہت محبت ملے، میری بیٹی کے دل میں کوئی دکھ کوئی محرومی باقی نہیں رہے۔" بشریٰ ہولے ہولے کہہ رہی تھی جیسے وہ بولتے ہوئے اپنے آنسو بھی صاف کر رہی ہو۔

بشریٰ نے کئی بار اس سے کہا کہ اور اسکائپ پر بات کرے مگر جانے کیوں مثال چاہتی نہیں تھی کہ وہ ماں کے روبرو ہو، وہ فون پر آسانی محسوس کرتی۔

"مثال! میں، اور عدیل تم سے بہت محبت کرتے تھے لیکن ہم اچھے ماں باپ ثابت نہیں ہوئے، بالکل بھی ہم نے تمہارا اس طرح سے خیال نہیں رکھا آپس کے جھگڑوں میں پڑ کر جس طرح ہمیں تمہارا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ تمہاری پروا کرنی چاہیے تھی۔ پھر تمہیں ہم دونوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی بہت سی محرومیاں جھیلنی پڑیں جب میں یہ سب سوچتی ہوں تو میرا دل بہت روتا ہے۔" بشریٰ آج کسی اور ہی دنیا میں تھی۔

"مثال! اپنی بے بس ماں کو بیٹا معاف کر دینا میں نے پہلے صرف یہ سوچ کر تمہاری زندگی میں مثبت تبدیلی آئے احسن کمال سے شادی کی مگر بعد میں جو کچھ ہوا اس شادی کو بچانے کے لیے کیونکہ میری ایک شادی پہلے ٹوٹ چکی تھی، اور میں تو شاید دوسری شادی بھی تمہارے لیے ختم کر لیتی مگر یہ دنیا معاف نہیں کرتی نہ بھولتی ہے۔ اس نے تمہیں طعنے دے دے کر تمہارا جینا حرام کر دینا تھا کہ جیسی ماں تھی ویسی بیٹی ہوگی جو خدانخواستہ کبھی گھر نہیں بنا سکے گی۔ تم سن رہی ہو ناں مثال؟" وہ افسردہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"جی مما!" وہ ہولے سے بولی۔

"میری جان! تمہاری نئی زندگی شروع ہونے جا رہی ہے یقیناً فہد بہت اچھا لڑکا ہوگا۔ تم اس سے پوری ایمان داری سے محبت کرنا اور بیٹا ساتھ میں اپنی ساس سسر کا بہت خیال رکھنا اور مثال پتا ہے میں اس رشتے سے کیوں خوش ہوں کہ فہد اکلوتا ہے۔ دوسرے بہن بھائی کا کوئی جھنجھٹ نہیں ورنہ بعد میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اللہ میری مثال کی نئی زندگی میں کبھی کسی دکھ کی ہلکی پرچھائیں بھی نہیں ڈالے۔"

وہ اسے دعائیں دیتی جا رہی تھی۔

"اچھا سنو مجھے بتاؤ۔ تم مجھ سے کیا گفٹ لوگی۔ اپنے طور پر تو میں کچھ نہ کچھ بھجوا رہی ہوں لیکن تمہیں جو مجھ سے چاہیے وہ بھی تم مجھے بتادو۔" وہ بہت خوش تھی۔

"نہیں مما! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"مشال میری جان! ناراض ہو مجھ سے ابھی تک؟" وہ بے قراری سے بولی۔

"نہیں مما! میں کیوں آپ سے ناراض ہونے لگی۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ میں آپ سے ناراض ہوں' پاپا بلا رہے ہیں' میں آپ سے پھر بات کرتی ہوں۔" اس نے فون بند کر دیا۔ اسے اب بشریٰ کے اس پیار بھرے رویے سے بہت الجھن سی ہوتی تھی۔ اسے ساری محبتیں ہی اب بناوٹی لگنے لگی تھیں۔

"شاید اس لیے بھی خوش ہیں کہ اب پاپا جو مجھے ان کے پاس بھیجنے کی بات کر رہے تھے' وہ معاملہ بھی ختم ہو جائے گا۔" وہ یونہی فون ہاتھ میں لیے سوچنے لگی۔

"مما کی شادی ختم ہونے کی بڑی وجہ فوزیہ پھپھو۔ مما اس بات پر خوش ہیں کہ میری کوئی نند نہیں۔ اور فہد اس سے ایمان داری سے محبت کیسے کروں گی۔ میں تو اس کی محبت میں پہلے ہی بے ایمانی کر چکی ہوں۔" وہ مضطرب سی کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"جب بھی فہد کی محبت کا خیال کروں گی۔ اسے چاہنے لگوں گی' کیا واثق کی محبت میرے دل سے ختم ہو جائے گی' یا خدا یہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ پہلے بٹی ہوئی تقسیم شدہ زندگی گزارتی رہی اور اب بٹی ہوئی محبت۔ میں بکھرتی رہوں گی فہد کے لیے خود کو سمیٹوں گی اور واثق کے لیے پھر سے بکھر جاؤں گی۔ پتا نہیں میں اسے بھول بھی سکوں گی یا نہیں؟" اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔

وہ پل صراط سے مرحلے جن کے آنے کا خیال اسے ہراساں کیے ہوئے تھا۔ اس کے جانے کے دن بہت قریب آگئے تھے شام رات میں ڈھل رہی تھی اور کل اسے یہاں سے رخصت کرنے کی تاریخ طے ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت دیر سے بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

جو کچھ اس حال میں تھا کہ شاید اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے؟ وہ کون ہے' کسی گہری سوچ میں مستغرق!

کسی ایسے مسئلے پر دھیان کی ساری سیڑھیاں لگائے' وہ کسی اور ہی جہاں میں تھا' جس کا حل شاید کہیں بھی نہیں تھا۔

وہ سحر زدہ چلتی ہوئی اس کے پاس آکر لحہ بھر کو جھجکی پھر کچھ بے خوف سے انداز میں یوں بیٹھ گئی' اس سے ذرا فاصلے پر' جیسے دو دوست بیٹھتے ہیں' وہ اسی طرح بے خبر بیٹھا تھا۔

"وہ کون ہے' جس سے آپ محبت کرتے ہیں؟" اس نے پژمردہ سے لہجے میں سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا تھا۔

اور واثق یوں اپنی جگہ سے اچھلا' جیسے کسی نے اسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگایا ہو' وہ اسے یوں اپنے اتنے قریب بیٹھا دیکھ کر شاک میں آگیا۔

"کون ہے وہ جسے آپ اتنے دھیان سے سوچ رہے ہیں۔ پلیز بتائیں ناں' میں اس خوش نصیب لڑکی کا نام جاننا چاہتی ہوں۔" پری کے چہرے پر اشتیاق بھی تھا' اور امید کا جھتا دیا بھی! جیسے واثق جواب میں اس کا نام لے دے گا۔ واثق کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ مٹھیاں بھینچے جیسے خود پر ضبط کر رہا تھا۔

"میں اس کا نام جان سکتی ہوں؟" پری نے جھجکتے ہوئے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ کو چھوا تھا۔

اور واثق یوں اپنی جگہ سے اچھلا جیسے کسی نے اسے اوپر اچھالا ہو' اس کا ہاتھ پری کو تھپڑ مارنے کے لیے اٹھا اور شدید برداشت کے مرحلے سے گزرتے ہوئے جیسے ہوا ہی میں معلق رہ گیا۔

"مارنا چاہتے ہیں پلیز تو مار لیجیے۔ مجھے اچھا لگے گا۔ آپ سے میرا کوئی تو تعلق بنے بھلے دشمنی کا ہو یا دوستی کا۔"

وہ اس بے خوف لہجے میں کہہ رہی تھی جس سے وہ پہلے اس سے بات کرتے ڈرتی تھی۔

"شٹ اپ۔ یو شٹ اپ!" واثق جبڑے بھینچے حلق کے بل غرا کر بمشکل ہی بول سکا۔

پری کی آنکھوں میں نا سمجھی سی حیرت اتر آئی جیسے اسے یقین ہی نہ ہو جواب میں اسے یہ کچھ سننا پڑے گا۔

"میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" وہ مصنوعی انداز میں کچھ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی بہت حیران سی۔ اور واثق کا جی چاہ رہا تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دے۔

"دردانہ گھر پر نہیں ہے اور امی بھی نہیں ہیں' جب تمہیں آنا ہو تو پہلے تو انہیں کال کر کے یہاں آیا کرو اور پلیز اب جاؤ یہاں سے کیونکہ میں گھر میں اکیلا ہوں۔" وہ رخ پھیرے چہرے پر خوفناک سے تاثرات لیے بہت رک رک کر بولا تھا جیسے خود کو تہذیب کے دائرے میں رہنے پر مجبور کر رہا ہو۔

وہ اسے دیکھتی رہ گئی اور دوسرے لمحے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ واثق نے اسے سخت ناگوار نظروں سے دیکھا یہ لڑکی خود جتنی بے باک تھی اس کی ہنسی میں بھی بے خوفی تھی۔

پتا نہیں کب کہاں اس نے یہ جملہ پڑھا اور اس کے ذہن پر جیسے نقش ہو گیا تھا۔

"جو لڑکی بے خوف ہنسی ہنسے وہ اچھی لڑکی نہیں ہوتی۔" اور وہ ایسی ہی ناپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ارے یہ خوف تو لڑکیوں کو ہوتا ہے کہ وہ گھر میں اکیلی ہیں اگر ان کا کوئی بوائے فرینڈ ملنے کے لیے آجائے تو وہ اس طرح اسے جھٹک کر واپس جانے کو کہتی ہیں جا ہے ان کا دل اندر سے اسے گھر کے اندر رہانے کو چاہ رہا ہو۔ جیسے کہ اس وقت آپ کا دل چاہ رہا ہے ناکہ میں نہ جاؤں کہیں بس یہیں رک جاؤں' ٹھہر جاؤں ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس۔ آپ کے گھر میں۔ ہے نا؟" اس کی صرف ہنسی ہی بے خوف نہیں تھی اس کی سوچ بھی بے باک تھی۔

واثق کو ——— اس لڑکی سے جو بھی اسے تو وہ کی طرح بالکل لاابالی سی لگتی تھی۔ پہلی بار ہی اس سے عجیب سی گھن محسوس ہوئی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا! آپ کا دل کیونکر چاہے گا کہ اتنی اچھی پیاری بلکہ اگر میں صاف آپ کے لفظوں میں بولوں تو ایسی باتیں کرتی لڑکی ایسی تنہائی میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر چلی جائے نہیں چاہ رہا ناں آپ کا دل؟"

وہ اس کے بالکل پیچھے آکر یوں اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوئی تھی کہ دونوں کے بیچ میں سے گزرتی ہوا کو بھی رستہ بہت تنگ پڑ رہا تھا!

وہ اس کے بہت قریب تھی کہ ذرا سی حرکت خفیف سی آہٹ دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر سکتی تھی۔ واثق کا ضبط جیسے جواب دے گیا۔

"اگر ایسے میں کوئی آگیا امی یا دردانہ انہوں نے دونوں کو یوں کھڑے دیکھ لیا تو کون یقین کرے گا اس میں واثق انوالو تھا یا نہیں یہ صرف پری کی کاوش تھی۔"

وہ تیزی سے پلٹا اور اس نے کھینچ کر ایک تھپڑ پری کے چہرے پر جڑ دیا۔

"یہ ہے تمہاری اس بے باک گفتگو کا جواب۔" وہ دانت پیس کر تنفر سے بولا۔ اور پری کو اس تھپڑ سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی جتنی واثق کے اجنبی رویے سے عجیب سا دکھ ہوا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر سے گئے۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں ٹھہرا پانی لیے اسے دیکھتی جا رہی تھی جس

کی آنکھوں میں حسرت، نفرت، بے زاری اور بیگانگی تھی اور کچھ بھی نہیں۔
اس کچھ کی تلاش نے تو اسے بے باک بنایا تھا۔ وہ سمجھی تھی کہ اگر وہ خود سے پہل کرے گی تو بہت کچھ خود بخود آسان ہوتا چلا جائے گا۔ محبت کے رستے بھی اور واثق کی چاہت بھی!
"نکلو یہاں سے اور آئندہ تم میری موجودگی میں اس گھر میں نہیں آؤ گی۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔" وہ ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بیرونی دروازے تک لے آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی جا رہی تھی۔
"تم جیسی لڑکیاں عزت کرنے تو کیا کسی بھی قابل نہیں ہوتیں، تمہیں اپنی شکل پر بہت ناز ہے، اپنے حسن پر بہت غرور ہے اور تم مجھے ایک عام شکل کی گئی گزری لڑکی سی بھی بری لگی ہو اس میں کم از کم شرم، کچھ حیا تو ہو گی۔"
واثق شدید جذباتی پن میں پھولے سانسوں کے درمیان بول رہا تھا۔
پری کی تو جیسے حیرت ہی نہیں جا رہی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو اتنی حسین، اتنی خوب صورت ہے وہ خود سے کسی مرد کی طرف پیش قدمی کرے اور وہ مرد اسے جھٹک کر دور ہٹا دے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔
اس کا دل عجیب طریقے سے دھڑک رہا تھا بہت آہستہ آہستہ ڈوبتا ابھرتا اور پھر نیچے ہی نیچے جاتا ہوا۔
وہ کمزور دل نہیں تھی مگر اس وقت اسے لگا جیسے اس کے بدن کی پوری عمارت کسی بھربھری ریت کی دیوار کی طرح ڈھتی جا رہی ہے آہستہ آہستہ نیچے گرتی جا رہی ہے۔
"جاؤ یہاں سے اور اگر تم میں تھوڑی غیرت، شرم یا اپنے ماں باپ کی عزت کا لحاظ ہو گا تو آئندہ کسی بھی غیر مرد کے ساتھ اس طرح کی بے ہودہ بکواس کرنے سے پہلے سو بار سوچو گی۔" نفرت سے کہہ کر اس نے پری کا ہاتھ چھوڑ کر اسے باہر کی طرف دھکا دیا اور وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے ہی یوں بے دم ہو کر گری جیسے کسی نے اس کے بدن سے روح ہی کھینچ لی ہو۔
وہ سیدھی جا کر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرائی اور دوسرے لمحے زمین پر گر کر ڈھیر ہو گئی۔
اور یہ بات تو واثق کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ اس طرح کا ڈرامہ کرے گی بجائے یہاں سے دفعان ہونے کے، شرمندہ ہو کر چلے جانے کے وہ یوں دہلیز کے آگے ہی ڈھیر ہو جائے گی۔
"تم نے سنا نہیں۔ اٹھو اور جاؤ یہاں سے اس سے پہلے کہ کوئی یہاں آ جائے۔ جاؤ اپنے گھر۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے درشت لہجے میں پکارا۔
مگر وہ بے حس و حرکت وہیں پڑی رہی۔ ایک دو تین چار۔ بہت سارے لمحے خاموشی سے گزر گئے، وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ واثق کو پریشان سی ہوئی۔
"اے کیا مر گئی ہو۔ اٹھو یہاں سے اور جاؤ فوراً۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر رک کر قدرے محتاط لہجے میں بولا۔ وہ بالکل نہیں ہلی۔
"یہ اس کا کوئی فریب بھی ہو سکتا ہے کوئی ناٹک۔ یہ لڑکی کچھ بھی... کچھ بھی کر سکتی ہے مجھے اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔" وہ کچھ پریشان سا خود کو سمجھاتے ہوئے ذرا سا آگے بڑھا۔
"یہ تو بے ہوش ہو گئی ہے۔" یوں گٹھڑی کی طرح بے حس و حرکت پڑے دیکھ کر خود سے کہا۔ اب آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں۔ آر یو آل رائٹ۔" وہ ذرا سا اس پر جھکا پوچھ رہا تھا۔
بہت آہستگی سے اسے چھو کر واثق نے سیدھا کیا۔ اس کے ماتھے سے ذرا سا خون رس رہا تھا اور وہ بے ہوش

تھی۔ وہ کتنی دیر اسے غور سے دیکھتا رہا۔
اس کے پپوٹے بھی بے حرکت تھے۔ یہ اتنی سی چوٹ سے کیسے بے ہوش ہو سکتی ہے بھلا۔ وہ پریشان سا ہوا۔
"اے سنو۔ تم ٹھیک ہو۔" وہ اب اس کے پاس دو زانو ہو کر پوچھ رہا تھا' اسے ذرا سا ہلایا اور وہ اس کی طرف لڑھک گئی۔
"پری!" وہ پریشان ہو گیا۔
اس وقت عاصمہ اور وریہ اندر آ گئیں۔ اور دروازے پر ہی یہ منظر دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

عدیل نے الوداعی کلمات بولتے ہوئے فون بند کر دیا۔ عفت منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"آدھے گھنٹے میں وہ لوگ نکل رہے ہیں گھر سے۔ سات آٹھ لوگ ہوں گے ان کے ساتھ 'زیادہ تر تو فائزہ بھابھی کے رشتہ دار ہیں' ایک وقار کا بھائی اور اس کی بھابھی ہیں۔ یہاں سب انتظامات مکمل ہیں نا؟" وہ کچھ بے چینی سے لہجے میں بولا۔
آج عدیل نے آفس سے چھٹی لی تھی وہ سب کچھ اپنی نگرانی و موجودگی میں کروانا چاہتا تھا۔
عفت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ یہ سوال دوپہر کے بعد سے کئی بار پوچھ چکا تھا اور وہ تسلی بھرا جواب بھی دے چکی تھی' لیکن عدیل کے انداز سے لگتا وہ مطمئن نہیں ہو سکا تھا۔
"کچھ چاہیے تو نہیں اگر بازار سے کچھ منگوانا ہو تو؟" وہ عفت کو جاتے دیکھ کر پیچھے سے پوچھنے لگا۔
"عدیل! میں نے تقریباً" سولہ سترہ لوگوں کے لیے ڈنر اور شام کی چائے کا انتظام کیا ہے اگر وہ آٹھ دس لوگ آ رہے ہیں تو سب کچھ ٹھیک ہے' کافی ہے' میرے خیال میں پھر مزید کیا منگواؤں اور میں۔" آخر میں بولتے ہوئے وہ اس بے زاری پر اتر آئی جو اس کے لہجے کا خاصہ تھی۔
"ہوں ٹھیک ہے پھر تو میرے خیال میں۔" وہ اس کے لہجے سے کچھ خائف ہو کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ عفت نے مزید کچھ نہیں کہا اور باہر نکل گئی' مگر اسے دروازے کے پاس دو قدم پر ہی رکنا پڑا۔ عدیل کا فون پھر بجا تھا۔
شاید کچھ انہونا ہو جائے وہ لوگ نہیں آ رہے ہوں ان کا پروگرام کسی وجہ سے کینسل ہو گیا ہو۔
دل کی وہ کمینی سی خواہش جو عفت کو قدم بہ قدم پر بھٹکا رہی تھی۔ اس خواہش نے پھر سے اس کے قدم جکڑے تھے' مگر عدیل کال ریسیو کرنے کے بعد بہت مدھم لہجے میں بات کر رہا تھا' یہ چیز عفت کو کچھ اور متجسس کر گئی۔
اس نے دروازے کی اوٹ سے کان اندر کی جانب لگا دیے۔
"ہوں مکمل ہے سب کچھ... تم پریشان نہیں ہو' میرا دل اب کافی مطمئن ہے۔ مثال سے میری بات ہو چکی ہے وہ دل سے راضی ہے اس رشتے کے لیے' اور یہ میرا وہم تھا واقعی کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔"
وہ رک کر دوسری طرف یقیناً" بشریٰ ہو گی جس کی بات بہت دھیان سے سننے لگا تھا' عفت کے سینے پر جیسے سانپ لوٹنے لگے۔ ان کی عشق و عاشقی تو شاید مرتے دم تک تمام نہیں ہو گی۔
"منحوس دوسرے شوہر سے طلاق لے کر دوبارہ اس عدیل کے گھر میں کیوں نہیں آ تی اپنے مثال اور عدیل کے پاس۔" وہ جی میں جل کر وہ بات سوچنے لگی جس میں سراسر اس کا اپنا نقصان تھا۔

"نہیں پلیز' میں بات کر چکا ہوں مثال سے' اب تم بات کرو گی تو وہ پریشان ہو جائے گی۔ اسے لگے گا کہ ہم

دونوں اس پر اعتبار نہیں کر رہے۔ بشریٰ ہماری مثال واقعی میں ایک مثالی لڑکی ہے' بہت محبت کرنے والی' خیال رکھنے والی' صابر شاکر۔" اور عفت کو معلوم تھا مثال ایک ایسا ٹاپک ہے عدیل کے پاس جس پر وہ گھنٹوں بغیر تھکے بات کر سکتا ہے۔

"آج وہ ہم سے رخصت ہو رہی ہے تو مجھے یوں لگ رہا ہے میں بالکل اکیلا ہو جاؤں گا۔" وہ بہت آزردہ تھا۔

"ہم تو جیسے مر چکے ہیں نا' یا شاید پیدا ہی نہیں ہوئے۔" عدیل کے لہجے سے عفت نے جل کر سوچا اور دروازے کی اوٹ چھوڑ دی۔

اس جلن میں اور کتنا خود کو کھونا ہے' جو تقدیر نے اس کی قسمت میں شادی کے دن سے لکھ رکھا ہے۔

شادی والی رات ہی تو مثال اسے بری میں مل گئی تھی۔ اس نے پہلی رات بھی ایسے ہی جلتے کھولتے کڑھتے گزاری تھی اور پھر آنے والی بہت سی راتیں' جب عدیل اس کے پاس بیٹھا کبھی مثال کی باتیں کرتا اور کبھی مثال کے بہانے بشریٰ کے نام پر اٹک کر گھنٹوں کے لیے چپ سادھ لیتا تھا۔

"ہاں نہیں اللہ نے ان دو بیٹی کی قسمت کہاں' بیٹھ کر ایسی شاندار بنائی اور مجھ جیسی کر موں جلی کی کہاں۔۔ بیٹا پیدا کر کے بھی میں عدیل کے دل میں وہ جگہ نہیں بنا سکی' جو وہ بشریٰ اس مثال کو پیدا کر کے بنا چکی ہے۔"

"میرے بچے بھی تو۔۔۔ انہیں بھی مثال کی طرح باپ کو قابو کرنا نہیں آیا۔۔ دانی ایسا نکلے گا۔۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا' ورنہ صرف یہ دانی ہی باپ کی کمزوری ہوتا تو آج اس گھر میں حالات بہت مختلف ہوتے۔۔۔ میں مثال کے لیے نہیں پری کے لیے آنے والے مہمانوں کا بڑے جوش اور خوشی سے استقبال کر رہی ہوتی۔"

جانے کیوں اسے یہ رشتہ اپنی پری کے لیے چاہیے تھا۔

وقار اور فائزہ کو پہلی بار ملنے کے بعد سے یہ خیال اس کے دل میں گھر کر گیا تھا۔

"میری بیٹی میں بھلا کس چیز کی کمی تھی' آسمان سے اتری کوئی حور اور یہ مثال ہونہہ معلوم نہیں کیا دیکھا ان دونوں نے اس میں۔" وہ بڑبڑاتی کچن میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

مثال کاٹن کے گلابی کلر کے ہلکی شکنوں والے سوٹ میں پری جیسی تو نہیں لیکن پیاری لگ رہی تھی۔

اس کے چہرے اور آنکھوں میں جیسے کوئی بولتی چپ تھی' جو ٹھہر گئی تھی یونہی کچن کے دروازے پر پہنچ کر وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہ گئی۔ کتنا سوز ہے اس کے اس عام سے حسن میں!

وہ سوچ کر رہ گئی' مگر یہ سوز یہ کیسے آگیا اس کے چہرے پر' کیا اس نے کسی محبت میں محرومی جھیلی ہے۔

"مجھے کھانا ملے گا' یا نہیں میں نے دوبار کہلوا کر بھیجا ہے۔" دانی اندر آکر مخصوص تیز لہجے میں بولا۔

مثال کے چہرے پر بڑی پیاری مسکراہٹ ابھری تھی۔

"یہ دیکھو' میں نے اپنے پیارے بھیا کے لیے کتنی زبردست ٹرے سجائی ہے' پاشا بے گر' گرم پلاؤ' پالک پنیر' قورمہ' اور نان بھی۔۔ یہیں آجاؤ' یہیں شاباش میں ٹیبل پر رکھ رہی ہوں۔" وہ جو ٹرے میں کچھ برتن رکھ کر کھانا نکال رہی تھی فوراً بشاشت سے بولی۔

"نہیں' مجھے اپنے روم میں کھانا ہے' بھجوا دیں کسی کے ہاتھ۔" وہ اپنی مخصوص رکھائی سے کہہ کر جانے لگا۔

"دانی! یہیں کھالو نا میرے پاس بیٹھ کر' مجھے اچھا لگے گا اور پھر دیکھو' مجھے تو کچھ دنوں بعد یہاں سے چلے ہی جانا ہے' اگر تم مجھے کچھ ٹائم دو گے تو مجھے اچھا لگے گا۔" وہ لجاجت بھرے لہجے میں اس کا ہاتھ تھام کر کچھ ایسے بولی کہ

دانی فوری طور پر اس سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکا۔ متذبذب سا کھڑا رہ گیا۔ وہ اس کے ہاتھ پکڑے ٹیبل تک لے آئی۔ اور پھر خود جلدی جلدی سے ٹرے اور دوسرے برتن لا کر اس کے سامنے میز پر رکھنے لگی۔

"کیا لوگے؟ پہلے تمہاری پلیٹ میں کیا نکالوں؟" وہ جوش سے کہہ رہی تھی۔

"تھینکس میں لے لوں گا خود۔" وہ قدرے نرم پڑ گیا تھا۔

"میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں نا کچھ دیر کے لیے۔" وہ دونوں ہاتھوں کے کٹورے پر اپنا چہرہ سجا کر پیار سے بولی۔

دانی نے کچھ چونک کر اسے دیکھا جیسے اس کے چہرے پر اس التفات کی اصل وجہ تلاش کر رہا ہو۔

وہاں ایسا کچھ نہیں تھا جس کے بارے میں عفت نے ہمیشہ اسے اور پری کو خبردار رکھا تھا' وہ یونہی سر ہلا کر خاموشی سے کھانے لگا۔ مشال اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

"پتا ہے دانی! جب تم چھوٹے تھے تو میں تمہیں گود میں لے کر بہت پیار کرتی تھی' تم پیارے ہی بہت تھے۔" وہ دھیرے سے کہنے لگی۔

"اب پیار نہیں کرتیں یا میں پیارا نہیں رہا؟" وہ کچھ ناپسندیدہ لہجے میں بولا۔

"تم پیارے تو اب بھی بہت ہو اور میں تمہیں پیار بھی بہت کرتی ہوں' لیکن میں نے تمہارے لیے بہت سے خواب دیکھے تھے۔" وہ کچھ حسرت سے بولی۔

"مما اور پاپا جیسے' ہے نا؟" وہ تمسخر بھرے لہجے میں بولا۔

"خواب دیکھنے کی بیماری تو نہیں ہے۔ یہ تمہیں کہاں سے لگ گئی۔"

باہر کھڑی عفت نے اپنا وزن دوسرے پاؤں پر ڈالا۔

"خواب تو ہر کوئی دیکھتا ہے دانی! تم نے بھی دیکھے ہوں گے کیا سوچا ہے تم نے اپنے بارے میں۔" وہ بڑے طریقے سے اسے موضوع کی طرف گھیر کر لا رہی تھی۔ دانی کچھ ٹھٹکا۔

"کچھ نہیں ابھی۔" وہ سرد لہجے میں کہہ کر کھانے لگا۔

"بھائی بہنوں کا فخر ہوتے ہیں دانی! تم ابھی چھوٹے ہو' لیکن ماشاء اللہ سے تم سمجھ دار بہت ہو' تم چیزوں کو بہت اچھی طرح سے سمجھتے ہو۔ میری شادی ہونے والی ہے' چند سالوں میں بلکہ ایک دو سالوں میں پری کی بھی ہو جائے گی پھر ماما اور پاپا اکیلے رہ جائیں گے ان کے پاس صرف تم ہی تو ہو گے۔" دانی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ابھی تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں ان کی ضرورت ہے' لیکن دانی صرف دو تین سالوں میں انہیں تمہاری ضرورت ہوگی اس گھر کو تم نے بنانا اور چلانا ہے' پھر میں اور پری' ماما پاپا سے زیادہ تمہارے فون کا انتظار کریں گے کہ کب دانی ہمیں فون کرے گا کہ آپی میں آپ کو لینے کے لیے آ رہا ہوں' پلیز کچھ دن ہمارے ساتھ آ کر رہیں ایسا کوئی فون مجھے آئے گا نا دانی۔" وہ بہت یقین سے اس سے پوچھ رہی تھی' باہر کھڑی عفت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دانی کچھ نہیں بولا۔

"بتاؤ نا دانی! میں انتظار کروں تمہاری ایسی کسی کال کا؟" وہ اصرار بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"پتا نہیں۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ جانے کیسے بے بس ہوا تھا۔ کچھ لاچاری سے بولا۔

"دانی تمہارے یہ دن بہت قیمتی ہیں۔ تم بڑے ہو رہے ہو اگر اس وقت کو کھو دو گے تو وقت بھی تم سے ہاتھ چھڑا کر آگے نکل جائے گا۔ تم پیچھے رہ جاؤ گے۔ پتا نہیں تمہیں اس بات سے کوئی فرق پڑے یا نہیں' لیکن دانی ہم سب میں' ماما' پاپا' پری ہم اس تم سے بہت تکلیف محسوس کریں گے کہ ہمارا دانی زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے تم سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہی ہوں؟

دانی پلیز! ہم تمہیں سب سے آگے سب سے کامیاب رکھنا چاہتے ہیں۔ پاپا جو کچھ نہیں کر سکے۔ تم وہ کر کے

دکھاؤ اور تم کر سکتے ہو تم میں بہت انرجی ہے، بہت جذبہ ہے اور جذبہ سب کچھ کروا سکتا ہے۔ اگر تم نے کامیاب ہونے کا ارادہ کر لیا اس ارادے پر ڈٹ گئے تو پھر ضرور کامیاب ہو گے۔" وہ رک رک کر کہہ رہی تھی۔

دانی بہت آہستہ آہستہ کھانا کھا رہا تھا۔ وہ مثال کی باتیں سن رہا تھا یا نہیں، لیکن کچھ سوچ ضرور رہا تھا۔

"ہم سب تمہیں بہت کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں دانی! ماما تم سے بہت محبت کرتی ہیں ہم سب سے زیادہ وہ صرف تم سے محبت کرتی ہیں۔ بیٹے ماؤں کی کمزوری ہوتے ہیں۔ پلیز تم انہیں مایوس نہیں کرنا۔"

اور عفت کا جی چاہا وہ وہیں کھڑے ہو کر دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ وہ اس لڑکی کو عمر بھر کیا سمجھتی رہی اور وہ جس طرح کی باتیں کر رہی تھی، یہ تو دل کی بہت اچھی ہے۔ عفت پر جیسے انکشاف ہوا تھا۔

"تم سوچو گے دانی! میری باتوں کو؟" وہ اس کو اٹھ کر جاتا دیکھ کر تیکھے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہوں!" وہ مختصراً کہہ کر باہر نکل گیا مثال اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

وردہ پری کو سہارا دے کر گھر کے اندر لائی تو باہر کی طرف آتا عدیل بے اختیار ٹھٹکا تھا۔

پری کے ماتھے پر چھوٹی سی بینڈیج تھی اور چہرے پر نقاہت سی!

"کیا ہوا ہے تمہیں پری! تم ٹھیک ہو کہاں تھیں تم؟" وہ کچھ بے چین کچھ خفا لہجے میں آگے بڑھ کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"سوری انکل! یہ میرے گھر آئی تھی۔ ہمیں کچھ نوٹس ایکسچینج کرنے تھے کہ گھر آتے ہوئے اسے چکر سا آیا اور یہ گر گئی تو اس کے یہ چوٹ سی لگی ہے۔ بٹ تھینکس گاڈ ڈاکٹر نے کہا ہے صرف ویک نیس کی وجہ سے یہ گر گئی تھی۔" وردہ کچھ رک رک کر بتا رہی تھی عدیل پری کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

اس کے ہاتھ پکڑ کر نرم سے انداز میں اسے اندر لے جانے لگا۔

"اگر طبیعت زیادہ خراب ہے پری! تو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔ کیا فیل ہو... رہا ہے؟" وہ فکر مند تھا۔

"پاپا! میں ٹھیک ہوں بالکل۔ کچھ دیر ریسٹ کروں گی تو کافی بہتر ہو جاؤں گی۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔" وہ باپ سے نظریں چرا کر مدھم لہجے میں بولی۔

"چلو پھر تم اندر جا کر آرام کرو۔ مثال! اسے اندر لے جاؤ یہ ریسٹ کرے گی۔" سامنے سے آتی مثال کو دیکھ کر عدیل نے کہا۔

مثال وردہ کو دیکھ کر ٹھٹکی، جو کچھ آکورڈ سا محسوس کرتے ہوئے اب مڑ کر واپس جانے لگی تھی۔

"وردہ پلیز تم آجاؤ میرے ساتھ میرے روم میں۔" پری نے اسے مڑ کر پکارا تھا۔ وہ عدیل کی طرف دیکھنے لگی۔

"نہیں پری! شام زیادہ ہو گئی ہے، مجھے اب گھر جانا ہے میری امی انتظار کر رہی ہیں تم ریسٹ کرو، میں فون پر تمہاری خیریت پوچھ لوں گی۔" وہ کہہ کر جانے لگی۔

"کچھ دیر بعد چلی جانا۔ ابھی آجاؤ۔" پری کے لہجے میں اصرار تھا۔

"وردہ! اگر پری چاہ رہی ہے تو تم پلیز آجاؤ۔ تھوڑی دیر بعد چلی جانا۔" مثال نے بھی اسے روکا۔

"پاپا! انہیں چھوڑ آئیں گے تھوڑی دیر بعد۔" پری نے جیسے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! آپ جاؤ ابھی پری کے ساتھ میں آپ کو کچھ دیر میں بھجوا دوں گا آپ کے گھر، ڈونٹ وری۔"

بیٹی کی خواہش پر عدیل نے بھی اسے تسلی دی، وہ کچھ تذبذب سی کھڑی رہی پھر سر ہلا کر پری کے ساتھ اندر کی طرف

بڑھ گئی۔ عدیل کے چہرے پر سوچ تھی' وہ اندر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"بخدا امی! ایسا کچھ بھی نہیں ہے وہ بالکل ایک پاگل لڑکی ہے۔" واثق ماں سے نظریں چُراتے ہوئے کوفت سے کہہ رہا تھا۔

"مگر اس کی حالت واثق۔۔۔" عاصمہ کے لہجے میں عجیب شک سا تھا۔ واثق بے اختیار ٹھٹکا۔

"آپ۔۔۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں۔ امی کیا میں آپ کو اس ٹائپ کا لگتا ہوں کہ۔" وہ بولتے ہوئے رک گیا اس سے آگے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔

عاصمہ کے لہجے نے اسے دکھ دیا تھا۔

"صرف میں نہیں واثق! اس طرح گھر میں کوئی بھی داخل ہوتا اور وہ جیسے فرش پر پڑی تھی۔" عاصمہ بولتے بولتے ایک دم سے سر جھٹک کر خاموش ہو گئی۔

"اور تم کہہ رہے ہو وہ پاگل ہے۔ کیوں کس کے لیے؟" عاصمہ آگے سے بولی تو واثق کو بہت برا لگا۔

"ایک منٹ امی! آپ کے دل میں جو بھی بات ہے' وہ آپ مجھ سے چاہتے ہوئے بھی کہہ نہیں پا رہیں' پلیز وہ کہہ ڈالیں مجھ سے یوں الجھے الجھے انداز میں بات نہیں کریں پلیز۔" وہ دو ٹوک لہجے میں ماں سے بولا۔ اس کی عادت ہی ایسی تھی وہ الجھنوں سے' ابہام سے' شک سے دور بھاگتا تھا۔

"وہ کیوں آئی تھی یہاں؟" عاصمہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"مجھے کیا معلوم' وہ کیوں آئی تھی۔ میں نے جب اسے دیکھا تو وہ ۔۔۔ اندر آچکی تھی دروازہ کھلا تھا مجھے معلوم نہیں تھا۔ ورنہ وہ کا پوچھنے گئی میں نے بتا دیا۔ میں نے ہی اسے جانے کے لیے کہا جبکہ وہ۔۔۔" وہ بولتے ہوئے رک گیا۔

"کیا وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔" عاصمہ نے اس کا ادھورا جملہ جیسے پورا کیا۔

"میں اسے یہاں رکنے سے منع کر رہا تھا۔ یہ مناسب بات نہیں تھی مگر وہ رکنا چاہ رہی تھی۔" واثق کچھ مجرمانہ انداز میں اعتراف کر رہا تھا۔ عاصمہ کو لگا۔ کچھ اچھا نہیں ہوا ہو گا۔ دونوں کے درمیان کچھ ایسی بات ضرور ہوئی ہے جو غلط تھی۔

"میں نے اسے منع کیا اور یہاں سے چپ چاپ جانے کو کہا باہر جاتے ہوئے اسے چکر آیا اور وہ دروازے سے ٹکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی میں اسے ہوش میں لانے کے لیے پکار رہا تھا' جب آپ اور روحہ گھر میں داخل ہوئے تو۔" کبھی زندگی میں ایسا موقع نہیں آیا تھا کہ واثق کو یوں اپنے لیے صفائی دینا پڑی ہو۔

مگر آج اسے یہ بھی کرنا پڑ رہا تھا۔

"اور امی! میں نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ اسے یوں اکیلے گھر میں نہیں آنا چاہیے۔ ٹھیک طریقہ یہی ہے کہ آدمی فون کرے کسی کے بھی گھر جانے سے پہلے کہ جس سے وہ ملنے جا رہا ہے وہ شخص گھر میں موجود بھی ہے یا نہیں۔" وہ کوفت سے کہہ رہا تھا۔

عاصمہ کچھ نہیں بولی۔

"میں دیکھوں روحہ ابھی تک نہیں آئی۔ میں نے کہا بھی تھا کہ میں ساتھ چلتا ہوں۔" وہ جھلا کر باہر جانے لگا۔

"واثق!" عاصمہ نے اسے پیچھے سے پکارا۔ "تم نے سارہ کے بارے میں کیا سوچا؟ سعدیہ کا فون آیا تھا۔ وہ کل ہماری طرف آ رہی ہے۔ سارہ بھی ساتھ میں ہو گی تم بھی مل لینا اس سے' اور میں چاہتی ہوں یہ معاملہ بس اب

نپٹ جائے ورنہ تو۔" آخری الفاظ وہ منہ میں بڑبڑائی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ کس وجہ سے جلد سے جلد یہ معاملہ نپٹانا چاہ رہی ہیں آپ کیا خوف ہے آپ کو؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"میں کسی کے زبردستی مجبور کرنے پر تو اپنی زندگی کا فیصلہ کروں گا نہیں' جو کوئی کچھ بھی سمجھتا ہے' سمجھتا رہے' آئی ڈونٹ کیئر مجھے کسی سے نہیں ملنا۔" وہ تیز تیز بولتا باہر نکل گیا عاصمہ سر پکڑ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وردہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کا منہ لحظہ بھر کے لیے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پری اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

"تمہیں لگ رہا ہے' میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" پری اسی طرح نظریں جمائے ہوئے پُراعتماد لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

وردہ صرف ہلکا سا نفی میں سر ہی ہلا سکی۔

"میں نے کچھ نہیں کہا تھا صرف پسندیدگی کا اظہار اور میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کا کچھ اور مطلب نکالیں گے اور مجھے۔۔۔" ادھوری بات کے ختم ہونے سے پہلے وہ بے آواز آنسوؤں سے رو پڑی۔

اس کی نیلگوں ہلکورے لیتی آنکھوں سے گرتے موتیوں نے وردہ کے دل کی دنیا ہی بے سکون کردی۔

"پلیز۔۔۔ پلیز یوں مت رو پلیز پری۔۔۔ میں بات کرتی ہوں جا کر بھائی سے پوچھتی ہوں ان سے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اپنی امی کو بتاتی ہوں کہ انہوں نے یہ کیسی حرکت کر ڈالی ہے۔" وردہ سخت جذباتی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

پری نے بے اختیار وردہ کے ہونٹوں پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں پلیز' تم کسی سے کچھ نہیں کہوگی۔ کچھ نہیں بولوگی۔ پہلے وعدہ کرو مجھ سے۔" وردہ اس کی اس فرمائش پر کچھ حیران سی رہ گئی۔

"پری۔۔۔ لیکن۔" وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی۔

پری نے آنکھوں میں آنسو لیے شدت سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پلیز نہیں' تم اس بات کو سمجھ سکتی ہو تم بھی لڑکی ہو۔ تم جانتی ہو۔ اس طرح کی بات اگر کسی لڑکی کے ساتھ لگ جائے تو اس کی پوری زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔" وہ شدید خوف زدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اور وردہ کا جی چاہ رہا تھا۔ زمین پھٹے اور وہ اس میں غرق ہو جائے اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کا بھائی کچھ ایسا ویسا بھی کر سکتا ہے۔

وہ بس گم صم سی پری کو دیکھے جا رہی تھی۔

"میں نے تمہیں اس لیے روکا کہ میں خود کو سنبھالنا چاہ رہی تھی' اگر میں یہ بات کسی سے نہ کرتی وردہ' تو یقین کرو' میرا دل پھٹ جاتا اور اگر میں یہ بات کسی اور سے کردیتی میرے ماما' پپا کو پتا چل جاتا۔ یا میری اسٹیپ سسٹر مثال کو' تمہیں نہیں پتا' وہ کتنی گھنیا' کتنی کمینی ہے۔ اس نے سارے خاندان میں فون کرکے سب کو بتا دینا تھا' وہ بہت خطرناک ہے اور مجھ سے تو اس کو خاص نفرت ہے کیونکہ وہ میرے جیسی حسین نہیں اور اسی وجہ سے وہ مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ پلیز تم سمجھ رہی ہو ناں' میری زندگی کا دارومدار تم پر ہے میری اچھی دوست۔" وہ اٹھ کر اس کے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

اور وہ تو جیسے پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو گئی تھی اس کے اندر غم و غصے کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
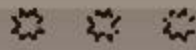
"یہ کپڑے تم نے پہنے نہیں ابھی تک میں نے بھجوائے تھے سلیمہ کے ہاتھوں وہ لوگ آنے والے ہیں مثال ابھی تم نے تیار بھی ہونا ہے۔" عفت کمرے میں آگرا سے یونہی بیٹھے دیکھ کر کچھ خفا لہجے میں ناراض ہونے لگی۔ مثال کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"یہ پری کہاں رہ گئی ہے نمو دیل مجھے کہہ رہے تھے وہ اپنی سہیلی کے گھر سے آچکی ہے تو اب کہاں ہے کم از کم آ کر تمہیں تیار تو کردے اسے میک اپ کرنے کا اچھا ڈھنگ ہے' میں بھیجتی ہوں اسے۔" وہ کہہ کر جانے لگی مثال اسی طرح بیٹھی تھی۔

عفت جاتے ہوئے کچھ سوچ کر رکی۔

"کیا بات ہے مثال! تم اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ کوئی بات ہوئی ہے؟" ابھی کچھ دیر پہلے جو کچھ اس نے دانی کے ساتھ مثال کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے عفت کے دل میں مثال کی قدر بڑھادی تھی اگر دانی مثال کی وجہ سے کچھ بہتر ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خود اب مثال سے کہے گی کہ وہ دانی کو کچھ وقت دے۔

"نہیں کچھ نہیں ماما۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ جیسے خود کو کمپوز کرتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

عفت اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری فیلنگز کو مثال! اس وقت ایک لڑکی کو جتنی ایک ماں کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی وقت میں نہیں ہوتی۔"

وہ کہتے ہوئے آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"میں واقعی اتنی اچھی نہیں ہوں کہ تمہاری ماں کی جگہ لے سکوں' حالانکہ میں کوشش کرتی ہوں کہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک کروں اپنے بچوں جیسا نہ سہی لیکن کچھ بہتر لیکن مثال یقین کرو میں اس معاملے میں خود کو بے بس محسوس کرتی ہوں معلوم نہیں اللہ نے عورت کے دل میں اتنی وسعت کیوں نہیں دی کہ وہ دوسری عورت کو یا اس کی اولاد کو بخوشی قبول کرسکے اور جو عورتیں ایسا کرتی ہیں وہ بہت عظیم ہوتی ہیں۔ میں ایسی عظیم نہیں۔"

اس کے لہجے میں ملال تھا۔ تاسف اور کوئی گہری کیفیت جیسے وہ یہ سب مثال سے نہیں پری سے کہہ رہی ہو۔

"ماما! آپ بہت اچھی ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں اور آپ کا دل بھی بہت بڑا ہے" آپ نے مجھے قبول کیا ہے۔ میں اس کی گواہ ہوں۔ آپ نے مجھے اپنے گھر میں جگہ دی ہے' مجھے بہت کچھ سکھایا اور ماما یہی محبت ہوتی ہے جو ایک ماں' ذمے دار ماں اپنی بیٹی کو دیتی ہے" آپ نے بہت اچھے طریقے سے میری تربیت کی ہے۔ آئی رئیلی تھینک فل ٹو یو ماما۔" وہ اٹھ کر اس کے گلے لگ گئی۔

"مثال، میری بیٹی! اللہ تمہیں اپنی زندگی میں بہت خوش و خرم رکھے میں اتنی اچھی نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں لیکن تم نے میرا مان رکھا۔" وہ اسے پیار کرکے بولی۔

اور مثال کو پہلی بار عفت کا پیار پا کر بہت عجیب بہت اچھا سا لگ رہا تھا کہ بہت سال ہوئے بشریٰ نے بھی اسے کبھی اس طرح سے پیار نہیں کیا تھا۔

اس کے پیار میں بھی ایک خوف ایک ڈر ہوتا تھا کہ کہیں احسن کمال یا سیفی دیکھ نہ لیں کہ وہ مثال کو پیار کررہی ہے۔

"اور میں تمہارے لیے دل سے دعا کروں گی کہ جیسی اچھی تم خود ہو ویسی تمہیں سسرال ملے۔ تم بہت خوش

رہو اور مثال! کوشش کرنا عدیل کو اب تمہاری طرف سے کوئی دکھ نہیں ملے۔" اس نے آخر میں جو بات کی مثال لمحہ بھر کو سن سی رہ گئی۔

اس نے دانستہ طور پر تو کبھی اپنے باپ کو غم زدہ نہیں کیا تھا۔

"وہ پہلے ہی بہت دکھ جھیل چکے ہیں، پہلے تمہاری ماں کی وجہ سے شاید تمہیں برا لگے مگر یہ حقیقت ہے مثال! اور تم سمجھ دار ہو تم سسرال میں اچھی زندگی گزار کر اپنے باپ کو خوشیاں دو گی۔ تم سمجھ رہی ہو ناں انہیں کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے تمہاری طرف سے۔" اور مثال سر جھکا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

فائزہ نے اسے اپنے بہت قریب کر کے بٹھایا ہوا تھا کہ فائزہ کے قیمتی لباس سے اٹھتی دل فریب مہک جیسے مثال کے اپنے وجود سے پھوٹنے لگی تھی۔

اس کی گریس فل سا اسے بہت اعتماد سے ساتھ لگائے کسی ماں کی طرح جیسے سمیٹے ہوئے اسے پیار کر رہی تھی مثال اس کی محبت کے بوجھ سے کچھ اور جھکی جا رہی تھی۔

وقار اور فائزہ کے رشتہ دار خواتین مرد سبھی کا تعلق بہت اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا پری خوب تیار ہو کر کسی پری کی طرح سب کے بیچ میں چہکتی پھر رہی تھی۔

عفت اسے فخریہ نظروں سے دیکھ رہی تھی کیونکہ مہمان خواتین میں سے دو تین نے پری میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔

اور عفت کو یقین ہو چلا تھا کہ چند ہی دنوں میں پری کا بھی کہیں بہت اچھا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

عفت کی اپنی شادی بہت دیر میں ہوئی تھی، جب اس کے چچا کو اس کی شادی کی امید بھی ختم ہو چکی تھی، عدیل کا رشتہ کسی نعمت سے کم نہیں تھا ان کے لیے۔ اسی وقت عفت نے ذہن میں سوچ لیا تھا کہ اگر اس کی بیٹی ہوئی تو وہ اس کی اوائل عمری میں ہی شادی کر دے گی، پہلے اچھے رشتے پر ہاں بول دے گی اور اب اسے اپنے دل کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"وقار یار! دس دن تو بہت کم ہیں کیوں عفت! کم سے کم پچیس تاریخ تو ہو یا بیس دن ٹھیک رہیں گے۔" عدیل وقار کی بات پر بولا۔

"پرسوں فہد آ رہا ہے اس کی کل کی فلائٹ میں سیٹ چانس پر ہے مگر پرسوں کی کنفرم ہے۔ وہ یہاں صرف بیس دنوں کے لیے آ رہا ہے شادی کے بعد صرف آٹھ نو دن بچیں گے۔ مثال اور فہد کے پاس ہنی مون کے لیے۔ حالانکہ میں تو چاہ رہی تھی آپ ہمیں اسی مہینے کی کوئی تاریخ دے دیں۔" فائزہ کی بات پر عدیل نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں نہیں بھابھی! اس ہفتے تو نہیں۔" وہ فوراً بولا۔

"تو چلو پھر بارہ تاریخ کو جمعہ بھی ہے اور کچھ وقت تیاری کو بھی مل رہا ہے اس پر ڈن کرتے ہیں۔" وقار محبت سے بولا۔

عدیل نے کچھ بے بسی سے عفت کی طرف دیکھا جو ہاں کرنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

"چلیں بھابھی! جیسے آپ لوگوں کی خوشی۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" عدیل نے مسکرا کر کہا۔

"تھینک یو عدیل بھائی! ہمیں آپ کے گھر سے صرف مثال بیٹی چاہیے اور کچھ بھی نہیں۔" فائزہ مثال کو پیار کرتے ہوئے بولی۔

وہ جب کمرے میں آئی تو بشریٰ کا فون بج بج کر خاموش ہو چکا تھا۔ مشال نے بھاری دوپٹہ سر سے اتار کر ایک طرف رکھا۔

"تو ماما کو میرا اتنا خیال تو ہے کہ وہ اپنے گھر میں جہاں اس وقت گہری رات ہو گی۔ اپنے شوہر سے چھپ کر مجھے کال کر رہی ہیں۔" وہ فون ہاتھ میں لیے سوچنے لگی۔

"اور واثق کیا اسے بھی میرا خیال آیا ہو گا۔" وہ یونہی سوچنے لگی۔

"لیکن میں اس کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں مجھے اب واثق کو بھولنا ہو گا۔" اس نے خود کو جھڑکتے ہوئے غیر ارادی طور پر کال لوگ میں دیکھنا شروع کر دیا۔

بشریٰ کے فون سے پہلے واثق کی مسڈ کالز تھیں مشال کا دل بے اختیار دھڑکا۔ وہ اس سے غافل نہیں تھا لیکن اس کی یہ پروا مشال کو مشکلات میں بھی ڈال سکتی ہے۔

اس نے کتنی بار سوچا تھا کہ وہ واثق کا نمبر ڈیلیٹ (Delete) کر دے مگر پھر ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ رک سے جاتے۔

"میں شادی کی رات ضرور کروں گی" دل کی فرمائش پر اس نے آہستگی سے خود کو تسلی دی۔

بشریٰ کی کال پھر آ رہی تھی اس نے گہرا سانس لے کر کال ریسیو کرلی۔

❋ ❋ ❋
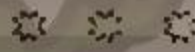
"عفت دس دن بہت کم ہیں یار تیاری کے لیے" عدیل کے چہرے پر بہت دنوں بعد عفت نے سکون اور گہرا اطمینان سا دیکھا تھا "اور دس دنوں میں تو کوئی اچھا ہوٹل بک کروانا بھی مشکل ہو گا۔" اسے دوسرا خیال آیا۔

"اوہو کچھ نہیں ہو گا کہتے ہیں بیٹیوں کے کاموں میں اللہ خود مددگار ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ آپ دیکھیے گا سب کچھ بہت بہترین طریقے سے ہو جائے گا اور آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا جیسے آج کا فنکشن ٹھیک ہو گیا بالکل جبکہ آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے تھے۔" عفت نے اسے جیسے یاد کرایا۔

"ہوں ٹھیک کہا تم نے واقعی میں کچھ پریشان تھا۔ مشال کا پہلا کام ہے نا تو شاید اس لیے... بس میری بچی بہت خوش رہے، بہت زیادہ میرے دل میں اس کے لیے اب صرف دعا ہے۔ عفت! میری مشال نے بہت دکھ دیکھے ہیں بچپن کی معصوم محرومیاں جو گہرے عمر بن جاتی ہیں، پھر بھی اس نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا نہ مجھ سے نہ بشریٰ سے بہت صبر کرنے والی بچی ہے، مجھے یقین ہے اس کی اگلی زندگی بہت اچھی ہو گی۔"

وہ مشال کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح بھول چکا تھا کہ وہ یہ جذباتی باتیں کرتے ہوئے عفت کے جذبات کو ٹھیس پہنچ رہا ہے عفت بالکل خاموش تھی۔

❋ ❋ ❋
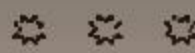
اور پھر دن تو جیسے پر لگا کر اڑنے لگے۔ فہد کی فلائٹ تیسرے دن کی رات کو تھی۔

عفت اور عدیل اسے ایئرپورٹ پر لینے گئے تھے۔

دونوں ہی بہت خوش واپس آئے تھے یقیناً "فہد ہی ایسا لڑکا تھا جو مشال کے قابل ہو سکتا تھا۔

اتنا ہینڈسم، وجیہہ، سنجیدہ، بردبار سا فہد عدیل کو دل سے پسند آیا تھا عفت اب کی بار صرف رشک کر سکی تھی۔

مشال اب اس گھر سے جانے والی تھی شاید اس لیے اس کے خیالات مشال کے لیے کافی حد تک بدل چکے تھے۔

پھر مشال نے اب دلی کو خود بخود عفت کے کہے کے بغیر ہی بہت وقت دینا شروع کر دیا تھا۔

وہ اکثر اب مشال سے اردگرد منڈلاتا نظر آتا تھا۔ گھر میں بھی وقت دینے لگا تھا۔ اس کا دوسرے اسکول میں

ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ اس نے کوئی بھی اعتراض کیے بغیر اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔
عفت اور عدیل کو لگ رہا تھا اس نے خود کو سدھار لیا ہے۔ وہ اب اچھا خاصا سمجھ دار لگ رہا تھا۔
عفت مثال کے اس کردار سے خوش تھی اور فہد کو دیکھ کر اس کو بھی خوشی ہی ہوئی۔

٭ ٭ ٭

"آپ دیکھیں تو کتنی زبردست Pics ہیں فہد بھائی کی۔" دانی عفت اور عدیل کے ساتھ فہد سے ملاقات کر کے آیا تھا اور اپنے موبائل میں کچھ تصویریں بھی اس کی لے کر آیا تھا۔
"یہ Pics ہیں۔ آپ کو بھیج رہا ہوں تنہائی میں دیکھیے گا بہت ہینڈسم ہیں فہد بھائی!" وہ شرارت سے بولا۔
مثال صرف مسکرا دی۔
وہ عفت کے ساتھ صرف دو تین بار ہی بازار گئی تھی۔ یہ بہت تھکا دینے والا کام تھا۔ اس نے عفت کو منع کر دیا کہ وہ اب سب کچھ خود خرید لے گی۔ دانی کا نیا اسکول ہے سلیبس بھی مختلف ہے میں اسے کچھ ٹائم دے رہی ہوں۔ یہاں آپ کے ساتھ اتنی شاپنگ کے لیے تو اس کا بہت حرج ہوتا ہے۔" اور عفت کو بھلا اور کیا چاہیے تھا۔
وہ مثال کی شادی کے شاپنگ کے بہانے ہر چیز ڈبل خرید رہی تھی' پری کی بھی شادی کی ابتدائی شاپنگ تو وہ کر ہی چکی تھی۔
عدیل مثال کی شادی پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا اور عفت اس سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔
"کل کھانے پر بلایا ہے میں نے فہد کو۔ فائزہ اور وقار کے ساتھ اس کی دعوت بھی ہو جائے گی اور میں چاہتا ہوں مثال اور فہد ایک دوسرے سے مل بھی لیں۔" عدیل نے رات کے کھانے پر اعلان کیا۔
"اچھا کیا آپ نے" عفت آج کل ہر طرح سے عدیل کی ہمنوا بنی ہوئی تھی فوراً" تائید کرتے ہوئے بولی۔
"پاپا! چھ دن تو رہ گئے ہیں شادی میں اب بھلا آپی کیا کریں گی فہد صاحب کو دیکھ کر۔ نہ ہاں' نہ ناں۔" پری مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسی۔
عدیل اور عفت نے اسے تیز نظروں سے دیکھا تو وہ سر جھکا کر کھانا کھانے لگی مثال تو پہلے ہی سر جھکا کر بیٹھی تھی۔

٭ ٭ ٭
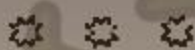
"وردہ کیا کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو۔" عاصمہ کچھ سخت لہجے میں بولی' وہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ وردہ کچھ پریشان سی عاصمہ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پا رہی۔ آج عاصمہ نے اس کو پاس بٹھا کر پوچھ ہی لیا تو وہ سرسری بات کر کے خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔
عاصمہ کچھ چونک سی گئی۔
"میں نہیں کہہ سکتی مما! بات کچھ ایسی ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تو زبان پر کیسے لاؤں۔" وردہ نظریں جھکا کر بولتے سے بولی۔ عاصمہ جیسے شک میں آ گئی۔ تو گویا بات بہت سیریس ہے۔
"اب تمہیں مجھے صاف بتانا ہوگا کیا بات ہے۔" وہ اس کا رخ اپنی طرف کرتے سختی سے بولی' وردہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"مما... واثق بھائی نے پری کے ساتھ بہت برا کیا ہے" اور عاصمہ ششدر سی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

قرۃ العین خرم ہاشمی

صدرا ہووے بوہے
دے میں تیرے لیے کھولے
ہو میں نہ تو کدی آنکھیاں توا وے
تیرے نال ترنا تیرے نال ڈبنا
تیرے نال جینا تیرے نال مرنا
پیار میرا تو تکڑی تے تول نا
اک دل سی رہا میرے کول نا
دے میں لٹی گئی
ڈھولنا' دے میں لٹی گئی

ہوا کے دوش پہ لہرائی' چاندی رات کے فسوں میں ڈوبی دل کو چھوتی آواز پہ' اماں نے کروٹ لی اور چت لیٹ کر' دور آسمان پہ چمکتے ستاروں کو دیکھنے لگی۔ اوپر چھت سے آتی آواز بہت واضح تھی۔

لائیاں لائیاں میں تیرے نال ڈھولنا
اک دل سی رہا میرے کول ناں
دے میں لٹی گئی ڈھولنا۔۔۔

"ہک ہاہ! اپنی آواز کے جادو میں باندھ رہی ہے میرے پتر کو۔"

اماں نے چاندنی رات کے فسوں اور اس کی آواز کے سحر سے نکلتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔ ہر ماں کی طرح اسے بھی اپنا بیٹا بہت معصوم اور سیدھا سادہ سا لگتا تھا۔

"سب شروع شروع کے چاہ ہوتے ہیں' جب تک مرد کو توجہ اور محبت ملتی رہے۔ وہ اسی طرح کچی ڈور سے بندھا کھنچا چلا آتا ہے اور عورت بے چاری یہ سمجھتی رہتی ہے کہ وہ اس کی محبت میں کھنچا چلا آتا ہے۔ بھلا مرد نے اپنے آپ سے زیادہ بھی کبھی کسی کو چاہا ہے؟"

اماں کی سوچوں پہ سالوں پہلے کی تھکن طاری ہونے لگی تھی۔ ماضی کے ادھ کھلے دروازے میں سے بہت سی پرچھائیاں سامنے آکر کبھی چھپ رہی تھیں' کبھی ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔ اسی لیے جب "عورت" بن کر سوچا تو بیٹا بھی "مرد" نظر آیا اور مرد کی فطرت کے سب رنگوں سے واقف تھی وہ۔ مگر یہ کیفیت تھوڑی دیر ہی رہی۔ دوبارہ سے اپنی جون میں واپس آتے ہوئے وہ اب ساس بن کر سوچتی اپنی بہو کی چالاکیوں پہ کڑھ رہی تھی۔

"میسنی' گھنی! جادو گرنی! ابھی شادی کو دو ماہ ہی ہوئے ہیں' پہلے میرا پتر مہینے میں ایک بار پنڈ آتا تھا اور اب ہر ہفتے دوڑا چلا آتا ہے۔ ضرور تعویذ کیے ہوں گے۔" اماں نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ لی تھی اور چادر سر تک تان کر سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ جبکہ چھت کے اوپر ٹہلتے ہوئے ہونٹوں پہ شرمیلی مسکراہٹ لیے دوپٹہ کا کونا انگلیوں پہ لپیٹتے وہ گنگنا رہی تھی اور اس کے قدم سے قدم ملاتا چاندنی رات کے جادو میں کھویا' اس کے چہرے کو چھوتی شریر لٹوں کو دیکھتا' وہ دھیرے سے مسکرا رہا تھا۔ جو خود میں مگن گنگنا رہی تھی۔

تو جو چھو لے پیار سے
آرام سے مر جاؤں
آجا چندا' باہنوں میں
تجھ میں ہی گم ہو جاؤں میں
تیرے نام پہ کھو جاؤں میں
سیاں۔۔۔
"شرم ہی مک گئی ہے آج کل کی لڑکیوں میں۔"

اماں نے گانے کے آخری بولوں پہ استغفار پڑھتے ہوئے حسب عادت بہو کو سراہا تھا۔ جو ہر چیز سے بے پروا اپنی محبت کے سنگ ہوائیں اڑ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اماں! میں بانو کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔"

اختر نے آستین کے بٹن بند کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں صحن میں آکر کہا تھا۔ اماں جو چارہ اٹھائے جانوروں کے باڑے کی طرف جا رہی تھی۔ ایک دم سے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

"اچھا۔ اسی لیے صبح سے کمرے میں گھسی ہوئی

ہے میسنی۔"

اماں نے بانو کو تصور میں سامان باندھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اماں کے ہاتھوں سے چارہ چھوٹا اور قدموں کے پاس ڈھیر ہو گیا اور اماں بھی وہاں ہی بیٹھ کر سر پہ ہاتھ رکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

"ہائے وے لوکو' دیکھو کیسے میرا کوں اک' (اکلوتا) معصوم پتر چھین لیا۔ اس گھنی میسنی' جادوگرنی نے۔ کالی ناگن جیسی زلفوں کا جادو ہی کم نہیں تھا۔ اوپر سے میٹھی آواز میں گانے سنا سنا کر مت ماری ہے میرے پتر کی جو اس بڑھاپے میں بوڑھی ماں کو اکیلا چھوڑ کر بیوی کو لے کر ہمیشہ کے لیے شہر جا رہا ہے۔"

"اف اماں! کیا رولا ڈال رہی ہو۔ میں بانو کو شہر دکھانے لے جا رہا ہوں۔ دو دن کے لیے ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہی وہ۔ اب بس بھی کرو یہ رونا دھونا۔ کیا سارا پنڈ اکٹھا کرو گی۔"

اختر نے جھنجلاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ غصے کا تیز تو تھا ہی' کچھ اماں کے بے جا لاڈ پیار نے مزید ضدی اور خودسر بنا دیا تھا۔ فطرتاً" جلد باز' اپنی کہنے اور کرنے والا۔ اس لیے ابھی بھی اماں سے اجازت لینے کے بجائے مطلع کرنا ہی کافی سمجھا تھا۔ اماں بھی اس سے دبتی تھی۔ ابھی بھی اختر کی تیوری چڑھی دیکھ کر اور دو دن کا سن کر اس کو کچھ تسلی ملی تو اماں ایک دم سے چپ کر گئی۔ پھر لہجے میں نرمی سمو کر بولی۔

"میں تو تیرے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔ شہر کی ہوا لگتے ہی اچھی بھلی زنانیوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں اور تیری وہٹی تو ویسے بھی ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتی' شہر جا کر تو اور دماغ آسمان پہ چڑھ جائے گا۔"

اماں نے ہاتھوں سے بکھرا ہوا چارہ سمیٹتے ہوئے کن انکھیوں سے سفید کلف لگے سوٹ میں تیار کھڑے اختر کو دیکھا تھا۔ جو واپس پلٹتا ہوا ایک دم رک گیا تھا۔

"اماں! فکر مت کر' مجھے آتا ہے' اپنی وہٹی کو سیدھا کرنا۔ ابھی تو جانے دے' پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔"

اختر نے جلدی سے کہا اور بانو کو آواز دینے لگا۔

"آئی جی۔" اندر سے۔ جھٹ پٹ سرخ جوڑے میں تیار' بنی سنوری' ہونٹوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ اور کاجل بھری آنکھوں میں چمک لیے' پراندے کو جھلاتی' بانو کو آتا دیکھ کر اماں کا منہ ایسے بن گیا جیسے دانتوں تلے کڑوا بادام آ گیا ہو۔

"وے جھلیا' اس شوخی کو شہر لے جا کر اتنا خرچا کرنے کی کیا لوڑ (ضرورت) ہے۔ خود تو۔ تو اپنے یار دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس باندری کو کہاں رکھے گا دو دن۔"

اماں کے "باندری" کہنے پہ بانو سلگ کر رہ گئی تھی۔ مگر اختر کے سامنے اماں کو جواب دے کر وہ کوئی تماشا نہیں لگانا چاہتی تھی۔ اس لیے منہ بنا کر رہ گئی تھی۔ جبکہ اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح ہنستی مسکراتی' سجی سنوری بانو کو روک لیں۔ ہر ساس کی طرح' اماں کو بھی بہو گندے میلے میں گدھوں کی طرح دن رات کام کرتی ہی اچھی لگتی تھی۔

اب سرخ جوڑے میں چمکتی دمکتی' شرماتی بہو' اماں کے اندر کی ساس کو کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ اور ایسے کانٹے نکالنے کی کوشش ہر ساس بخوشی کرتی ہے۔ اماں بھی یہ ہی کوشش کر رہی تھی۔

"او ہو اماں! آپ کو تو وکیل ہونا چاہیے تھا۔ ہر بات پہ جرح' ہر بات پہ تنقید۔ اتنا بے وقوف نہیں ہوں' سب سوچا ہوا ہے۔ دو دن ہم خالہ رقیہ کے گھر ٹھہریں گے اور تو کھڑی کیا دیکھ رہی ہے۔ جلدی سے چادر اوڑھ کر آ۔ یہ نہ سمجھ کہ شہر لے کر جا رہا ہوں تو شہر والوں کی طرح اپنی عورت کو کھلے منہ اور ننگے سر لیے پھروں گا۔"

اختر نے اماں کا غصہ بانو پہ اتارتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا تھا تو وہ گھبرائی ہوئی "جی اچھا" کہتی تیزی سے

اندر کی طرف بھاگی تھی۔ بیٹے کے سخت لہجے سے اماں کے دل کو کافی تسکین ملی۔ جلدی سے پاس آکر بولی۔

"اچھا کیا ہے ابھی سے اس کی اوقات سمجھا دی ہے۔ ایسا کرتی ہوں میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلتی ہوں۔ بس رقیہ سے ملے مجھے بھی کافی ٹیم ہو گیا ہے۔ بڑی یاد آتی ہے نمانی۔"

اماں نے چالاکی سے کہتے ہوئے آخر میں لہجے میں مصنوعی دکھ سمو لیا تھا۔ رقیہ اماں کی خالہ زاد بہن تھی، جس سے اماں کی کبھی بھی نہیں بنی تھی۔

"اماں! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ پیچھے گھر کی رکھوالی، جانوروں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ اور ویسے بھی خالہ رقیہ سے کبھی آپ کی بنی نہیں ہے۔ میرے ویاہ پہ بھی خوب تماشے لگائے تھے آپ دونوں نے۔ آج تک میرے یار ہنستے ہیں مجھ پہ۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ رب راکھا۔" اختر نے بانو کو آتے دیکھ کر جلدی سے اماں سے رخصت چاہی تھی کہ کہیں وہ کوئی اور بات لے کر نہ بیٹھ جائے۔

اماں نے برے برے منہ بناتے ہوئے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا اور بے دلی سے چارہ اٹھائے جانوروں کے باڑے میں چلی گئی۔

"ہک ہاہ! ساری حیاتی اس کے پیو (باپ) نے چھتر کھائے ہیں اور اب پتر بھی زن مرید نکلا۔ ہائے وے سوہنیا رباّ میرے نصیب!"

اماں نے بھورے رنگ کی بھینس کو چارہ ڈالتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔ جلدی سے باقی کام نپٹائے اور چادر اوڑھ کر گھر سے باہر نکل گئی۔ دوپہر کے وقت مائی جیراں کے تندور پہ سب عورتیں روٹی لگانے کے بہانے اکٹھی ہوتی تھیں اور روٹی لگانے کے ساتھ ساتھ ساری اندر، باہر کی اہم خبریں یہاں ہی ایک سے دوسرے تک پہنچائی جاتی تھیں۔ مائی جیراں اس گاؤں کی "وکی لیکس" تھی۔ ساری اہم اور اندر کی خبروں کو دبائے 'عین وقت پہ بھانڈا پھوڑنے میں ماہر' اور میسنی بھتی جادو گرنی بہو کے نئے وار کے بارے میں سب کو بتانا بھی ضروری تھا نا۔۔۔ یہ سوچ کر اماں کے قدموں میں مزید تیزی آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جمیلہ (اماں) شادی کر کے اس گاؤں میں آئی تھی اور تب سے اب تک وقت کی ہر سختی و نرمی کو برداشت کرتی، خود پہ سہتی آج وہ بڑھاپے کی دہلیز پہ کھڑی تھی۔ اس گاؤں سے انسیت اور پیار اپنی جگہ تھا۔ مگر گاؤں کے لوگوں کے ساتھ بنا محبت اور خلوص کا رشتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید مضبوط ہوا تھا۔

اماں کی ساری زندگی سخت محنت اور مشقت کی چکی میں پستے ہوئے گزری تھی۔ شادی کے وقت جہاں اس کے گالوں سے قدرتی لالی اور ہونٹوں سے بات بے بات ہنسی پھوٹتی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ سب وقت کی دھول میں دبتا گیا۔ شوہر سیماب صفت اور ہرجائی نکلا۔ چار سال کے اختر کو جمیلہ کے سپرد کر کے اپنی نئی دنیا بسائی اور دوسری شادی کرنے کے بعد کبھی پیچھے مڑ کر واپس نہیں دیکھا تھا۔ جمیلہ کی عمر ساس کی چاکری کرتے اور طعنے سنتے گزرنے لگی تھی۔ جمیلہ کی ساس کو اپنی بہو ہی غلط لگتی تھی۔ جس کی کمیوں اور خامیوں کی وجہ سے تنگ آکر اس کے بیٹے نے دوسری شادی کر لی تھی اور اپنی ماں کو بھی بھول بیٹھا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہی جمیلہ کا جینا حرام کیے رکھا۔ جمیلہ بھی خاموشی سے سر جھکائے اس الزام کو سنتی اور برداشت کرتی رہی۔ اختر اماں کا لاڈلا ضرور تھا، مگر جہاں جمیلہ اپنے غصے یا جلال میں آجاتی وہاں اختر بھی دبک کر رہ جاتا تھا۔

اختر کی شادی اماں (جمیلہ) کی اپنی پسند پہ ہوئی تھی۔ اختر شہر کی فیکٹری میں ملازم تھا۔ تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ الگ سے کرائے پہ گھر لے کر اماں یا بیوی کو اپنے ساتھ رکھتا۔ اسی لیے بانو اماں کے ساتھ گاؤں میں ہی رہتی تھی اور اختر کے آنے کے دن گنتی تھی۔ اختر بھی ہر ہفتے بھاگا چلا آتا۔ اماں دونوں کی بے قراری دیکھ کر

کبھی تو ہنس پڑتی اور کبھی منہ بنا کر رہ جاتی تھی۔ بانو جس کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ اختر کے آگے پیچھے رہے' ایسے میں اسے بات بے بات ٹوکتی اماں اسے بہت بری لگتی تھی۔ اسے ان کا وجود بری طرح کھٹکتا تھا۔ دراصل دونوں ہی ساس اور بہو کے روایتی رشتوں کو بخوبی نبھا رہی تھیں۔

بانو' اختر کے التفات' محبت اور شدتوں پہ اترائی پھرتی تھی۔ اور اماں کے منہ کے بنتے بگڑتے زاویے اسے بہت تسکین دیتے تھے۔ اس کے لیے یہ ہار جیت کا کھیل بن چکا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھتی تھی کہ شوہر کی ماں سے ہار جیت کا نہیں' بلکہ عزت و احترام کا رشتہ بنتا تھا۔ ان رشتوں میں جیت تو کسی کی نہیں ہوتی ہاں مگر ہار دونوں کے حصے میں ضرور آتی ہے۔

☼ ☼ ☼

شہر کی عورتوں کے ننگے اور کھلے منہ پہ تنقید کرنے والا اختر' خالہ رقیہ کی ادائیں دکھاتی' قہقہے لگاتی بیٹیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہوئے چادر میں سکڑی سمٹی بیوی کو بھولے بیٹھا ہوا تھا۔ اندرون لاہور کی ——

—— تنگ و تاریک گلیوں میں واقع اس دو منزلہ مکان میں خالہ رقیہ اپنی آل اولاد کے ساتھ ——

—— رہائش پذیر تھیں۔ تینوں بیٹے شادی شدہ اور بال بچوں والے تھے۔ بڑی بیٹی نیلوفر شادی کے کچھ عرصے بعد ہی طلاق لے کر واپس آگئی تھی۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں بھی اچھے رشتوں کی تلاش میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

تنگ و تاریک کمرے اور بھانت بھانت کے لوگ اور آوازیں' بانو کچھ دیر میں ہی گھبرا گئی تھی۔ اوپر سے خالہ رقیہ کی تینوں بیٹیوں کے انداز و اطوار اسے مزید پریشان کر رہے تھے۔ خاص کر نیلوفر کی بے تکلفی اور التفات اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہے تھے۔ بانو کے کپڑوں سے لے کر اٹھنے بیٹھنے تک کو مذاق کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور اختر کی زبانی یہ سن کر کہ اسے شہر دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اسی لیے اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔

سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے تھے۔ خفت سے بانو کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا اور اس نے دل میں بے اختیار سوچا تھا۔

"اس سے اچھی تو میں پنڈ میں ہی تھی' جہاں میری اہمیت اور وقعت تو تھی نا' یہاں آ کر تو اختر کی نظریں نیلوفر سے ہی نہیں ہٹ رہی تھیں جو خود بھی تتلی کی طرح اس کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ بانو نے بہت ناگواری سے اس منظر کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تیری نو (بہو) تو بہت تیز نکلی۔ شکل سے تو بھولی بھالی سی لگتی ہے۔"

رشیدہ نے سب سے پہلے تبصرہ کرنا اپنا فرض سمجھا تھا' کیونکہ وہ خود بھی تین تین بہوؤں کی ستائی ہوئی بظاہر مظلوم ساس تھی۔ مگر درحقیقت اس نے اپنی بہوؤں کا جینا حرام کر کے رکھا ہوا تھا اور اسی بات کے طعنے اماں (جمیلہ) بہت زور و شور سے مارتی تھی۔ آج رشیدہ کو موقع ملا تھا تو وہ بھلا کیسے پیچھے رہتی۔

"شکل سے تو تو بھی بہت مسکین سی لگتی ہے مگر گنوں کی پوری ہے۔ اسی لیے تو تیری نواں (بہوئیں) آئے روز لڑ کر میکے گئی ہوتی ہیں۔"

اماں نے حساب برابر کرتے ہوئے کہا تو پاس بیٹھی باقی عورتیں ہنس پڑیں۔ رشیدہ کا پارہ چڑھ گیا۔

"دیکھ جمیلہ! میرے منہ مت لگیو۔ تیرے گن اتنے چنگے ہوتے تو تیرا بندہ تجھ پہ سوت کیوں لاتا؟ حالانکہ بیٹے کی ماں تھی تو مگر اس نے مرتے دم تک اس بانجھ عورت کے ساتھ زندگی گزار دی۔ کبھی پلٹ کر نہیں آیا اور تو یہاں اکیلی بڑی ساس کی جوتیاں کھاتی رہی۔"

رشیدہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہاتھ نچاتے ہوئے کہا تو اماں کا رنگ فق ہو گیا۔ سب جانتے تھے کہ یہ اماں کا کمزور پہلو تھا جس پہ وہ چاہ کر بھی کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے رشیدہ! نواں (بہوؤں) کی باتیں

کرتے کرتے ایک دوسرے کی ذات پہ کیوں حملہ
کر رہی ہو اور جس کی مثال تو نے دی ہے' کیا تو نہیں
جانتی کہ ایک نمبر کا ہرجائی تھا وہ۔ نیک اور شریف
عورت اسے راس نہیں آئی تھی۔"

صغراں ماسی نے رشیدہ کو جھاڑتے ہوئے کہا تھا۔ وہ
گاؤں کی بڑی بوڑھیوں میں شمار ہوتی تھی۔ سب اس
کی عزت کرتے تھے۔ صغراں ماسی نے اماں کا اڑا رنگ
اور آنکھوں میں پھیلتی نمی دیکھ لی تھی۔

"آہ... میں بھول گئی۔ دودھ کڑھنے کے لیے رکھ
کر آئی تھی۔ کہیں ابل نہ گیا ہو۔ میں چلتی ہوں۔"

یک دم اماں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے تیزی
سے کہا اور بغیر کچھ سنے واپسی کی راہ لی۔

"ڈکر لونگ... ابھی مجھے کہہ رہی تھی کہ تیرے ہاتھ
کا ساگ کھائے کافی وقت گزر گیا ہے۔ میں نے بھی کہا
کہ آج میرے ساتھ روٹی کھا۔ میرے نوں (بہو) نے
ساگ بنایا ہے۔ اب وچاری بھوکی ہی چلی گئی۔ پتا نہیں
گھر میں بھی کچھ بنایا ہو گا یا نہیں۔ پیچھے ہے کون جس
کے لیے بنا کر آتی۔ اکیلی جان اپنے لیے کیا تردد کرتی
بھلا۔ مگر خیر منے کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔"

صغراں ماسی نے افسردگی سے خود کلامی کی تھی۔
رشیدہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔ اماں (جمیلہ)
کی آنکھوں میں نمی وہ بھی دیکھ چکی تھی۔ اس نے
جلدی سے گرم روٹیاں کپڑے میں لپیٹیں اور گھر کی راہ
لی۔

☼ ☼ ☼

"وے جمیلہ! کہاں ہے تو...؟" رشیدہ ہاتھ میں
ٹرے پکڑے کھلے دروازے سے اندر آئی۔ خالی صحن
میں نظریں دوڑائیں' آواز دے کر پوچھنے لگی۔ اسی
وقت روئی روئی آنکھوں کے ساتھ اماں اندر کمرے
سے نکل آئی۔

"مجھے پتا تھا۔ تو نے ابھی تک روٹی نہیں کھائی
ہوگی' آجا آج گڑ بنایا ہے دیسی گھی میں۔ تیرے لیے
خاص طور پر لے کر آئی ہوں۔"

رشیدہ نے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا تو اماں سنتے
ہوئے چہرے کے ساتھ آہستہ سے بولی۔

"رشیدہ! رہنے دے۔ مجھے ویسے بھی بھوک نہیں
ہے۔"

"چل نی۔ مخول مت کر! تیرے بغیر میرے حلق
سے نوالہ نیچے اتر سکتا ہے۔ تجھے بھوک نہیں ہے تو
میرے لیے کھالے۔ چل! بسم اللہ کر' روٹی کو انتظار
نہیں کرواتے۔"

رشیدہ نے روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے کہا تو جمیلہ نے
بھی تقلید کی۔ کچھ دیر بعد دونوں مگن سی ایسے باتیں
کر رہی تھیں جیسے کبھی ان میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

"تو کر لو گل! میں تمہاری بھوک کا سوچ کر بھاگی
بھاگی گھر سے آئی ہوں اور یہاں کھانا کھاتے ہوئے
ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔"

صغراں ماسی لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ قدم
اٹھاتی گھر کے اندر داخل ہوئی تو چارپائی پہ دونوں کو سر
جوڑے بیٹھا دیکھ کر بولی۔ اس کا بارہ سالہ پوتا منا ٹرے
اٹھائے پیچھے پیچھے تھا۔

"یہ بھی خوب کہی! بھلا اس عمر وچ' تسی نس
(بھاگ) بھی سکدے ہو۔"

رشیدہ نے جمیلہ (اماں) کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے
ہوئے ہنس کر کہا تھا۔

"بڑی ٹھٹھی کر رہی ہو کڑیوں..." صغراں ماسی
نے دوسری چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا تو لفظ "کڑیوں" پہ
رشیدہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"صغراں ماسی! چھوڑیں' رشیدہ کو تو عادت ہے
مخول کرنے کی۔"

جمیلہ نے اپنی ہنسی کو چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

"سب سمجھتی ہوں میں! ارے نمانیوں' خوشی سکھ
سب کے اپنے اپنے ہو سکتے ہیں' مگر دکھوں کی سانجھ
سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ اگر ساری زنانیاں اس
بات کو سمجھ لیں تو سارے جھگڑے ہی مک جائیں۔"

صغراں ماسی نے اپنی ساری عمر کا نچوڑ بتایا تھا۔

"ٹھیک کہتی ہیں آپ! اچھا آپ دونوں باتاں کرو' میں دودھ پتی بنا کر لاتی ہوں۔"

اماں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

✲ ✲ ✲

"اختر! اب تجھے میری کوئی پروا نہیں ہے۔ پہلے تو میرے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ مگر اب دو' دو مہینے گھر نہیں آتا ہے اور آکر بھی تیرا منہ بنا رہتا ہے۔ بات' بات پہ لڑتا اور چڑتا ہے' کہاں گئی تیری محبت"

اختر اس بار چھٹی پہ آیا تو اپنے حال سے بے حال ہوتی بانو پھٹ پڑی۔ اس کی زچگی میں کچھ دن ہی باقی رہتے تھے۔

"بھاڑ میں گئی محبت۔ بندہ گھر کیا آئے؟ تم ساس' بہو کی باتیں' لڑائی جھگڑے' شکوے' شکایتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ اوپر سے تیری یہ حالت' ہر وقت بے زار' اکتائی ہوئی رہتی ہے۔ بندہ گھر آرام کرنے آتا ہے یا بیوی کے نخرے اور بیماری دیکھنے کے لیے۔"

اختر بھی آج کل اور ہی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ جس کی سن گن بانو کو بھی ملی تھی۔ ایک دم سے ہی بھڑک کر بولا تھا۔ بانو ہکابکا اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ جبکہ اختر بولتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

"فکر مت کر! ایک دو بچے ہو جائیں گے تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ تو یہ دودھ پی لے۔"

اماں نے گم صم سی بیٹھی بانو کے سامنے دودھ کا گلاس رکھتے ہوئے تسلی دی تھی۔

"مت کرو یہ جھوٹی ہمدردیاں! سب آپ کی پڑھائی اور سکھائی ہوئی پٹیاں ہیں۔ آپ جلتی تھیں ہماری محبت دیکھ دیکھ کر۔"

بانو نے اندر کی کھولن انڈیلی تھی۔ اماں ہنس پڑی۔

"پاگل ہے تو! شروع شروع کے چاؤ' چونچلے سارے مرد ہی کرتے ہیں۔ جب تک تو اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی' وہ بھی تجھ سے خوش اور راضی تھا۔ مگر جب تو اپنی حالت سے ہی تنگ رہنے لگی' وہ بھی تجھ سے پیچھے ہٹ گیا۔ مرد کی فطرت ہی ایسی ہے۔ اس بات کو سمجھ لے گی تو آئندہ دکھ نہیں اٹھائے گی۔"

اماں نے واپس پلٹتے ہوئے کہا تھا۔ بانو "ہونہہ۔۔۔" کر کے رہ گئی۔

✲ ✲ ✲

چھ مہینے کی فاطمہ چارپائی پہ بیٹھی اپنے سامنے رکھے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ فاطمہ میں سب کی جان تھی۔ اماں کی لاڈلی پوتی تو تھی ہی اختر بھی بیٹی پہ جان دیتا تھا۔ اماں نے پیڑھی پہ بیٹھی گم صم سی بانو کو دیکھا تھا۔ جو چاول صاف کرنا بھول گئی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ دو دن کے پہنے ملگجے سے کپڑوں میں ملبوس' بالوں کو بغیر کنگھی کے باندھے ہوئے وہ بہت اداس لگ رہی تھی۔ اختر کی بڑھتی بے اعتنائی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"وے بانو! آج کوئی گیت تو سنا۔ بڑا ٹائم ہو گیا تیری آواز سنے ہوئے۔ اختر کو تو اکثر سناتی تھی آج ساس کو بھی سنا دے۔"

مرغیوں کا ڈربہ صاف کرتی اماں نے اس کی توجہ بٹانے کے لیے بے ساختہ کہا تھا۔ بانو جو اماں کو پہلے منع کرنے والی تھی۔ کچھ سوچ کر چپ کر گئی۔ پھر اس کی سُریلی اور افسردگی میں ڈوبی آواز سارے صحن میں پھیل گئی۔

کتھے نین نہ جوڑیں
میرے جھنلیاں موڑیں
تینوں واسطہ خدا دا
واگاں وطناں نو موڑیں

اکھے لگ دے کسے دے
میرا مان نہ توڑیں
کتھے نین نہ جوڑیں

بانو کے دل کا درد زبان تک آ چکا تھا۔ ایک اندیشہ جو

سچ ہونے کے قریب تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور بانو نے دوپٹے سے آنکھوں کی نمی صاف کی۔ تو چونک گئی۔ سامنے ہاتھ میں بیگ تھامے اختر کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً" چاول کا تھال اٹھایا جب اس کے کانوں میں اختر کی آواز گونجی۔

"میں نیلوفر سے دوسری شادی کر رہا ہوں۔ تجھے خرچا پانی ملتا رہے گا۔ تو آرام سے یہاں اماں کے پاس رہنا۔ وہ میرے ساتھ شہر میں ہی رہے گی۔"

بانو کے ہاتھ سے تھال چھوٹ گیا۔ سارے چاول صحن میں بکھر گئے۔ اس کا شک سچ کا روپ لیے سامنے آچکا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

مرغیوں کے ڈربے کو صاف کرتی اماں نے چونک کر سامنے والا منظر دیکھا تھا۔ بیٹے کی ماں اور بانو کی ساس بن کر سوچا تو سب ٹھیک لگا۔

"بہت اترائی پھرتی تھی نا۔ مجھے نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ دیکھ لے یہ اوقات تھی تیری محبت کی۔"

اندر کی ساس پورے کروفر کے ساتھ بولی تھی۔ مگر نہ جانے پھر کیا ہوا۔ لمحوں میں سب بدل گیا۔ بانو کی جگہ جمیلہ کھڑی ہوئی تھی۔ عورت بن کر سوچا تو اس کا دکھ اپنا دکھ لگا۔ دکھوں کی سانجھ، دو عورتوں کی ایک ہی ہو گئی تھی۔ اماں اٹھی اور چیل کی طرح جھپٹی تھی اختر پر۔

"بے شرم۔ بے بدلحاظ! تجھے ذرا لاج نہیں آئی ایسی بات کرتے ہوئے۔ نیک اور شریف بیوی کے ہوتے ہوئے ادھر ادھر منہ مارتا پھرتا ہے۔ اپنے باپ کے نقش قدم پہ چلنے لگا ہے۔

جو کرنا ہے کر مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ تیرا ہم سے کوئی رشتہ ناتا نہیں رہے گا۔ میں سمجھوں گی میرا کوئی بیٹا ہی نہیں تھا۔ صرف ایک بیٹی ہے بانو اور میں اسی کا ساتھ دوں گی۔"

اماں نے اختر کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"اماں۔" اختر تڑپ اٹھا تھا۔ جو بھی تھا وہ اماں سے بہت قریب تھا۔ اختر نے آگے بڑھ کر ہانپتی ہوئی اماں کو سنبھالنا چاہا۔ اماں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"کچھ اور نہیں تو کم از کم اپنی پھول سی بچی کے بارے میں ہی سوچ لیتا تھا۔ میرے پاس تو بیٹا تھا جو باپ کی فطرت پہ گیا ہے۔ مگر تیرے آگے تو بیٹی ہے۔ کل کو کوئی ہرجائی صفت اسے بھی مل گیا تو کیا کرے گا تو۔"

اماں نے نم لہجے میں ننھی فاطمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اختر خوف سے کانپ اٹھا۔ آگے بڑھ کر بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا اور خاموشی سے اندر کمرے میں چلا گیا۔ مرد بن کر جو فیصلہ کیا تھا۔ باپ بن کر اسے بدل چکا تھا۔

اور اس ڈھلتی دوپہر میں صحن میں کھڑی دونوں عورتوں نے دکھوں کی سانجھ کا رشتہ بنا لیا تھا۔ وہ رشتہ جو بہت مضبوط تھا۔

اس دن کے بعد سے ان میں کبھی ساس، بہو والے جھگڑے نہیں ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو اختر بھی حیران ہو کر پوچھ بیٹھتا تھا۔

"ساس، بہو میں اتنی محبت۔" تو بانو بے اختیار ہنس کر کہتی تھی۔

"ساس، بہو نہیں، یہ دو عورتوں کے دکھوں کی سانجھ کا رشتہ ہے۔ جسے تم کبھی نہیں سمجھ سکو گے۔"

اور واقعی اختر نا سمجھی سے کندھے اچکا کر رہ جاتا ہے۔ خوشیوں کا ساتھی دکھ کی سانجھ کو کیسے سمجھ سکتا تھا۔

ایمل رضا

پتا نہیں وہ شش جہت ہر سو جھلملاتے آئینوں کا منظر کوئی خواب تھا یا حقیقت۔

اتنے سال گزر جانے اور فہم کی پروازوں میں اونچی اڑانیں بھر لینے کے باوجود بھی قدسیہ اس راز کی حقیقت نہ پا سکی تھی کہ بچپن میں نانی کے گھر کی چھت سے جو سڑک پار کا باغ نظر آتا تھا تو اس رات وہاں واقعی خوب صورت حور صفت لڑکیوں کے ہجوم نے شیشے جڑے گھڑے سروں پر رکھ کر رقص کیا تھا یا وہ سارا منظر محض قدسیہ کا خیال تھا۔ خواب تھا۔ بچپنا تھا۔

حالانکہ تب وہ اتنی چھوٹی بھی نہ تھی کہ خواب اور حقیقت میں فرق نہ معلوم کر سکتی۔ پر اتنی بڑی بھی تو نہ تھی کہ سیڑھیاں اتر کر رات کی تاریکی میں اس باغ میں جا کر خود اندازہ لگا سکتی کہ رقص اور کسی انجانی خوشی میں غرق وہ لڑکیاں جیتی جاگتی ہیں یا چاندنی راتوں میں صحرا میں دیکھتی پانی کی طرح نظر کا دھوکا۔۔۔

آنے والے دنوں میں وہ جب بھی اس رات کو یاد کرتی، عجیب کوفت کا شکار ہو جاتی۔ وجہ وہ اپنی بچکانہ الجھن کا کسی سے یوں بھی اظہار نہ کر سکتی تھی کہ اس رات کو ہی خالہ کا انتقال جو ہوا تھا۔

ابوالہول کی طرح پتھر اور جامد خالہ نجانے کب سے بیمار تھیں۔ قدسیہ سمیت خاندان کے کسی بچے نے انہیں کبھی تندرست حالت میں نہ دیکھا تھا۔

خالہ کے شوہر پچھلے اٹھارہ سال سے لندن میں مقیم تھے۔ فون پر ان کی آواز تو پاکستان آجاتی تھی۔ لیکن وہ خود اہرام کے راز کی طرح بڑے عرصے سے نظروں سے اوجھل تھے' پلٹ کر کبھی خالہ کی خبر لینے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ بڑا بلایا گیا' ڈرایا گیا' دھمکایا گیا اور سمجھایا بھی گیا۔ لیکن دوسری طرف کا پتھر سرک کر نہ دیا۔ پھر خبر آئی کہ موصوف وہاں ہی بیوی بچوں والے ہو گئے ہیں اس راز کے کھل جانے نے تو گویا قصے سمیت رشتہ بھی ختم کر دیا۔

خالہ کا انتقال ہو گیا۔۔۔ نجانے کس بیماری کس روگ کے کارن۔۔۔

شوہر کو خبر دے دی گئی۔ فون کے دوسری طرف بڑی دیر خاموشی رہی پھر "اناللہ وانا علیہ راجعون" کہہ کر یہ باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

ہاں تو جس رات خالہ کا انتقال ہوا تھا عین اسی وقت یا اس سے ذرا پہلے (قدسیہ کو یاد نہیں اب) اس نے باغ میں خالہ کو بھی تو دیکھا تھا۔ ایسی خوشی میں مست جو خالہ کے چہرے سے ساری زندگی تو جھلک نہ سکی۔ اب اگر قدسیہ یہ بات نانا ابو سے یا کسی اور سے کہہ دیتی کہ اس نے خالہ کو دیکھا تھا۔ باغ میں۔۔۔ محو رقص۔۔۔ تو کیسی کیسی پٹائی نہیں ہونی تھی اس کی۔۔۔ سیدوں کی لڑکی اور رقص۔۔۔

یہی وجہ تھی کہ وہ اس الجھن کو سلجھن بنانے کے لیے کبھی کسی کے آگے پیش نہ کر سکی اور آج چھوٹی بہن نمو نے بھی تو خوابوں کا ذکر کر کے اسے وہ خواب یا حقیقت والی سرگوشیوں بھری رات یاد کروا دی تھی۔ اور ایک آنسو ٹھک سے اس کی ہتھیلی پر آگرا تھا۔

امریکہ سے نمو نے درجن بھر کریمز اور لوشن بھیجے تھے۔ جسم کو نرم 'گداز' بے داغ اور خوشبودار بنانے

والے' ساتھ ایک کاسٹیوم بھی تھا میکسی طرز کا۔ بند پارسل کے اوپر ہی نمو نے بڑے حروف میں لکھا تھا۔
"آپی! چیریں استعمال کرنے سے پہلے مجھے فون کر لیجئے گا۔"

چیریں استعمال کرنا تو دور۔ قدسیہ نے انہیں ہاتھ لگانے سے بھی پہلے نمو کو فون کرلیا۔ پتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھی نمو۔ کریمز لگانے کی ترکیب تو سمجھا ہی رہی تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ اتنا کھلکھلا کر اور خود معنی ہنسی ہنس رہی تھی کہ قدسیہ ترکیب سمیت کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔

"اوہو آپی۔ آپ تو بالکل بدھو ہو۔" چھوٹی بہن کی شاید سمجھ میں نہیں آرہا تھا' سات سمندر پار بیٹھی بڑی بہن سے بے تکلفی کیسے پیدا کرے۔
"ساری کریمز اور لوشن آپ کی جلد کو کومل سا کر دیں گے۔ نرم و ملائم۔" نمو نے ایسے کہا جیسے کوئی جادوگر ڈھیروں منتر پڑھنے کے بعد پھونک مارے۔

"شیراز بھائی رات بھر سونے نہیں دیں گے۔" اب کے آواز خمار آلود تھی۔

"اور جب سوئیں گی تو بڑے اچھے خواب آئیں گے۔" نمو نے بات ختم کر کے بڑا جان دار قہقہہ لگایا اور فون بند کر دیا۔۔۔ قدسیہ جو نمو کی کسی بات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی 'آخری بات کو سمجھ کر گم صم رہ گئی اور ایک آنسو ٹپک سے اس کی ہتھیلی پر آ گرا۔

اس نے سیکسی نما ڈریس کو دیکھا' کاغذ پر میسج لکھا تھا۔ "آپی اپنی سالگرہ والی رات اسے ہی پہنئے گا۔" قدسیہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہ تحریر لکھتے وقت نمو خود کس طرح اندر ہی اندر مسکرائی ہو گی۔

پورے جہان میں صرف ایک نمو ہی بچی تھی جو اسے ہر دفعہ۔۔۔ جب بھی موقع ملتا' یہ ہی احساس دلاتی تھی کہ "آپی اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔۔۔ آپ ویسی ہی سندر رہیں۔"

اکثر ہمارے بہت سے رویے 'فیصلے اور تجزیے کسی تعلق داری کے باعث بڑے جھول دار ہو جاتے ہیں۔

قدسیہ اپنے موجودہ مقام سے بہت اچھی طرح آگاہ تھی۔ اگر وہ پہلے سی ہی سندر ہوتی تو ہر رات انگاروں پہ نہ گزارا کرتی۔

مستول ہی ٹوٹ جائے تو ناخدا کس بات پر زعم کرے بھلا۔۔۔ اس توڑ پھوڑ کی شروعات ایک برچھی سے ہوئی تھی۔۔۔ ٹھیک دو سال پہلے۔

بچی کی پیدائش پر نجانے کس کس دوائی کا کیسا کیسا ری ایکشن ہوا کہ قدسیہ کی کمر پر ایک بڑا سا سرخ نشان نمودار ہو گیا۔ پہلے پہل تو وہ نظر انداز کرتی رہی۔ جیسا کہ ہر کوئی ہی کرتا ہے۔ الرجی کی گولیاں کھا کر خود ہی اپنا علاج کرتی رہی۔ لیکن جب گول نشان کسی شگاف کی طرح بڑھتا ہی گیا۔ تو وہ ڈاکٹر کے پاس گئی۔

"آپ کو سورائی سس (Psoriasis) ہو گئی ہے۔" بارعب ڈاکٹر نے سارے ٹیسٹ کرنے کے بعد کہا۔ قدسیہ یہ نام پہلی مرتبہ سن رہی تھی۔

"وہ کیا ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب۔۔۔؟"

"جلد کی ایک بیماری۔۔۔ جس میں جلد خشک ہو کر چھلکوں کی شکل میں اترتی ہے۔۔۔ ہماری جلد۔ کی سات تہیں ہوتی ہیں اور ساتوں تہیں اس بیماری میں بہت کمزور ہو جاتی ہیں۔"

"یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا ڈاکٹر صاحب۔۔۔؟" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا' سیدھا اپنی فکر کا حل پوچھ لیا۔

"ان شاء اللہ کیوں نہیں۔۔۔ آپ کو بس احتیاط کرنا ہو گی۔۔۔ اور دوائیوں پر مکمل توجہ دینی ہو گی۔"

اس نے دونوں چیزوں پر فوکس کیے رکھا تھا۔ یہ احتیاط کیا کم تھی کہ شیراز اس ساری بات سے مہینوں لاعلم رہا تھا۔ لیکن نجانے کیا ہوا نیل کا ایک قطرہ پورے پانی کو نیلا کرنے لگا۔ یہ قطرہ تو اب کنویں میں گر جاتا تو اسے بھی نیلوں نیل کر دیتا۔ قدسیہ کا بھی تن من دو من نیلوں نیل ہونے لگا اور فرار کا راستہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ اپنی کمر کو آئینے میں دیکھ کر وہ اب خود ڈرنے لگی تھی۔ بڑے بڑے سرخ اور گہرے کھنچی نشان ایسے براجمان تھے جیسے جلے ہوئے گلاب کسی نے وہاں چپکا دیے ہوں۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟" شیراز اس کی گردن دیکھ کر چونکا تھا۔۔۔ گھبرایا بھی تھا۔۔۔ قدسیہ کا انجانے میں سر سے دوپٹہ اتر گیا تھا۔ ورنہ وہ تو آج کل گھر میں بھی بہت کس کے چادر لینے لگی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ الرجی ہے شیراز۔۔۔" وہ بری طرح سٹپٹائی۔۔۔ جیسے اس کی کوئی چوری سب کے سامنے ہی تو آ گئی ہو۔

"کب سے ہے۔۔۔؟" وہ قریب ہوا۔۔۔ تو قدسیہ پرے ہٹ گئی۔ پیچھے کو سرکنے لگی۔۔۔ نہیں چاہتی تھی کہ وہ بھی اسی طرح دیکھ کر ڈر جائے جس طرح وہ ہمت رکھنے کے باوجود بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"دو ماہ سے۔۔۔" اس نے ایک مہینہ مزید کم بتایا۔

"اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔۔۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔۔۔ توقف کیا۔۔۔ خود ہی نرم ہوا۔ "ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں؟"

"جی۔۔۔!"

"کیا کہا اس نے۔۔۔؟"

"احتیاط کرنے کا کہا تھا اور یہ کہ ایک ڈیڑھ ماہ لگے گا اسے جانے میں۔۔۔"

"چلو ٹھیک ہے۔۔۔ پریشان مت ہونا۔ ٹھیک ہو جائے گی خود ہی۔۔۔" شیراز نے پیار اور ہمدردی سے کہا تھا۔ قدسیہ کو تھوڑی تسلی ہوئی۔

لیکن وہ جو اسے پریشان نہ ہونے کا کہہ رہا تھا' رات میں نجانے کیوں خود کوفت کا شکار ہو گیا۔ سارا پیار بھاپ بن کر کچھ اس طرح اڑا کہ نہ تو پھر بادل بن کر برس سکا اور نہ فضا کی شبنم کی طرح گر سکا۔ خاموشی کا ایک لمبا سفر تھا جس میں ست رنگی کانچ دھڑا دھڑ ٹوٹے۔ محبت کو نہ جوش آیا نہ دم۔ اور جلنے کی بو پورے کمرے میں پھیل گئی۔ ساری رات قدسیہ خاموشی سے اپنے ہی آنسو پیتی رہی۔ اگلے دن اس نے ڈاکٹر بدل لیا۔

"مجھے حیرت ہے آپ پر۔۔۔ پڑھی لکھی لگتی ہیں آپ پھر ایسی غلطی کیسے کی آپ نے۔۔۔ ایلوپیتھک دوائیوں سے تو آپ کو یہ الرجی ہوئی ہے اور آپ وہ ہی دوائیاں کھا کر علاج کرواتی رہیں۔۔۔ بھئی حیرت ہے۔۔۔" موٹی توند والے ہومیو پیتھک ڈاکٹر نے ہنس کر کہا تھا "سورائی سس کا علاج تو ہے ہی ہومیو پیتھک میں۔۔۔ میں تو اب تک نوے کامیاب کیس کر چکا ہوں۔ پچاس لڑکے اور چالیس لڑکیاں۔۔۔ بس علاج ذرا مہنگا اور صبر آزما ہے۔"

پیسوں کی قدسیہ کو کمی نہ تھی اور صبر کو۔۔۔ کل رات سے اس نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔

"میں نے اپنے دوست سے بات کی تھی۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ سورائی سس کا علاج ہے ہی نہیں۔ چاہے جو مرضی کر لو' یہ زندگی بھر نہیں جاتی۔۔۔" شیراز نے کہا تو وہ جو گرم چائے بنا رہی تھی' برف کی طرح سن ہو گئی۔ ایک دو ڈاکٹرز نے اسے خود یہ بات کہی تھی اور اس بات کو وہ اپنی ذات سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔

"پرانی باتیں ہیں یہ شیراز۔۔۔!" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر نے بہت امید دلائی ہے مجھے۔"

"کل میں بھی چلوں گا ڈاکٹر کے پاس۔۔۔" قدسیہ کو بھی شیراز اس کی بیماری کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہا ہے لیکن۔۔۔

کاش یہ کل آتا ہی نہ۔۔۔ ڈاکٹر کے کلینک میں بیٹھی وہ یہ ہی سوچتی رہی۔

"سورائی سس کی صرف ایک دو۔۔۔ صرف ایک دو خال خال موجود اقسام ایسی ہیں جو چھوت کے زمرے میں آتی ہیں۔ لیکن مسز قدسیہ کی سورائی سس کسی صورت ان اقسام میں سے نہیں۔۔۔" جتنی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ قدسیہ بانک سے کٹتے گنے کی طرح کٹ کٹ کر چھوٹے چھوٹے حصوں میں بکھرتی رہی۔

"تو یہ وجہ تھی اس کے یہاں آنے کی۔۔۔" ڈاکٹر نے شیراز سے علیحدگی میں بھی کچھ باتیں کی تھیں۔

"ازدواجی زندگی میں سورائی سس کسی صورت رکاوٹ نہیں بنتی ہے۔۔۔ آپ کی بیوی برے فیز سے گزر رہی ہیں۔ ان کو آپ کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔۔۔ ان کے ساتھ پرخلوص رہیے۔۔۔ یقین جانیے صرف تھوڑے عرصے کی بات ہے۔"

شاید ان ہی باتوں کا اثر تھا کہ واپسی پر شیراز نے اسے ہوٹل سے ڈنر کروایا تھا۔ خاموشی کے انداز میں ڈوبی ہوئی بڑی بڑی تسلیاں دی تھیں۔ دونوں دنوں بعد بڑے خوشگوار انداز میں میٹھی باتیں کرتے رہے تھے۔ شاپنگ کے بعد پارک میں واک بھی کی اور گھر آکر وہ شاید تھکن کے مارے جلدی سو گیا تھا یا اسے ڈاکٹر کی کسی بھی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ نجانے کس ہدایت کے باعث وہ قدسیہ سے دور دور رہنے لگا تھا۔ انتظار اور کوفت کا عالم اس گھر پر آکر ٹھہر گیا۔ قدسیہ کے اندر اتنا اندھیرا جمع ہونے لگا کہ اسے اس اندھیرے کو مٹانے کے لیے سورج کی روشنی بھی کم پڑتی نظر آتی۔

"بھئی کیا کہتا ہے وہ ڈاکٹر۔۔۔؟" شیراز نے ایک دن بڑے عاجز آکر اس سے پوچھا تھا۔

"وہ تو کہہ رہا تھا کہ صرف تھوڑی دیر کی بات ہے

۔۔ اور اب تو یہ زخموں کے نشان سامنے کی طرف بھی آنے لگے ہیں۔۔۔"

"علاج بہت سست روی سے ہوتا ہے اس کا شیراز ۔۔ ابھی مزید دن لگیں گے۔"

"تمہیں پتا ہے' دو ماہ ہو گئے ہیں۔۔۔" اس نے بتایا جس میں جتانے کا عنصر نمایاں تھا۔

سورائی سس کو تو چھ ماہ ہو گئے تھے لیکن شیراز نے نجانے کس چیز کا حساب کتاب رکھا ہوا تھا۔ احساس جرم اور شرم سے قدسیہ پانی پانی ہو گئی۔ شیراز اپنے لہجے کی بے زاری اور جھنجلاہٹ کو چھپانے کی اب کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔

اگلے دن قدسیہ نے تقریباً" رو رو کر اپنی بیماری کے بارے میں نمو کو بتایا تھا۔

"او گاڈ آپی۔۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" وہ چلائی۔ "خیر پریشان مت ہوں۔۔ اتنی اتنی باتوں پر پریشان نہیں ہو جایا کرتے۔۔ شکر ادا کریں کہ شیراز جیسا شوہر ہے آپ کا۔۔ کوئی اور ہوتا تو۔۔۔ خیر۔" قدسیہ نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"پہلے صرف کمر پر تھی نمو۔۔ اب بازو' ٹانگوں پر بھی آنے لگی ہے۔۔ اور۔۔ اور۔" وہ رونے لگی۔

"علاج ہو رہا ہے نا آپ کا آپی۔۔۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔" نمو بہن کی پریشانی پر اداس ہو گئی۔

"اسٹریس۔۔۔"

"اسٹریس۔۔۔" نمو حیران ہوئی۔ وہ تو کچھ اور ہی سمجھی تھی۔

"سورائی سس کی بیماری اسٹریس نامی جگہ سے پانی حاصل کرتی ہے۔۔۔ آپ سٹریس نہ لیں۔۔۔ دوائی اور خدا کے کرم سے یہ خود بخود سوکھ جائے گی۔۔۔ سمجھ گئیں نا آپ۔۔۔ آپ جتنی زیادہ خوش رہیں گی اتنا ہی فائدہ ہو گا۔۔۔ ورنہ مہنگی سے مہنگی دوائی بھی بے کار ثابت ہو گی۔" ڈاکٹر نے اسے ساری تفصیل سمجھا دی۔

وہ سمجھ گئی بڑی اچھی طرح لیکن سمجھا نہ سکی ۔۔۔ بری طرح بھی۔

"تم بیمار ہو' مجھے اس چیز کا احساس ہے۔۔۔ پر مائنڈ نہ کرنا۔۔۔ بیڈ شیٹ روز بدل دیا کرو۔۔۔ یہ جو تمہاری جلد کے چھلکے اترتے ہیں ناں' مجھے اس سے بڑی کوفت ہوتی ہے مجھے' سردی میں روز صبح اٹھ کر نہانا پڑتا ہے۔" شیراز نے ایک دن منا جاجت کے اس سے کہا تھا۔

سورائی سس تو نہیں سوکھ رہی تھی' ہاں ان کی ازدواجی زندگی کو ضرور زنگ لگتا جا رہا تھا۔ محض ایک نقطے کا ہی فرق رہ گیا تھا ورنہ وہ محرم سے مجرم تو نجانے کب کی بن چکی تھی۔

شیراز درمیان میں تکیوں کی باڑ بنا کر سونے لگا تھا۔

رات کی تاریکی میں تکیوں کی یہ باڑ قدسیہ کو جیل کی آہنی سلاخوں کی طرح دکھائی دیتی۔ بچپن کے خیال و خواب کا کھیل شاید پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر دیکھتی۔ درمیان میں موجود نرم نرم روئی کے تکیے ہی تھے۔ لیکن اسے نجانے کیوں بیڈ کے بیچوں بیچ سلاخیں ہی نظر آتیں۔ جس کی پرلی طرف شیراز کو جیسے پھر بھی قرار نہیں آ رہا تھا۔

"کیسی کریم ہے یہ۔۔۔ کتنی تیز خوشبو ہے اس کی۔۔۔ پورا کمرہ بھر گیا ہے۔ روز لگانی پڑے گی کیا۔۔۔؟" کریم کی خوشبو واقعی تیز تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔ شیراز کے ماتھے پر شکنوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔

"جی۔۔!" یہ جی ایسے ہی تھا جیسے کوئی برج خوشاں اپنی ہی بنیادوں میں ڈھے جائے۔

"کمرے کے آئینوں پر بھی تم نے کپڑے ڈال دیے ہیں۔" شکووں کی برداشت اور ضبط کی انتہا کو پہنچا لہجہ ۔۔

"ڈاکٹر نے کہا تھا ایسا کرنے کو۔۔۔" پنڈلیوں پر کریم لگاتے اس نے گھٹنوں میں منہ دے لیا۔

"تو پھر ایسا کرو' پنکی کو لے کر ساتھ کے کمرے میں شفٹ ہو جاؤ۔۔ یا میں وہاں چلا جاتا ہوں۔۔۔" وہ اٹھنے لگا۔

"نہیں۔ آپ یہیں رہیں۔۔۔" آنسوؤں کو روک کر اس نے تکیہ اٹھایا اور ساتھ کے کمرے میں شفٹ

ہو گئی۔

"آپی! آپ کسی ہربل ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔" نمو نے وہاں سے ہی مشورہ دیا۔

سارے شہر کے ہومیو 'ایلوپیتھک کلینکوں' ڈاکٹروں کو تو وہ ویسے ہی جاننے لگی تھی۔ اب ہربل کلینک بھی دریافت کرنے لگی۔

"شیر۔۔ بھیڑیے۔۔ سانپ اونٹ' سانڈے کی چربی سے تیار کی جاتی ہیں ہماری ادویات۔۔ بالکل نیا طریقہ علاج ہے یہ۔۔ ہمارے ادارے نے تو سفید سورائی سسی کا کامیاب علاج کیا ہے آپ کی تو پھر ریڈ (سرخ) ہے۔۔ بے ضرر۔"

قدسیہ نہ مطمئن ہوئی نہ خوش۔ ہر نیا ڈاکٹر اسے یہ ہی کہتا تھا۔۔ تین ماہ اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ جب کامیاب علاج کے دعوے دار ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ اٹھا لیے۔

"آپ نے جتنے پیسے دیے ہیں۔۔ میں سارے واپس کرنے کو تیار ہوں۔۔ اور آپ سے کہتا ہوں کہ بس اب سب اللہ پر چھوڑ دیں۔"

اس نے تو کب سے سب اللہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ اپنی بیماری بھی اور اپنا رشتہ بھی۔ قدرت نے ہی اسے ففٹی ففٹی کی نجانے کون سی آپشن دے رکھی تھی کہ دونوں معاملے ہی لٹکے ہوئے تھے۔

پانچ نمازیں تو وہ پہلے ہی پڑھتی تھی اب اس نے تہجد کے ساتھ ساتھ چاشت اشراق بھی پڑھنا شروع کر دی۔ وضو کرنے سے لے کر نماز ختم ہونے تک وہ اپنے لیے دعا کرتی۔ باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر کرنے والی دعا الگ ہے۔۔ دن سے رات کرتی اور رات سے پھر دن ۔۔

"کیوں اتنا ہلکان ہوتی ہیں باجی۔۔!" ایک دن کام والی ملازمہ نے اس سے کہا۔

"ہمارے علاقے میں ایک حکیم ہے۔۔ بہت پہنچا ہوا۔۔ پہاڑوں کا بیٹا سمجھ لیں بس۔۔ نبض دیکھ کر مریض کا بتا دیتا ہے۔۔ میرے کاکے کو یرقان ہو گیا تھا ۔۔ ہم تو صبر کر چکے تھے لیکن اس کی دی تین خوراکوں نے راتوں رات آنکھوں سے ساری پیلاہٹ ختم کر دی۔"

قدسیہ چادر لپیٹ اگلے دن ملازمہ کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی۔

"سمندری سیپ اور زرد کوڑیوں کا ابلا ہوا پانی۔۔۔ افساطین اور برہم بوٹی کچے گھڑے میں صاف ستھرے پانی میں حل کرنی ہیں۔۔ اور برزم خطائی۔" قدسیہ سمجھتی تھی کہ جڑی بوٹیاں سستی ہوتی ہیں۔ لیکن صرف برزم خطائی ہی سونے کے بھاؤ نکلی۔

"ان جڑی بوٹیوں کے علاج سے فرق تو پڑ جائے گا نا حکیم صاحب۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔۔!" حکیم صاحب تعجب سے بولے۔ ان کی حکمت پر شک۔۔ جھریاں تھرتھرائیں۔۔ اور داڑھی بھی جل جل کر ساکت ہو گئی۔

"برہم بوٹی تو برص اڑا کر رکھ دیتی ہے۔۔ یہ تو پھر سورائی سس ہے۔" حکیم صاحب پر اعتماد لہجے میں بولے۔

اور دو ماہ بعد قدسیہ کا ان پر سے سارا اعتماد اٹھ گیا۔ برہم بوٹی شاید واقعی برص اڑانے میں کارآمد تھی۔ کیونکہ قدسیہ کی سورائی سس کو اس سے چنداں فرق نہ پڑا۔ سارا سارا دن کچن میں پانی ابلتا رہتا۔ افساطین کی بدبو نے ناک میں دم کر دیا۔ کچھ شاید اس بو کا بھی اثر تھا کہ شیراز مصفا ہونے کے بجائے اندر تک کڑواہٹ کا شکار ہوتا چلا گیا۔ لیکن یہ ساری کڑواہٹ اس کی نظروں میں ہی قید رہی۔ وہ اب کوئی سوال جواب نہیں کرتا تھا۔۔ کون سا ڈاکٹر۔۔؟ کیسا علاج ۔۔؟ مزید کتنے دن لگیں گے۔۔؟ ان سوالوں کے اتنے جواب مانگے گئے تھے اور اتنے سنے گئے تھے کہ اب وہ قدسیہ سے بھی پہلے جیسے اس شکست کو تسلیم کر چکا تھا۔ بے اعتنائی کی فضا نے گھر میں اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیے تھے۔ قدسیہ کا دم گھٹنے لگا تھا۔

"آپ! آپ میرے پاس امریکہ کیوں نہیں آجاتیں۔۔" نمو نے ایک دن اسے کہا "یہاں ایک

سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر ہے کیوں نہیں ہو گا آپ کا علاج۔"

"نہیں نمو...! پنکی ابھی چھوٹی ہے۔ میں یہ سفر کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔" قدسیہ نے جھوٹا جواز گھڑا۔

درحقیقت وہ شیراز کے موجودہ رویے سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ جو چار چھ ماہ کے لیے امریکہ چلی گئی تو دور دور رہنے والا شیراز کہیں بالکل ہی پرایا نہ ہو جائے۔ شیراز کو ویسے بھی شروع سے ہی سوتے وقت دو تکیے لینے کی عادت تھی۔ ایسی پوزیشن میں اس کے کندھے پر سر رکھے قدسیہ کو وہ اور بھی اوپر اٹھتا کوئی دیو نما معلوم ہوتا۔ قدسیہ کو وہ کبھی بھی اپنی برابری کی سطح کا نہ لگا۔ اب تو ویسے ہی الگ الگ کمروں کی زندگیوں میں دونوں کے درمیان نہ پاٹ سکنے والا دریا آ گیا تھا۔ ایسا دریا جس پر فی الحال کوئی پل بننے کی امید نہیں تھی۔

"میں نے یہاں پر بہت سے ڈاکٹرز سے بات کی ہے اب سورائی سس کے حوالے سے Infliximab تھراپی بالکل نئی ایجاد ہے۔ اور اس کے لیے آپ کو امریکہ آنے کی بھی ضرورت نہیں... پاکستان کے ہر بڑے شہر میں اس کا علاج موجود ہے۔ لاہور، کراچی، اسلام آباد... مجھے تو حیرت ہے کہ شیراز بھائی کو اب تک اس چیز کا علم کیوں نہیں ہو سکا... اور آپ بھی بے خبر رہیں۔"

ایک نئی امید کے ساتھ اس نے اس حوالے سے شیراز سے بات کی تھی۔

"ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا... میں آج کل بہت مصروف ہوں۔" وہ آج کل نہیں پچھلے ایک سال سے مصروف تھا۔ اتنا... اتنا کہ دونوں کا رشتہ صرف ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

"جن لوگوں کو بچپن سے سورائی سس ہوتی ہے ان لوگوں کی حالت بھی آپ جیسی نہیں ہوتی... یا تو آپ نے کوئی علاج ٹھیک سے کروایا نہیں یا پھر آپ ذہنی طور پر تھک گئی ہیں۔" نئے ڈاکٹر نے اس سے کہا... ایک نئے جوئے نے... جس میں پتا نہیں اب کی بار اس کی ہار لکھی تھی کہ جیت۔

"اب کتنی امید ہے ڈاکٹر صاحب...؟" وہ نا امیدی سے بولی۔

"اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے... مس قدسیہ... سو فی صد امید رکھیے۔"

ایک نئے عزم سے اس نے علاج شروع کروا دیا۔

✿ ✿ ✿

فرق پڑ ہی رہا تھا۔ جب ہی تو آج وہ آتے وقت کیک لیتی آئی تھی۔ کھانا بھی اس نے بڑے اہتمام سے بنایا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر اس نے ہنستے ہوئے شیراز کو نمو کی بات بتائی تھی۔ یہ ہنسی ایسی تھی جیسے ہنسی اپنی لاج نبھاتے نبھاتے تھک گئی ہو یا جیسے ہنسی کو اپنی ہتک پر رونا آ گیا ہو۔

"ہوں...!" لمبی چوڑی تمہید کے بعد سنائی جانے والی بات کو سن کر شیراز نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ اس ہوں میں ساری انجان املا اور سرد مہری قید تھی... وہ اس کے اہتمام سے بنائے کھانے کو بڑی بے دلی سے کھا رہا تھا۔

بعض چیزیں اپنے ٹوٹنے پر بڑا شور پیدا کرتی ہیں۔ بڑا واویلا اٹھتا ہے۔ وبال آتا ہے... جیسے لکڑی، شیشہ، مٹی کا کوئی ظرف... پہاڑ، چٹان، مکان، دیوار... لیکن بعض چیزیں بڑی خاموشی سے اپنی کم مائیگی کے احساس تلے خود پر ہی روتے دھوتے بنا رہ تسلیم کر لیتی ہیں... بغیر کوئی ہنگامہ برپا کیے۔ جیسے دھاگہ، ڈوری، یا بن پھول، پتا، پر اور پنکھ۔

اس رات جہاں اور بہت کچھ ہوا، وہاں ایک عمل یہ بھی ہوا تھا۔ بڑی خاموشی اور رازداری برتی گئی تھی۔ اور ایک ذات حقیقت سے آشنا ہو کر فنا ہو گئی تھی۔

کمرے میں آ کر پورے دو گھنٹے لگا کر قدسیہ نے درجن بھر کریمز اور لوشن کو استعمال کیا تھا... باری باری... نمو کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق... جتنی دیر وہ

مصروف رہی نمرو کا ایک فقرہ اس کے کانوں میں رس گھولتا رہا۔

"ساری کریز کومل سا کر دیں گی تپ کو۔۔۔ شیراز بھائی سونے نہیں دیں گے۔۔۔ بڑے اچھے خواب آئیں گے" وہ یاد کرتی رہی اور مسکراتی رہی۔۔۔ نمکنج حیران کن تھے۔۔۔ وہ خود دیکھ کر ششدر رہ گئی۔۔۔ وقتی طور پر ہی سہی سارے زخم جیسے جڑوں سے غائب تھے۔ اس نے ایک ایک کر کے ہر شیشے پر سے کپڑا ہٹا دیا اور کمرے میں موجود پھولوں کے آگے پڑی بڑی بڑی موم بتیاں روشن کر دیں۔ اس کا دل کیا آج وہ پورے شہر کی روشنیاں اس کمرے میں بھر لے۔۔۔

نمو ٹھیک کہتی تھی۔۔۔ وہ کومل ہو جائے گی۔۔۔ وہ کومل ہو گئی۔۔۔

لیکن شیراز۔۔۔؟ شیراز کیوں نہ عارضی طور پر ہی سہی اس بات کو قبول کر سکا۔

اس کا رویہ ایسا تھا جیسے میلوں پھیلے کھیت کی اس نے آج رات ہی رات میں کٹائی کرنی ہو۔ پتا نہیں وہ شروع سے ہی ہر کام میں اتنا عجلت پسند تھا یا قدسیہ کی بیماری نے اس میں یہ پھرتی بھر دی تھی۔

چیز جو ٹوٹی تو پھر وہائی بھی نہ دی گئی۔

مشعلوں کے جلنے اور بجھنے میں واقعی ایک لمحہ لگا تھا یا یہ قدسیہ کا خواب تھا۔۔۔ خیال تھا۔۔۔ درد بھری حقیقت تھی۔

اس نے ہاتھوں کی دسترس تلے اپنے وجود اور سلوٹوں کو ٹٹولا۔۔۔ وہاں شیراز تک جانے والا کوئی ٹوٹا ہوا سنگ میل بھی موجود نہیں تھا۔ شیراز کونے کی کرسی پر بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔۔۔ فیصلہ کر لینے اور سنا دینے کی درمیانی کشمکش میں۔۔۔

"سنو قدسیہ!" بالآخر کشمکش ختم ہوئی۔ "یہ سب ایسے نہیں چل سکتا یار۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت زیادہ۔۔۔ پر میری محبت کا اس طرح امتحان نہ لو۔۔۔ ایک بچی کی خاطر ہم اپنی زندگی کیوں تباہ کریں۔۔۔ مجھے اور تمہیں پورا حق ہے اپنی اپنی زندگی اپنی پسند سے جینے کا۔۔۔ اور میں اس حق سے مزید دست بردار نہیں رہنا چاہتا۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنی اپنی راہیں جدا کر لیں۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔؟"

بات جس کے دھیرے دھیرے منطقی انجام تک پہنچنے کا ڈر تھا' وہ ڈر چھن سے کرچی کرچی ہو گیا۔ لیکن نہ کوئی بین ہوا نہ ماتم۔

"بولو قدسیہ۔۔۔ تم کچھ بولتی کیوں نہیں۔" بہت لمبی لمبی وضاحتیں دینے کے بعد وہ کوئی پانچویں بار قدسیہ سے یہ پوچھ رہا تھا۔

"قدسیہ۔۔۔؟" اندھیرے اور سناٹے میں پکار گونجی۔۔۔ شیراز بیڈ کے قریب آیا جہاں ایک نوحہ بڑی میٹھی اور ابدی نیند سو رہا تھا۔

پھر اس رات ایک اور حقیقت بھی آشکار ہوئی قدسیہ پر۔۔۔ بچپن کے دیکھے گئے خواب اور حقیقت کی گتھی خود بخود ہی سلجھ گئی۔۔۔ اپنے آپ ہی۔۔۔ جیسے بارش ہونے کے بعد منظر واضح ہو جاتا ہے دور تک۔۔۔ خالہ کے گلے لگ کر قدسیہ اپنی مسرت میں مکمل کر روشن ہو گئی۔

"کیسی عجیب بات ہے نا خالہ۔۔۔ ساری زندگی جسے خواب سمجھتی رہی وہی اصل حقیقت نکلی۔"

اور اصل کہانی اگلے دن ختم ہوئی۔ جب تعزیت کے لیے آئے لوگوں کو نمٹاتے نمٹاتے بوکھلائے شیراز نے ڈاکٹر کی فون کال ریسیو کی تھی۔

"مبارک ہو مسٹر شیراز۔۔۔ مسز قدسیہ کی رپورٹس نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ ان شاء اللہ اب جلد ہی یہ پریشانی ختم ہو جائے گی۔"

موبائل شیراز کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کسی حقیقت سے چونکا تھا یا کسی بھیانک سپنے میں گم ہو گیا تھا۔

نگہت سیما
Scanned By Amir

جوزفین اپنی ماں مارتھا اور باپ پال کے ساتھ پاکستان سے مائیگریٹ کر کے آئی ہے۔ اس کی سگی ماں اس کے باپ کو چھوڑ کر کسی مسلمان سے شادی کر چکی ہے۔ مارتھا اس کی سوتیلی ماں ہے۔ اس کا تعلق گوجرانوالہ کے ایک نیچے درجے کے عیسائی خاندان سے ہے۔ مارتھا چاہتی ہے کہ جوزفین شادی کے بغیر ایلین کے ساتھ رہے۔ جو لندن کا عام دستور ہے' لیکن اس کا باپ پال اس بات کو پسند نہیں کرتا' کیونکہ وہ ایک پادری کا بیٹا ہے اور اس طرح کے تعلق کو جائز نہیں سمجھتا۔ اس بات کی وجہ سے پال اور مارتھا میں اکثر جھگڑا ہوتا ہے۔ مارتھا' جوزفین کو برا بھلا کہہ کر گھر سے نکال دیتی ہے۔ جوزفین گھر کے باہر بیٹھی روتی رہتی ہے۔ جہاں غلام مصطفیٰ اسے اکثر روتے دیکھتا ہے۔ وہ ان کے گھر کے سامنے رہتا ہے اور فٹ بال کا بہترین کھلاڑی ہے۔

ہادی کی ماں کے مرنے کے بعد حبیب الرحمٰن نے زری سے دوسری شادی کی ہے۔ زری ان کے آفس میں کام کرتی تھی۔ زری' ہادی سے بے حد نفرت کرتی ہے۔ اس کی پوری کوشش ہے کہ ہادی کو گھر سے نکال دے' تاکہ اس کا بیٹا سنی پوری جائیداد کا وارث بن جائے۔ وہ حبیب الرحمٰن سے ہادی کی جھوٹی شکایتیں کرتی ہے۔ ہادی کو نت نئے طریقوں سے اذیت دیتی ہے۔ حبیب الرحمٰن غصہ کے تیز ہیں' وہ مشتعل ہو کر اس کی پٹائی کرتے ہیں۔

حبیب الرحمٰن کاروبار کے سلسلے میں دبئی جاتے ہیں تو زری' ہادی کو مار کر گھر سے نکال دیتی ہے۔ وہ اس پر الزام لگاتی ہے کہ ہادی نے اس کے بیٹے سنی کو مارا ہے۔ وہ حبیب الرحمٰن سے فون پر شکایت کرتی ہے تو وہ ہادی کو گھر سے نکل جانے کے لیے کہتے ہیں۔ ہادی کی منت سماجت بھی نہیں سنتے۔ مشاعل جو ہادی کی سوتیلی بہن ہے۔ وہ اس سے بہت ہمدردی رکھتی ہے۔ وہ اس کی مدد کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے' لیکن زری اسے گھر سے نکال دیتی ہے۔ وہ گھر کی دیوار کے باہر لکھ کر آجاتا ہے "ابا میں نے سنی کو نہیں مارا۔"

محی الدین' ہادی کو اکثر فٹ بال کے میدان میں بیٹھا دیکھ چکے ہیں۔ وہ فٹ بال کلب کے گراؤنڈ میں اسے بے ہوش

مکمل ناول

دیکھتے ہیں تو اسے گھر لے جاتے ہیں۔ اسے نمونیہ ہو چکا ہے۔ ہادی چھ دن بعد ہوش میں آتا ہے تو محی الدین کو ساری بات بتاتا ہے۔ محی الدین یہ جان کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ہادی ان کے دوست عبدالہادی کا بھانجا ہے۔ عبدالہادی فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے اور جوانی میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

وہ ہادی کو لے کر اس کے گھر جاتے ہیں، لیکن زری اسے گھر میں گھسنے نہیں دیتی۔ وہ کہتی ہے کہ اگر وہ اس گھر میں آیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دے گی۔ حبیب الرحمن ابھی تک دبئی میں ہیں۔

محی الدین کو واپس لاہور جانا ہوتا ہے۔ وہ مجبوراً" واپس آجاتے ہیں۔ وہ گھر کی ملازمہ کو اپنا فون نمبر دے آتے ہیں کہ حبیب الرحمن آئیں تو انہیں یہ نمبر دے دے، لیکن ان کا انتظار، انتظار ہی رہتا ہے۔ حبیب الرحمن نہیں آتے، وہ ہادی کو چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ ایک بار اور کوشش کرتے ہیں، لیکن زری اسے اپنے گھر میں رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ وہ انگلینڈ واپس چلے جاتے ہیں۔ وہ خود فٹ بال کے عاشق ہوتے ہیں۔ ان کا بیٹا آٹھ سال کی عمر میں فٹ بال کا بہترین کھلاڑی ہوتا ہے، لیکن ایک میچ کے دوران گر کر مر چکا ہے۔ وہ ہادی کی پرورش اپنے بیٹے کی طرح کرتے ہیں اور اسے فٹ بال کا بہترین کھلاڑی بنانے کا خواب دیکھتے ہیں۔

لندن آجانے کے بعد بھی وہ ایک بار پھر پاکستان جاتے ہیں لیکن ہادی کے گھر جا کر انہیں پتا چلتا ہے کہ حبیب الرحمن اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

ہادی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ وہ فٹ بال کا بہترین کھلاڑی بن چکا ہے۔

خوش جمال جو محی الدین کی بیٹی ہے۔ ہادی کی اس سے بہت دوستی ہے۔ خوش جمال کی جوزفین سے بھی دوستی ہو جاتی ہے۔ خوش جمال، جوزفین کو اکثر گھر کے باہر روتا دیکھتی ہے تو اسے بہت افسوس ہوتا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

پال کچن میں اپنے لیے کافی بنا رہا تھا، جب جوزفین کچن میں آئی تھی۔ اس نے بلیک جینز پر سرخ لانگ شرٹ پہن رکھی تھی اور بلیک کوٹ کے ساتھ سر پر ریڈ اور بلیک اونی ٹوپی اور گلے میں سیاہ مفلر لٹکا ہوا تھا جس کے سرے اس کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔

پال نے مڑ کر ایک ستائشی نظر اس پر ڈالی۔

"تم تیار ہو، تمہارے لیے بھی ایک کپ کافی بنا دوں؟"

"یس پلیز!" وہ کچن میں ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

کچن کے ایک کونے میں چھوٹی سی گول میز کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں۔ اکثر وہ تینوں وہاں ہی ناشتہ اور ڈنر وغیرہ کر لیا کرتے تھے۔

"تم خوش تو ہو نا جوزی؟" کافی پھینٹتے ہوئے پال نے اس کی طرف دیکھا۔

"جی پاپا!"

"کوئی پرابلم تو نہیں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور پوچھا۔

"ممی نے آج کام پر نہیں جانا؟"

"معلوم نہیں۔" پال نے کندھے اچکائے۔

جب سے جوزفین نے جاب کی تھی پال کچھ خاموش رہنے لگا تھا۔ وہ خود سے مارتھا سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ جوزی کی جاب سے خوش نہیں تھا۔ پچھلے تین ہفتوں سے وہ جاب پر جا رہی تھی اور ہر ہفتے کی اجرت وہ مارتھا کے حوالے کر دیتی تھی جبکہ پال چاہتا تھا کہ وہ پیسے اکٹھے کر کے اپنی پڑھائی شروع کر دے۔ ایک دفعہ ابتدائی اخراجات کے لیے رقم اکٹھی کر لے تو بعد میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ جاب بھی کرتی رہے۔

"آج تمہیں اس ویک کی پے ملے گی جوزی! تو تم اسے مارتھا کو مت دینا۔" پال نے کافی کا کپ اس کی

ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔
جوزفین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"اپنے لیے کچھ شاپنگ کرلینا' تمہارے دستانے بہت پرانے ہوگئے ہیں۔ وہ بھی خرید لینا۔"

"نہیں تو پاپا! اچھے خاصے ہیں۔" اس نے کوٹ کی جیب سے دستانے نکال کر پال کو دکھائے۔
"وہاں اسٹور پر سب لوگ اچھے ہیں نا؟" وہ ہر روز ایک یا دو بار یہ سوال ضرور کرتا تھا' مارتھا سنتی تو بہت چڑتی تھی۔
"اس کے منہ میں چوسنی ڈال دو اور جھولے میں ڈال کر ہر وقت جھلاتے رہو۔"
مسئلہ جوزفین کی جاب نہیں تھی۔ وہاں پاکستان میں بھی پال کے خاندان کی لڑکیاں جاب کررہی تھیں۔ کوئی ٹیچر تھی تو کوئی ڈاکٹر اور کوئی نرس' مسئلہ جوزفین کی پڑھائی تھی۔ وہ اسے ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا' لیکن وہ اسے پڑھا نہیں سکتا تھا۔
"کاش تمہیں جاب نہ کرنا پڑتی لیکن خیر۔" پال نے اپنے لیے کپ میں کافی ڈال کر جوزفین کی طرف دیکھا اور وہ بات کہہ دی جو کئی دنوں سے سوچ رہا تھا۔
"تم اپنی ساری پے مارتھا کو دینے کے بجائے اپنے پاس جمع کرو' جب کچھ پیسے جمع ہوجائیں تو اسکول میں ایڈمیشن لے لینا۔"
پال بہت خوش فہم تھا اور جوزفین اسے اس خوش فہمی سے نکالنا نہیں چاہتی تھی۔
"ٹھیک ہے پاپا! جب میرے پاس کچھ رقم اکٹھی ہو جائے گی تو میں ایڈمیشن لے لوں گی۔"
پال خوش ہوگیا اور اپنا کافی کا کپ لے کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔
"اس سنڈے کو کہیں گھومنے کا پروگرام نہ بنالیں۔"
"نہیں پاپا! خوامخواہ کی فضول خرچی۔"
"وہ دراصل..." پال نے کافی کا کپ منہ سے لگایا وہ جوزفین کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ "وہ مارتھا کہہ رہی تھی ایلین نے انوائٹ کیا ہے۔"
"لیکن پاپا! اس سنڈے کو تو مجھے خوش جمال کی طرف جانا ہے۔ میں نے اس سے پرامس کر رکھا ہے۔"

ان تین ہفتوں میں اس کی خوش جمال سے چار اور مصطفیٰ سے تین ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔ اور تین دن پہلے خوش جمال نے اسے اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔ اپنے اماں اور بابا سے ملوانے اور ڈھیر ساری باتیں کرنے کے لیے۔ خوش جمال ایک بے تکلف اور خوش اخلاق لڑکی تھی اور اسے اچھی لگی تھی۔ ایلین سے اب اس کی صرف ویک اینڈ پر ہی ملاقات ہوتی تھی۔ کیوں کہ وہ صبح آٹھ بجے تک نکل جاتی تھی اور شام کو پانچ بجے کے بعد آتی تھی۔ اور ایلین جب ویک اینڈ پر آتا تو وہ اس سے اچھی طرح بات کرلیتی۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ خوامخواہ مارتھا کا موڈ خراب ہو اور مارتھا اس کے رویے سے بہت خوش ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ وہ بدل رہی ہے اور بہت جلد یہاں کے طور طریقے سیکھ لے گی پھر اسے ایلین کے ساتھ رہنے میں اعتراض نہیں ہوگا۔ اور اس نے ایلین کو بھی اطمینان دلایا تھا کہ تھوڑا وقت دو اسے' پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ایلین کبھی خالی ہاتھ نہ آتا' پزا' چپس' فنگر فش' جوسز' کچھ نہ کچھ ضرور لاتا تھا۔
"تم پہلی بار جارہی ہو خوش جمال کے گھر۔" پال نے ایک ہی سانس میں اپنی ٹھنڈی ہوتی کافی ختم کی۔
"جی پاپا! پہلے ساری ملاقاتیں تو گھر سے اسٹاپ تک جاتے ہوئے ہوئی تھیں۔ بہت ہی غیر رسمی سی خوش جمال مجھے بہت اچھی لگی ہے' میں اسے دوست بنانا چاہتی ہوں۔ یہاں میری کوئی بھی دوست نہیں ہے گو وہاں کراچی میں میری اتنی ساری فرینڈز تھیں۔"
"اوکے۔" پال اٹھ کھڑا ہوا' جوزفین کے لہجے سے جھلکتی اداسی نے اسے دکھی کردیا تھا۔
"تمہارے لیے کیا ناشتہ بناؤں۔"
"پاپا! میں خود بنالوں گی۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"کوئی بات نہیں۔ میں بنانے لگا ہوں۔"

"مارتھا ناراض ہو گی۔ خیر' اس کی تو عادت ہے ناراض ہونے کی۔" پال فریج میں سے انڈے نکال رہا تھا اور اس کی پشت جوزفین کی طرف تھی۔

"پاپا! اگلے سنڈے کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔"

گھر میں اتنے دنوں سے سکون تھا اور وہ مارتھا کو ناراض کر کے یہ سکون برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" پال مطمئن ہو گیا۔ "بلکہ سٹر ڈے ایوننگ میں چلیں گے ڈنر بھی باہر ہی کریں گے۔ اگلے سنڈے کو مجھے مارشل کی طرف جانا ہے اس نے مجھے ایک اور جاب کے متعلق بتایا ہے' جہاں سیلری اس سے اچھی ہے۔"

وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹوسٹر آن کر کے سلائس گرم کرنے لگی۔ پال انڈے فرائی کرنے لگا۔

جوزفین نے سلائس پلیٹ میں رکھ کر ٹیبل پر رکھے تب ہی مارتھا نے کچن میں قدم رکھا۔ جوزفین نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں ممی!"

جوزفین نے سادگی سے تعریف کی' پال نے بھی مڑ کر ایک ستائشی نظر اس پر ڈالی۔ مارتھا مسکرائی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ پال نے فرائی انڈے ٹیبل پر رکھے اور اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ جوزفین نے فریج سے جیم اور مکھن نکال کر رکھا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

تینوں خاموشی سے ناشتا کر رہے تھے اور تینوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

پال سوچ رہا تھا' مارتھا اگر لڑائی نہ کرے تو مارتھا بہت اچھی ہے اور خوب صورت بھی تو بہت ہے۔ مارشل کی اس گوری میم سے زیادہ خوب صورت' لیکن جب حلق پھاڑ کر بولتی ہے تو گوجرانوالے کی دیتو بن جاتی ہے۔ اس کی نظریں بار بار مارتھا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اور بہت دنوں بعد ایسا ہوا تھا ورنہ تو جب سے مارتھا نے جوزفین کو جاب کے لیے کہا تھا وہ دل ہی دل میں اس سے سخت خفا تھا' لیکن مارتھا پال کی نظروں سے بے نیاز ایلن کے متعلق سوچ رہی تھی۔

ایلن بڑا اچھا لڑکا ہے' بڑے کھلے دل کا' ورنہ یہ گورے تو بڑے گھڑولے ہوتے ہیں' مکھی چوس۔۔۔ مارشل کی بیوی کی طرح جو چار دن بھی گھر میں رکھ کر کھلا نہیں سکی تھی اور کیسی کینہ بھری نظروں سے دیکھتی تھی' جب ہم کھانے بیٹھتے تھے تو نوالے گنتی تھی ہمارے اور یہ ایلن یہ تو بڑا ہی دل والا ہے۔ یہ جو جوزی ہے نا اگر ذرا سی بھی لچک دکھائے تو ایلن تو تحفوں کی بھرمار کر دے۔ سڑا ہوا سا کوٹ پہن کر پھرتی ہے' ذرا پیار سے ایلن سے بات کر لے تو وہ شان دار کوٹ لے دے اسے۔ خیر اب تو جوزی بدل رہی ہے اور کچھ سوشل بھی ہوتی جا رہی ہے۔ اگر جو ایلن جوزی سے شادی کر لے تو وارے نیارے ہو جائیں جوزی کے۔ ویسے پال کہتا تو صحیح ہے نا کہ ادھر پاکستان میں تو شادیاں ہوتی ہیں سب کی' مسلم ہوں' ہندو ہوں یا کرسچن سب شادیاں کر کے گھر بساتے ہیں' لیکن یہ گورے بڑے ہوشیار ہیں۔ طلاق کی صورت میں نقصان جو ہوتا ہے بس اسی لیے شادی والا حصہ اپنی زندگیوں سے نکال دیا ہے' بیوی تو مل ہی جاتی ہے' جب دل اکتا جائے دھکا دے کر نکال دو اور دوسری لے آؤ' لیکن ہماری جوزی ایسی نہیں ہے کہ ایلن کا دل بھر جائے۔ یوں بھی ایلن کا دل آگیا ہے جوزی پر' اسی لیے تو کہتا ہے کہ میں اگر جوزی کو راضی کر لوں تو وہ مجھے خوش کر دے گا۔"

اس نے مسکرائی نظروں سے جوزفین کی طرف دیکھا جو اس کی سوچوں سے بے خبر غلام مصطفیٰ کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ کرسمس کی اس رات کے بعد اس نے سینکڑوں بار غلام مصطفیٰ کے متعلق سوچا تھا اور اسے سوچنا اس کے لیے دنیا کا سب سے اہم کام تھا۔ غلام مصطفیٰ۔

گہری سیاہ' بھنورا آنکھوں والا غلام مصطفیٰ پہلے جس کی سیاہ آنکھوں نے اسے متاثر کیا تھا پھر وہ پورے کا پورا اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ پتا نہیں غلام مصطفیٰ میں ایسا کیا تھا کہ اس کا جی بار بار اسے دیکھنے کو چاہتا تھا۔

کرسمس کی اس رات کے بعد اس نے سینکڑوں بار جیسز اور پاک مریم سے اس کے دوبارہ ملنے کی دعا کی تھی اور اس روز وہ مارگریٹ کے ساتھ جاب کا پتا کرنے نکلی تھی۔ مارگریٹ اس کی پڑوسن تھی۔ وہ تقریباً" اس کی ہم عمر تھی اور ایک اسٹور پر جاب کرتی تھی اور فی الحال اکیلی رہ رہی تھی۔ کچھ عرصہ قبل ہی اس کی اپنے پارٹنر سے علیحدگی ہوئی تھی۔ دو دن قبل ہی پارک میں اس کی مارگریٹ سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے جاب کے لیے بات کی تھی اور مارگریٹ نے بتایا تھا کہ اس کے اسٹور پر ایک سیلز گرل کی ضرورت ہے۔ سو وہ اس کے ساتھ اس کے اسٹور کے مالک سے ملنے کے لیے نکلی تھی وہ دونوں ٹیوب اسٹیشن پر کھڑی تھیں جب اس نے غلام مصطفیٰ کو ڈیوڈ کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا وہ نہ جانے کس بات پر ہنس رہا تھا اور ہنستے ہوئے اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ وہ مبہوت سی ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ مارگریٹ نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور اسے چٹکی بھری۔

"دونوں ہی زبردست ہیں پر تیری نظریں کس پر ہیں تاکہ دوسرے کو میں اپنے لیے تاڑلوں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ تو وہ سٹپٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ مارگریٹ کی عادت تھی وہ ذرا ذرا سی بات پر اونچے اونچے قہقہے لگاتی تھی اور اکثر پارک میں لوگ چونک چونک کر اسے دیکھنے لگتے تھے۔

"کون سا؟" وہ پھر پوچھ رہی تھی اس کے ہونٹ ابھی تک تھوڑے کھلے ہوئے تھے۔

"ن۔۔ نہیں۔" وہ ہکلائی تھی۔

"وہ۔ دراصل دونوں فٹ بال کے پلیئرز ہیں۔ میں نے ان کے میچز دیکھے ہیں اور وہ ایک تو ہمارا پڑوسی ہے۔"

"ارے ہاں یہ تو ڈیوڈ ہے۔ ڈیوڈ کیمرون ڈیوی۔۔۔ آرسنل کلب کا پرنس ڈیوی۔"

مارگریٹ نے وہیں کھڑے کھڑے اسے آواز دی۔ "ڈیوڈ!" اور پھر تقریباً" بھاگتی ہوئی اس کی طرف چلی گئی۔

وہ دونوں چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے تھے اور پھر مصطفیٰ کی نظریں اس پر پڑی تھیں تب وہ ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!" اس کی نظروں نے جیسے غلام مصطفیٰ کو حصار میں لیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" اس نے پوچھا تو وہ مسکرائی۔

"فائن! آپ کیسے ہیں؟"

"فائن!" وہ مسکرایا۔

"خوش جمال کیسی ہیں؟" اب وہ اردو میں بات کر رہی تھی۔

"ٹھیک اور خوش۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"اور آپ کے پاپا اور مما؟ وہ کیسے ہیں؟"

"بابا اور اماں بھی خوش اور مگن۔"

اور وہ سوچنے لگی کہ اب وہ کیا بات کرے مصطفیٰ سے وہ جو ہر روز اس سے ملنے کی دعا مانگ کر سوتی تھی۔ آج وہ ملا تھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پتا نہیں اس کے گھر میں ان کے علاوہ بھی کوئی اور ہے یا نہیں۔ خوش جمال نے یا شاید مصطفیٰ نے ہی بتایا تھا کہ ان کے گھر میں وہ چاروں ہی ہیں۔

"ہمارے گھر میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے جن کی خیریت آپ معلوم کریں۔"

وہ جیسے اس کے دل کو پڑھ رہا تھا وہ جھینپ گئی۔

"ویسے اچھی لڑکی! جب کسی لڑکے سے اور وہ بھی مجھ جیسے ہینڈسم لڑکے سے ملتے ہیں تو صرف فیملی کی خیر خیریت نہیں پوچھتے کوئی اور بات بھی کرتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں گہری شرارت تھی۔ اس کے رخسار گل رنگ ہو گئے تھے۔ تب ہی مارگریٹ اسی طرح بھاگتی ہوئی واپس آئی اور اس نے بازو پھیلا کر اپنی کلائی اسے دکھائی۔ جس پر موٹے مارکر سے ڈیوڈ نے اپنے دستخط کیے تھے۔

"لیکن جب تم باتھ لوگی تو یہ آٹوگراف مٹ جائے گا۔"

"تو؟" مارگریٹ نے کندھے اچکائے "جب تک ہے تب تک میں سب کو دکھا کر شو ماروں گی کہ مستقبل کے ڈیوڈ بیکھم نے میری کلائی پر اپنا نام لکھا ہے۔ ڈیوڈ خود کو فیوچر کا ڈیوڈ بیکھم کہتا ہے۔" مصطفٰی جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔

"ہے! فٹ بالر رکو!" اس نے دوسری کلائی آگے بڑھائی۔

"میرا نام غلام مصطفٰی ہے۔" مصطفٰی نے مڑ کر کہا تھا اور پھر تیز تیز چلتا ہوا ڈیوڈ کی طرف بڑھ گیا۔

"ہوں میں تو جیسے مری جا رہی ہوں نا اس کا آٹو گراف لینے کے لیے۔"

مارگریٹ نے ناگواری سے کہتے ہوئے بازو نیچے کر لیا تھا۔ اور مصطفٰی کا وہ شرارت بھرا جملہ کئی دن تک اسے گدگداتا رہا تھا۔

اور پھر دوسری بار وہ مصطفٰی سے اسٹاپ پر جاتے ہوئے ملی تھی۔ اسے مارگریٹ کے اسٹور پر تو نہیں بلکہ کسی اور اسٹور پر جاب مل گئی تھی۔ جو زیادہ دور نہیں تھا۔

جنوری کی وہ صبح بہت دھند آلود تھی۔ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے تھا۔ وہ اپنے سیاہ لانگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے تیز تیز چلتی ہوئی اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ آج اس کی جاب کا پہلا دن تھا اور اسے ڈر تھا کہ وہ پہلے ہی دن لیٹ نہ ہو جائے اس لیے سر جھکا رکھا تھا اور ادھر ادھر سے بے نیاز چلی جا رہی تھی کہ سامنے سے آتے غلام مصطفٰی سے ٹکرا گئی۔ اور جب اس نے سر اٹھایا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"آپ!"

"جی۔ اور یہ آپ صبح صبح آندھی طوفان کی طرح کہاں بھاگی جا رہی ہیں؟" مصطفٰی نے اپنی گھور سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر جما رکھی تھیں۔

"وہ میں جاب پر جا رہی ہوں آج فرسٹ ڈے ہے نا تو اس لیے جلدی میں ہوں کہ کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں۔"

"او اچھا۔ کیسی جاب ہے آپ کی؟ میرا مطلب ہے کہاں جاب ملی ہے آپ کو؟" وہ اس کے سامنے سے ہٹ کر دائیں طرف ہو گیا تھا اور اب ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس طرح پوچھ رہا تھا جیسے پرانا واقف کار ہو۔

"ایک اسٹور پر سیلز گرل کی جاب ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا اس وقت تمہیں اسکول نہیں جانا ہوتا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"جب پاکستان میں تھی تو پڑھتی تھی' وہاں میری ایک کزن ڈاکٹر تھی' دوسری میڈیکل میں تھی اس لیے پاپا کا خیال مجھے بھی ڈاکٹر بنانے کا تھا۔ لیکن پھر ہم یہاں آ گئے اور اب ممی کہتی ہیں کہ مجھے بھی جاب کرنا چاہیے۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے رک کر مصطفٰی کی طرف دیکھا تھا۔

"تمہارے گھر آج کل زیادہ جھگڑے میرے جاب نہ کرنے پر ہو رہے ہیں۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے جاب کر لینے سے تمہاری ممی اور پاپا میں لڑائی نہیں ہو گی۔" وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔

"پتا نہیں شاید نہ ہوں۔"

"پھر ہو سکتا ہے تمہاری ممی کوئی اور وجہ ڈھونڈ لیں لڑنے کی۔" اس نے خیال ظاہر کیا تھا تو اس کے اندر اداسی کا غبار سا پھیل گیا۔

"او کے۔ وش یو گڈ لک۔" وہ اسٹاپ پر پہنچ گئے تھے۔

"اپنا خیال رکھنا۔ ہیو آ نائس ڈے۔"

اس پر ایک نظر ڈال کر وہ واپس پلٹا تھا۔ اور اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ وہ صرف اسے اسٹاپ تک چھوڑنے آیا تھا۔ ورنہ وہ تو سامنے جا رہا تھا

اور وہ رخ موڑے اس وقت تک اسے دیکھتی رہی تھی جب تک وہ نظر آ رہا تھا۔

اور مصطفیٰ سے میری ملاقات پارک میں ہوئی تھی۔ سنڈے تھا وہ گھر میں اکیلی تھی۔ پال اور مارتھا بہت سویرے مارشل کے گھر ملنے چلے گئے تھے۔ کیونکہ مارشل کچھ بیمار تھا۔ اس نے کھڑکی سے مارگریٹ کو پارک کی طرف جاتے دیکھا تو خود بھی گھر لاک کر کے پارک میں آ گئی تھی۔ مارگریٹ اکثر پارک میں جاگنگ کے لیے جاتی تھی۔

مارگریٹ کو اس نے جاگنگ کرتے دیکھا تو خود بینچ پر بیٹھ گئی۔ پارک میں آج سردی کے باوجود کافی رونق تھی۔ زیادہ تر نوجوان اور بوڑھے جاگنگ کر رہے تھے۔

وہ اپنے ہاتھوں کو گرم کرنے کے لیے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ رہی تھی کہ کوئی اس کے پاس بینچ پر آ کر بیٹھ گیا تھا اس نے چونک کر دیکھا وہ مصطفیٰ تھا۔

"السلام علیکم!" اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر مسکرایا تھا۔

"کیسی ہو مس؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا اور اپنی ٹھنڈی ہوتی ناک کو چٹکی سے پکڑ کر اس کے ہونے کو محسوس کیا۔

"آج بہت سردی ہے۔"

"ہوں ہے تو۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"لیکن موسم کے متعلق گفتگو دو اجنبیوں میں ہوتی ہے یا پھر دو بوڑھے جب ملتے ہیں تو عموماً گفتگو کا آغاز موسم سے ہوتا ہے جبکہ نہ میں بوڑھا ہوں نہ آپ کے لیے اجنبی۔"

اس نے کچھ پریشان سا ہو کر اس کی طرف دیکھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔

"ہماری عمر کے افراد جب آپس میں ملتے ہیں تو بھلا وہ کیا بات کرتے ہوں گے۔" اس نے بلند آواز سے سوچا۔

"ہاں اس کے متعلق سوچنا پڑے گا۔" وہ لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن اگر تمہیں موسم پر گفتگو کرنا پسند ہے تو میں موسم کے متعلق بھی اچھی گفتگو کر سکتا ہوں مثلاً" یہ کہ آج موسم بہت خوشگوار ہے۔ سردی کے باوجود ایسا لگ رہا ہے جیسے سارے میں چمک دار دھوپ پھیلی ہوئی ہو۔"

وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی جب خوش جمال آتی دکھائی دی۔

"تم کہاں چلے گئے تھے مصطفیٰ! میں تمہیں ادھر ڈھونڈ رہی تھی۔"

"بعض اوقات بندے کو چیزیں وہاں نہیں ملتیں ڈیئر فرینڈ! جہاں ہم انہیں ڈھونڈتے ہیں۔"

"کیا بات ہے آج کل بڑی ذو معنی باتیں کرنے لگے ہو؟" خوش جمال نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"ہیلو جوزی کیسی ہو؟" خوش جمال اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اور مصطفیٰ کو جاگنگ ٹریک پر دوڑتے بھاگتے دیکھتے ہوئے اس صبح خوش جمال نے اس سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ اپنے بابا کی اماں کی اور مصطفیٰ کی۔ "مصطفیٰ کو عظیم فٹ بالر کے روپ میں دیکھنا ہم سب کا خواب ہے۔"

"ہے۔ جوزی۔" مارتھا نے ناشتہ ختم کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"تمہیں پال نے بتایا اس سنڈے کو ہمیں ایلن نے انوائیٹ کیا ہے۔"

وہ چونک کر پال کی طرف دیکھنے لگی۔ "پال ہولے سے کھنکارا۔

"بات یہ ہے مارتھا کہ اس سنڈے کو جوزی نے کہیں جانا ہے۔ تو تم ایلن سے کہو اگلے سنڈے کا پروگرام رکھ لے۔"

"کیا بات ہے بھئی؟" مارتھا نے کھڑے ہوتے ہوئے تالی بجائی۔ "بچے پر نکل آئے ہیں۔ کس کے

ساتھ ڈیٹ پر جارہی ہو۔"

"نن۔ نہیں۔" جوزفین نے تھوک نگلی۔ "وہ مجھے خوش جمال کے گھر جانا ہے۔ اس نے انوائٹ کیا تھا۔ مجھے۔ اور میں نے اس سے وعدہ کرلیا تھا تو۔"

"اچھا!" مارتھا کا اچھا بہت لمبا تھا۔

"دیکھو پال!" اس نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھا کر پال کی طرف دیکھا۔ "میں نے تمہیں کہا تھا کہ اسے سمجھاؤ۔ دور رکھو اسے مسلمانوں سے۔ وہاں بھی اس کی دوستیاں مسلمانوں سے تھیں اور یہاں بھی اسے مل گئی خوش جمال۔ دیکھ لینا اپنی ماں کی طرح بھاگ کر کسی مسلمانوں سے نکاح پڑھوالے گی۔ اس کا جھکاؤ شروع سے ہی مسلمانوں کی طرف ہے اور اب دیکھ لیا تم نے بھی کرلی اس نے دوستی خوش جمال سے۔"

جوزفین گھبرائی سی کھڑی دستانے اتار اور چڑھا رہی تھی۔

"ہے۔ سنو' جوزی!" مارتھا نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "میں نے بھی ایلین کی دعوت قبول کرکے اس سنڈے کو اس کے ساتھ باہر جانے کا وعدہ کیا ہے۔ تم خوش جمال کو منع کردو۔"

جوزفین نے بے بسی سے پال کی طرف دیکھا' پال نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ٹیبل سے ناشتے کے برتن اٹھا کر سنک میں رکھنے لگا۔

"میں نے کیا کہا ہے جوزی! سن لیا ہے نا تم نے؟" مارتھا اسے گھور رہی تھی۔

"ایلین سے وعدہ تم نے کیا ہے مارتھا؟" پال سنک میں برتن رکھ کر مڑا۔ "اس لیے تم ایلین کے ساتھ چلی جانا آؤٹنگ پر اور جوزی نے خوش جمال سے وعدہ کیا ہے وہ خوش جمال کے گھر چلی جائے گی۔ دونوں اپنا اپنا وعدہ پورا کرلو۔"

اب وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا تمسخر سے مارتھا کو دیکھ رہا تھا۔

"تم!" مارتھا نے دانت پیسے۔ پال نے ایک بار پھر جوزفین کو اشارے سے جانے کے لیے کہا۔ جوزفین تیزی سے باہر نکلی اور مارتھا نے ٹیبل پر رہ جانے والا چمچ اٹھا کر اس کی طرف پھینکا جسے پال نے کیچ کرلیا۔

"تم ویسی عیسائی۔ نالی کے کیڑے۔" مارتھا فل فارم میں آچکی تھی۔

"اور تم تو جیسے ملکہ وکٹوریہ کے خاندان سے ہو۔ لیڈی ڈیانا کی سگی۔ گوجرانوالے کی بہنو۔"

گھر سے نکلتے ہوئے جوزفین نے پال کو کہتے سنا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور پھر یہ آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔ وہ سر جھکائے آنسو پونچھتی تیز تیز چلتی ہوئی اسٹاپ کی طرف جارہی تھی۔

روڈ کے اس طرف اپنی گاڑی کے پاس کھڑے غلام مصطفیٰ نے اسے گھر سے نکلتے ہوئے آنسو پونچھتے دیکھا۔ وہ روڈ کراس کرکے اس طرف جانا چاہتا تھا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟ لیکن پھر اسے یاد آیا کہ جب اس کی ممی اور پاپا میں لڑائی ہوتی ہے تو وہ روتی ہے۔ لگتا ہے آج پھر جوزی کے ممی پاپا کی لڑائی ہوگئی ہے۔ اس نے سوچا اور اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی۔

اور اب وہ بے وقوف لڑکی اسٹاپ پر کھڑے کھڑے رو رہی ہوگی جب کہ پاس کھڑے لوگ اسے حیرت سے دیکھتے ہوں گے لیکن کوئی اس سے نہیں پوچھے گا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ اس نے گھر سے باہر آتی خوش جمال کو دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ بالکونی کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ ٹکائے سامنے دیکھ رہا تھا۔ سامنے روڈ کے اس طرف مکان اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گھروں کے انٹرنس پر مدھم روشنی کے بلب جل رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی کھڑکی کے شیشوں سے ہلکی روشنی آرہی تھی۔ اس کی نظریں جس گھر پر تھیں وہ مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں سرمئی سڑک ساکت اور سوئی ہوئی لگتی تھی۔ وہ بہت دیر سے یونہی کھڑا تھا۔ اس کی نظریں مکانوں کی کھڑکیوں سے ہوتیں

روڈ پر پھیل کر پھر نئے سرے سے کھڑکیوں پر جا لگتیں وہ وہاں کیوں کھڑا تھا؟ نہیں جانتا تھا۔

کیا سوچ رہا تھا! شاید کچھ بھی نہیں۔

اندر کمرے میں بیٹھے بیٹھے یکایک ہی اس کا دل بے حد گھبرایا تھا۔ اور وہ بالکونی کا دروازہ کھول کر یہاں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ لندن کا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کے ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ اس نے ریلنگ سے ہاتھ اٹھائے تو اسے لگا جیسے انگلیاں اکڑ گئی ہوں۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو زور زور سے رگڑ رگڑ کر گرم کرنے کی کوشش کی۔ اور پھر ایک نظر سامنے والے مکان پر ڈال کر وہ واپس مڑا اور کمرے میں آکر بالکونی میں کھلنے والا دروازہ بند کر کے آرام کرسی پر گر سا گیا۔ کمرے میں خوشگوار سی حدت تھی۔ کچھ دیر بعد اس کا سن ہوا چہرہ اور ہاتھ نارمل ہو گئے۔

بالآخر بابا کا خواب پورا ہو گیا تھا۔ وہ مانچسٹر یونائیٹڈ کی جرسی پہننے والا تھا۔

ایلیکس نے اس کے لیے آٹھ نمبر کی جرسی سلیکٹ کی تھی اور ڈیوڈ کے لیے سات نمبر کی' دونوں ہی ٹرائل میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور اس روز بابا نے اسے گلے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔

"آج میرا خواب پورا ہوا جو میں نے عبدالہادی کے لیے دیکھا تھا اور جسے تم نے پورا کیا غلام مصطفیٰ! آج یقیناً" ہادی کی روح خوش ہو گی۔ اب میں روز محشر ہادی سے کہہ سکوں گا۔

"دیکھو عبدالہادی وہ خواب جو۔ ہم تم دیکھا کرتے تھے۔ اسے تمہارے ہادی نے پورا کر دیا۔ نو سال۔ ایک طویل مدت۔"

وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

اس سرد ملک میں آئے نو سال بیت گئے تھے۔ ان نو سالوں میں اس نے محی الدین کا خواب پورا کرنے کے لیے ان تھک محنت کی تھی۔ اور نو سالوں کے اس سفر میں۔

اس نے کئی بار ہمت ہار دی تھی۔ ہر بار فاطمہ اور محی الدین اس کی حوصلہ افزائی کرتے تو گڑیا بھی ان کے ہم قدم ہوتی۔ اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کا کام تینوں نے کیا۔

"تمہیں زندگی میں بہت سے مشکل مقامات سے گزرنا پڑے گا لیکن تمہیں ہمت نہیں ہارنی بہت آگے تک جانا ہے۔" محی الدین اس سے کہتے تھے۔

اپنے ساتھیوں کے رویے اسے ہرٹ کرتے تھے۔ ڈیوڈ وہ واحد لڑکا تھا۔ جس سے اس کی دوستی ہوئی تھی۔ ارسنل کلب میں وہ اس سے پہلے سے کھیل رہا تھا اور عمر میں بھی شاید اس سے تھوڑا بڑا تھا اس نے نہ صرف فراخ دلی سے اسے خوش آمدید کہا تھا' بلکہ دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا تھا۔ جبکہ دوسرے چند لڑکے اسے ناپسندیدگی سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے کوچ فرگوسن کی وجہ سے کبھی کوئی بدمزگی نہ ہوئی تھی۔ فرگوسن ڈیوڈ اور مصطفیٰ پر بہت محنت کر رہا تھا۔

"میں ڈیوڈ بیکھم ثانی ہوں۔" ڈیوڈ ایک خوش مزاج لڑکا تھا اور ہمیشہ خوش گمان رہتا تھا۔

"ایک دن آئے گا جب لوگ ڈیوڈ بیکھم کا کھیل بھول جائیں گے انہیں صرف ڈیوڈ کیمون یاد رہ جائے گا۔" اسے یقین تھا۔

نو سالوں میں اس نے بے شمار میچز کھیلے تھے اور بے شمار کامیابیاں سمیٹی تھیں اور اب نو سال بعد 2009 میں جب رونالڈو مانچسٹر یونائیٹڈ سے علیحدہ ہو رہا تھا تو وہ سائن کرنے جا رہا تھا۔ مانچسٹر یونائیٹڈ نے اس کے ساتھ چار سال کا معاہدہ کرنا طے کیا تھا۔ اور صبح اسے معاہدہ سائن کرنا تھا۔ لیکن ابھی یہ خبر اخبارات تک نہیں پہنچی تھی۔ لوگ ابھی رونالڈو کے جانے کا غم منا رہے تھے۔ فٹ بال کا شہزادہ لندن چھوڑ کر جا رہا تھا اور جوزے نے بڑی ذہانت سے ڈیوڈ اور غلام مصطفیٰ کو اپروچ کیا تھا۔ وہ بہت عرصہ سے ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

وہ محی الدین کا خواب پورا کرنے جا رہا تھا لیکن پھر

بھی اس کا دل بے طرح اداس تھا۔ بہت دیر تک وہ یونہی بے چین سا ٹانگیں پسارے بیٹھا رہا۔ کبھی وہ آرام کرسی کی پشت پر سر رکھ دیتا اور کبھی سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اسے جوزی کا خیال آگیا۔

جوزی، جو گھر سے باہر آکر اس لیے روئی تھی کہ اس کی ممی اور ڈیڈی میں اس کی وجہ سے لڑائی ہوئی تھی۔ ممی جو سوتیلی تھیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے پھر پتا نہیں وہ سوتیلی کیوں ہوتی ہے اسے مشاعل کی ممی یاد آگئیں۔ جو صرف مشاعل اور سنی کی ممی تھیں۔ حالانکہ پاپا نے کہا تھا۔ "یہ تمہاری ممی ہیں ہادی۔"

لیکن وہ اس کی ممی نہیں تھیں۔

اس کے اندر دور تک تلخی گھلتی چلی گئی پھر اسے پاپا یاد آگئے۔

پاپا جنہیں مشاعل کی ممی سے اس کی شکایتیں سن کر غصہ آتا تھا اور پھر وہ اسے ڈانٹتے تھے 'مارتے تھے۔ لیکن بعد میں شاید انہیں افسوس بھی ہوتا ہو گا۔ تب ہی تو اس رات وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ اور پاپا اس سے ناراض ہی دنیا سے چلے گئے تھے۔ کاش۔

اس کی آنکھیں جلنے لگیں تو وہ اٹھ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر وہ یونہی مضطرب سا کروٹیں بدلتا اور سونے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اور چند لمحوں بعد وہ خوش جمال کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ خوش جمال نے دروازہ کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔ "سنو خوش جمال مجھے نیند نہیں آرہی۔ آؤ باتیں کریں۔"

خوش جمال مسکرائی اور مڑ کر بیڈ سے دوپٹا اٹھایا اور باہر نکل آئی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ وہ کتنی بھی تھکی ہوئی ہوتی، مصطفیٰ کو اس نے کبھی کسی کام سے نہ نہیں کہا تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی اور گھر بھر کی گڑیا تھی تب بھی وہ مصطفیٰ کا ایسے ہی خیال رکھتی تھی۔ اور جب وہ کالج میں آگئی تو اس نے سب سے کہہ دیا کہ اب کوئی اسے گڑیا نہ کہے وہ بڑی ہو چکی ہے۔ اور اس کا نام بہت خوب صورت ہے۔ خوش جمال۔ تب بھی وہ مصطفیٰ کا ایسے ہی خیال رکھتی تھی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اس نے مصطفیٰ کا ہر وہ کام بھی اپنے ذمہ لے لیا تھا جو پہلے فاطمہ کرتی تھی۔ دونوں کے درمیان دوستی کا ایک بہت گہرا اور پاکیزہ رشتہ بھی بن گیا تھا۔ اگر کوئی مصطفیٰ سے پوچھتا کہ تمہارا سب سے گہرا دوست کون ہے تو وہ بے دھڑک کہتا۔ "خوش جمال!" اور خوش جمال نے بھی غلام مصطفیٰ کے علاوہ کسی اور کو گہرا دوست نہیں بنایا تھا۔ ملنے ملانے اور تعلق والے بہت تھے لیکن دوست صرف غلام مصطفیٰ ہی تھا۔

"تم ایکسائیٹڈ ہو رہے ہو مصطفیٰ! کیونکہ صبح تمہیں مانچسٹر یونائیٹڈ سے معاہدہ سائن کرنا ہے۔" اس نے لاؤنج میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاید!" مصطفیٰ بھی بیٹھ گیا۔ "لیکن میں ایکسائیٹڈ سے زیادہ اداس ہوں پتا نہیں کیوں۔"

خوش جمال نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ اس کی بے حد خوبصورت سیاہ آنکھوں میں بلا کا اضطراب تھا اور وہ بہت بے چین اور مضطرب لگ رہا تھا۔

"تمہیں اپنا گھر اور اپنے پاپا یاد آرہے ہیں مصطفیٰ۔"

ایک افسردہ سی مسکراہٹ مصطفیٰ کے لبوں پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ لیکن اس نے خوش جمال کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

خوش جمال اٹھ کر لاؤنج سے ملحق کچن میں چلی گئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ بھاپ اڑاتی کافی کے دو مگ اور ساتھ میں کاجو اور پی نٹ کے جار لے کر آگئی تھی کافی ٹیبل پر ٹرے رکھ کر اس نے کافی کا کپ مصطفیٰ کو پکڑایا۔

"ہاں تو تم اداس ہو مصطفیٰ اور یہ کوئی ان نیچرل بات نہیں ہے ہر خوشی کے موقع پر اپنے یاد آتے ہیں۔ ہر غم، ہر دکھ میں ان کا خیال آتا ہے۔ وہ جو بچھڑ گئے انہیں بھلایا تو نہیں جا سکتا مصطفیٰ! اماں، پاپا اور میں تمہیں، بکر، عبدالہادی کو تو نہیں بھولے، وہ ہر وقت ہر لمحہ ہمیں یاد رہتا ہے۔" مصطفیٰ کی آنکھوں کی حیرت واضح

تھی۔

اس نے ابھی سوچا تھا کہ اگر میں خوش جمال سے کہوں گا کہ مجھے اپنے پاپا اور ماما یاد آرہے ہیں تو شاید اسے برا لگے شاید وہ سوچے کہ مجھے اماں اور بابا کی محبت میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اور یہ۔ یہ لڑکی کتنی بڑی جادوگر ہے' کیسے اس کے دل کی ہر بات جان لیتی ہے اور یہ صرف آج کی بات نہیں تھی ہمیشہ سے ہی وہ اس کے دل کی بات جان لیا کرتی تھی۔

"اگر ہمیں ہمارے اپنے یاد آتے ہیں تو یہ تو نیچرل ہے۔ وہ تو ہمارے وجود کا حصہ ہوتے ہیں اگر ان کی یاد سے ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں تو ہمیں خود کو رونے سے منع نہیں کرنا چاہیے۔ تم اگر رونا چاہتے ہو تو رو لو اچھا ہے تمہارے اندر اس وقت جو گھٹن ہے وہ ختم ہوجائے گی جیسے بادل برس جائیں تو آسمان صاف ہوجاتا ہے۔"

اس نے آہستہ سے سہلایا اور اس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔

"ہاں خوش جمال! مجھے پاپا بہت یاد آرہے ہیں اور ماما بھی۔" اس نے اعتراف کیا۔

"یہ ان کا حق ہے تم پر کہ تم انہیں یاد کرو۔ اگر چند بار وہ تم سے خفا ہوئے تھے تو بہت بار انہوں نے تمہارے لاڈ بھی اٹھائے ہوں گے۔ اگر کبھی انہوں نے تمہیں مارا تھا تو بہت بار انہوں نے تمہیں پیار بھی کیا ہوگا۔ تم چاہو تو ان کی یادیں مجھ سے شیئر کرسکتے ہو مصطفی!"

خوش جمال کو بات کرنے کا قرینہ آتا تھا اس نے پھر سہلایا اور گھونٹ گھونٹ کافی پیتے ہوئے پاپا کی باتیں کرنے لگا۔ ماما کے متعلق اسے بہت کم یاد تھا۔ بس ان کی چھوٹی چھوٹی کوئی بات ذہن میں آجاتی تھی تو وہ اسے خوش جمال کو بتاتا۔ خوش جمال بہت دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

جب پاپا نے شادی کی تو وہ نئی ممی کے ساتھ آئی تھی۔ مشاعل۔ لیکن مجھے اس کا آنا اچھا نہیں لگا تھا' کیونکہ ممی نے میرا روم اسے دے دیا تھا۔ وہ اچھی لڑکی تھی خوش جمال! وہ اپنی ممی جیسی نہیں تھی۔" پتا نہیں کیوں اتنے سالوں بعد وہ اسے یاد آگئی تھی۔

"اس نے مجھ پر بہت بار احسان کیا تھا۔"

اب وہ اسے بتا رہا تھا کہ کب کب اور کس کس طرح مشاعل اس کی مدد کرتی تھی۔ اور خوش جمال دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکائے اسے سن رہی تھی۔ اس کے لیے مصطفی کو سننا شاید دنیا کا سب سے اہم کام تھا اور وہ یہ اہم کام کررہی تھی۔ اور یہ آج سے نہیں تھا ہمیشہ سے تھا اسے مصطفی سے بات کرنا اسے سننا اچھا لگتا تھا۔ شروع شروع میں جب وہ سوچ سوچ کر ٹھہر ٹھہر کر بات کرتا تھا تب بھی اس کا بولنا اسے اچھا لگتا تھا اور جب وہ روانی سے بات کرنے لگا تب بھی۔ جب محی الدین پہلی بار اس کا ہاتھ پکڑے گھر میں داخل ہوئے تھے تو اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ تمہارا بھائی ہے۔ اور یہ اب یہاں ہی رہے گا۔"

اور اس نے خوشی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور وہ ہمیشہ اس کا ہاتھ تھامے رکھنا چاہتی تھی' یہ اس وقت وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ بہت سہما ہوا اور خوف زدہ لگتا تھا۔ وہ بہت پیارا تھا۔ اور اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ گہری سیاہ آنکھیں۔ عبدالہادی کے بعد وہ بہت اکیلی ہوگئی تھی۔ عبدالہادی اس کا بہت خیال رکھتا تھا اور بہت پیار کرتا تھا۔ حالانکہ وہ خود بہت بڑا نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کے ناز بڑے بھائیوں کی طرح ہی اٹھاتا تھا اور وہ اسے بھول ہی نہیں پاتی تھی بھول سکتی بھی نہیں تھی' جب اس کی سہیلیاں اپنے بھائیوں کی باتیں کرتیں تو اس کے اندر برسات ہونے لگتی اس کا بھائی نہیں تھا۔ موت نے اسے اس سے جدا کردیا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنی نم پلکیں اپنی سہیلیوں سے چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ عبدالہادی سے وہ ہر بات کرتی تھی وہ اس کی ہر بات چھوٹی سے چھوٹی اور

بے معنی بات بھی بہت توجہ سے سنتا تھا اور اب عبدالهادی نہیں تھا، تو اس کے اندر باتوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔ وہ اماں اور بابا سے یہ باتیں کبھی نہیں کر سکی تھی اس لیے نہیں کہ وہ اسے چاہتے نہیں تھے اور اس کا خیال نہیں رکھتے تھے بلکہ اس لیے کہ ان کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ بابا گھر آتے تو تھکے ہوئے ہوتے تھے اور اماں کو تو عبدالهادی کے دکھ نے ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ وہ آج ہی وہ ساری باتیں اس سے شیئر کرے، وہ سب بتائے جو ہادی کو بتایا کرتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کی باتیں اور اپنے ٹیچرز کی۔ اسے اپنی البم دکھائے، اپنے اسکیچز دکھائے، جو اس نے عبدالهادی کے بعد بنائے تھے۔

لیکن بابا نے کہا تھا کہ وہ بیمار تھا اور کمزور ہے ابھی اسے آرام کرنے دو۔ وہ اس سے تقریباً" ایک سال چھوٹا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ اس کا ایسے ہی خیال رکھے گی جیسے عبدالهادی اس کا خیال رکھتا تھا۔ اور وہ اس کا خیال رکھنے لگی یوں گویا اس کا سایہ بن گئی ہو۔ جب جب وہ رویا اس نے اس کے آنسو پونچھے، وہ ڈگمگایا تو ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا۔

ایک وقت آیا کہ وہ بھی اس کا ایسا ہی خیال رکھنے لگا جیسے وہ رکھتی تھی۔ وہ اگر اس کی فکر کرتی تھی تو اسے بھی اس کی فکر ہوتی تھی۔ وہ اس کے لیے پریشان ہوتی تو وہ بھی اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا۔ ذرا سا فلو ہوتا اسے تو اس کے کمرے میں بیٹھا رہتا اور ایک روز جب وہ سارا کے گھر سے آ رہی تھی تو ایک سنسان گلی میں ایک لڑکے نے اس کا دوپٹا کھینچا اور پرس چھین لیا۔ اتفاق سے مصطفےٰ نے گلی میں داخل ہوتے اسے دیکھ لیا اور مار مار کر اس کا حشر کر دیا۔ اور اس روز اسے لگا تھا کہ اب مصطفےٰ نہ صرف اپنا خیال رکھ سکتا ہے بلکہ اس کا بھی رکھ سکتا ہے، اور اس روز لمحہ بھر کے لیے اس کے ذہن میں آیا تھا کہ انہیں۔ ان تینوں کو ممی ایدین، فاطمہ اور وہ، انہیں کسی اور شخص کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان کے پاس مصطفےٰ ہے۔ سو یونیورسٹی میں بھی اس کی کسی اور کے ساتھ خاص دوستی نہ تھی۔ لیکن اس روز اسفند اور وہ لیب کی طرف جا رہے تھے۔ اسفند اور وہ ایک مشترکہ پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے اس پروجیکٹ میں ان کے ساتھ سانچی اور علی بھی تھے اسفند لندن میں ہی پیدا ہوا تھا، اور بہت سچا کھرا اور صاف گو تھا۔ وہ سیدھی بات کرتا تھا بغیر کسی ہیر پھیر کے۔

"سنو خوش جمال!" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے؟"

"ہاں کہو!" وہ چلتے چلتے اپنی فائل کی ورق گردانی بھی کر رہی تھی کہ ان تینوں سے وہ پوائنٹ ڈسکس کرنے تھے، جو رات ہی اس نے تیار کیے تھے۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

پہلے اس کے فائل کی ورق گردانی کرتے ہاتھ رکے تھے پھر قدم ٹھہرے تھے۔ اس نے اسفند کی طرف دیکھا۔ وہ ایک اسمارٹ لڑکا تھا، ہلکے گھنگریالے بالوں اور خوب صورت آنکھوں والا، وہ ذہین اور سنجیدہ سا بھی تھا۔ اس نے کبھی اسے فضول سرگرمیوں میں ملوث نہیں دیکھا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک بہترین انسان تھا۔

"خوش جمال! ہر روز جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جسے میری زندگی کا ساتھی بننا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے۔ صرف پسندیدگی یا محبت، لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے اندر یہ خواہش شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ تم صرف تم ہی وہ لڑکی ہو خوش جمال! جو میری زندگی میں اجالے بکھیر سکتی ہو۔"

اور خوش جمال نے کھلی ہوئی فائل کے درمیان انگلی رکھی اور فائل بند کر کے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، اسفند ایسا تھا کہ کوئی بھی لڑکی اسے اپنی زندگی میں شامل کر کے فخر محسوس کرتی۔ اس وقت اس کی جگہ یہاں کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید خوشی سے کھل اٹھتی۔ لیکن وہ ساکت کھڑی تھی، اس کے دل میں کہیں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ معمول کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

"خوش جمال!" اسفند کی آواز بہت خوب صورت تھی۔ "تم اگر میرے بارے میں مزید جاننا چاہو۔ جتنا تم جانتی ہو' اس سے زیادہ تو پوچھ سکتی ہو۔ میرے ڈیڈ ڈاکٹر ہیں اور مام ہاؤس وائف۔"

اب بھی وہ ساکت کھڑی تھی' لیکن اس نے اسفند کے چہرے سے نگاہیں ہٹالی تھیں۔

"تم چاہو تو کچھ وقت لے لو۔ سوچ لو۔ میرے متعلق کچھ معلوم کروانا چاہو تو کروالو۔"

"سوری اسفند! میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

اسفند کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اسے خود پر یقین تھا کہ کوئی لڑکی اسے رد نہیں کر سکتی بھلے وہ خوش جمال ہی کیوں نہ ہو۔

"وہ کون خوش نصیب ہے خوش جمال؟" اسفند کی آواز دھیمی تھی' شکست خوردہ سی۔

"مصطفیٰ!" مصطفیٰ کا نام غیر ارادی طور پر بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ وہ خود ششدر سی رہ گئی تھی' لیکن دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ وہ دھڑکنیں' جو یونی کی بے شمار لڑکیوں کے آئیڈیل اور ہیرو کے پروپوزل پر' کس سے مس نہیں ہوئی تھیں۔ صرف مصطفیٰ کا نام لینے پر اودھم مچائے ہوئے تھیں۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے وہاں ہی کھڑی رہ گئی تھی اور وہ سر جھکائے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس روز مصطفیٰ کے لیے اس کے دل میں موجود احساس کے معنی بدل گئے تھے اور اس کی محبت کے جس رنگ میں وہ رنگی ہوئی تھی' اس پر کسی نے ہولی کے رنگ پھینک دیے تھے جیسے اب مصطفیٰ کی طرف اس کی نگاہیں اٹھتیں تو ان میں جلتے دیے کسی الوہی محبت کی روشنی کی لو دیتے۔ لیکن مصطفیٰ کو ابھی تک ان بدلتے رنگوں کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ بے طرح مصروف رہتا تھا۔ پڑھائی' کلب' جم اور وہ پڑھائی ختم کر کے جاب بھی کرنے لگی تھی اور فاطمہ کو اب اس کی شادی کی فکر نے گھیر لیا تھا۔ لیکن وہ ہر آنے والے رشتے کے لیے منع کر دیتی۔

"ابھی نہیں اماں' پلیز کچھ دن اور' اچھا مصطفیٰ مانچسٹر یونائیٹڈ جوائن کر لے پھر۔"

اور اب نہ صرف مصطفیٰ مانچسٹر یونائیٹڈ کا حصہ بن گیا تھا' بلکہ چار سال کا معاہدہ کرنے بھی جا رہا تھا' وہ اب بھی شادی کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی۔

گھڑی نے تین کا گھنٹہ بجایا تو مصطفیٰ نے چونک کر خوش جمال کی طرف دیکھا جو دائیں ہاتھ کی کہنی گھٹنے پر ٹکائے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں تھوڑی ٹکائے چمکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"سوری خوش جمال! تین بج گئے اور مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔"

"مجھے تمہیں سننا اچھا لگ رہا تھا۔ پہلی بار تم نے مشاعل اور اپنے پاپا کے متعلق مجھ سے اتنی باتیں کیں۔ ویسے مشاعل دیکھنے میں کیسی تھی۔"

"وہ بہت پیاری تھی' اس کی آنکھیں اور بال سنہری مائل بھورے تھے اور اس کا کلر تمہارے جیسا فیئر نہیں تھا بلکہ سانولا تھا' لیکن وہ جالی کے پریوں جیسے فراک پہنے بالکل کسی فیری ٹیل کی نیک دل پری لگتی تھی' جب رات کو اپنی ممی سے چوری مجھے کچھ کھانے کو دینے کے لیے میرے کمرے میں آتی تھی۔"

مصطفیٰ کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگین سوری خوش جمال! کہ میں نے تمہاری نیند خراب کی۔"

"میری نیند خراب نہیں ہوئی' لیکن تم نے بار بار سوری کر کے مجھے تکلیف دی ہے۔" اس کے لہجے سے دکھ جھلکتا تھا۔

"نہیں۔" مصطفیٰ نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ "اگر تمہیں میرے سوری کرنے سے تکلیف ہوئی ہے تو میں اپنا سوری واپس لیتا ہوں۔ میں تمہیں بالکل بھی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا اور میں زندگی میں کبھی بھی تکلیف دینا نہیں چاہوں گا۔ تم' بابا اور اماں۔ تمہیں تکلیف دینے سے پہلے خود مرجانا پسند کروں گا خوش جمال یہ ہمیشہ یاد رکھنا۔" وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"میں جانتی ہوں مصطفیٰ! ہمارے درمیان سوری اور تھینک یو والی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارا ایک

دوسرے پر حق ہے ہم چاہو تو ساری رات مجھے جگا سکتے ہو اور اگر میں کہوں کہ تم ساری رات یہاں کھڑے رہو تو مجھے یقین ہے تم کھڑے رہو گے۔"

"ہاں تمہارا یقین درست ہے یہیں کھڑا رہوں گا۔" مصطفیٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "ساری رات بغیر کوئی گلہ شکوہ کیے۔"

"اور میں تمہیں اس طرح کھڑا کرنے پر ہرگز سوری نہیں کہوں گی جیسے آج تم نے کہا۔"

"اچھا کہا نا میرا سوری واپس کردو۔"

"نہیں۔ اسے میں کسی اور موقع کے لیے رکھ لیتی ہوں سنبھال کر جب تم سوری نہ کرو اور مجھے لگے کہ تمہیں مجھ سے سوری کرنا چاہیے تھا۔"

"تم بہت عجیب ہو خوش جمال۔" وہ ہنس دیا۔

"اوکے اب تم جا کر کچھ دیر سو جاؤ۔ نو بجے تک تمہیں اولڈ ٹریفڈ کے لیے نکلنا ہے۔"

"ٹھیک ہے گڈ نائیٹ سوئیٹ ڈریمز۔"

اس نے خوش جمال کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں دیے سے جگمگا رہے تھے اور وہ ہونٹوں پر بڑی انوہی سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے میں کچھ تھا۔ کچھ مختلف۔ لیکن کیا؟ وہ سمجھ نہیں پایا اور اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

مارتھا ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی اور اس کی تیز نظریں جوزفین کے اندر تک اتر رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں بلا کی چبھن تھی اور جوزفین بے حد بے چینی محسوس کر رہی تھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو یہ بات مارتھا کے موڈ کو اور بھی خراب کرے گی۔

اسے مصطفیٰ کے گھر جانا تھا۔ آج خوش جمال کا برتھ ڈے تھا اور خوش جمال نے اسے بتایا تھا کہ مصطفیٰ صرف اس کا برتھ ڈے وش کرنے کے لیے گھر آ رہا ہے اور یہ کہ وہ کوئی برتھ ڈے وغیرہ نہیں مناتے بس بابا کیک لے آتے ہیں اور اماں کچھ گھر میں بنا لیتی ہیں اور ہم چاروں مل کر ایسے ہی ایک دوسرے کا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ لیکن اس بار اس نے اسے بھی بلایا تھا اور اس نے اس کے لیے بہت خوب صورت چھوٹی سی کرسٹل کی باسکٹ لی تھی جسے مارتھا ہتھیا چکی تھی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ مارتھا نے اسے گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا اور پھر ہاتھ پکڑ کر تقریباً" کھینچتی ہوئی اندر لے آئی تھی اور اگر وہ ضد کر کے چلی بھی جاتی تو اس کا مطلب ایک زبردست لڑائی۔ لڑائی جس سے وہ گھبراتی اور ڈرتی تھی۔ اس لیے وہ بیٹھی ہوئی تھی اور اپنے کمرے میں جانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی اور مارتھا کی چبھتی نظریں جیسے اس کے اندر چھید کیے دیتی تھیں، لیکن وہ وہاں بیٹھنے پر مجبور تھی۔

خوش جمال سے تو خیر وہ معذرت کرلے گی اور اس کے لیے نیا گفٹ خرید لے گی، لیکن مصطفیٰ کو وہ کیسے دیکھ پائے گی، وہ تو اپنے ٹریننگ سیشن کی وجہ سے ہفتوں آتا تھا ایک آدھ دن کے لیے اور یہ زیاں ایسا تھا جس پر اس کا دل تڑپ رہا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری جاتی تھیں۔ آج کل وہ دو جگہ کام کر رہی تھی کیوں کہ پاپا پاکستان جانا چاہتا تھا، دادا بیمار تھے ان سے ملنے کے لیے اور اسے ٹکٹ کے لیے پیسے جمع کرنا تھے، وہ بہت تھک جاتی تھی اور اب پتا نہیں مارتھا کتنی دیر اسے بٹھائے رکھتی۔

وہ ہونٹ بھینچے ابھی تک اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک سال سے اس نے ایلن سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ جوزی کو اس کے ساتھ رہنے پر راضی کرلے گی اب تو ایلن بھی بے زار نظر آنے لگا تھا بلکہ اس کی گرل فرینڈ بھی اس کے ساتھ رہ رہی تھی مارتھا کے بار بار فون کرنے پر وہ آتا تھا اور وہ بھی خالی ہاتھ، لیکن وہ مارتھا تھی۔ جانتی تھی کہ اگر آج جوزی ایلن پر مہربان ہو جائے تو وہ پہلے جیسا ایلن بن جائے اس نے اس کی آنکھوں میں اب بھی جوزی کی طلب دیکھی تھی۔ یہ طلب ختم نہیں ہوئی تھی۔ ذرا سی ریڈ سگنل دکھانے کی ضرورت تھی، لیکن یہ جوزی۔ اس نے دانت پیسے۔

اگرچہ وہ دو تین بار ایلین کے ساتھ باہر گئی تھی' لیکن وہ ایلین سے بے تکلف نہیں ہو سکی تھی۔ بہت دیر گھورنے کے بعد مارتھا نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

"سنو جوزی! ہم پاکستان میں نہیں رہتے۔ سو جیسا دیس ویسا بھیس۔" اس کا لہجہ نرم تھا' لیکن لبوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ "اب تم اپنا ٹھکانا کرلو۔ ہم کب تک تمہارا بوجھ اٹھائیں گے۔"

"لیکن میں۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ "میں ایک سال سے تو جاب کر رہی ہوں اور ساری پے آپ کو دیتی ہوں اپنے رہنے اور کھانے کا بل۔"

"رہنے دو۔ بی بی۔ یہ بل ول۔" مارتھا نے اس کی بات کاٹی۔ "ہمارے سر پر سواری مت کرو۔ جدھر جی چاہے جاؤ۔ چاہو تو ایلین کے پاس چلی جاؤ بس ہمارے گھر سے نکلو۔"

"کس کو گھر سے نکال رہی ہو مارتھا؟" پال نے لاؤنج میں قدم رکھا اور پھر اس کی نظر جوزفین پر پڑی جو سہمی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

"جوزی کو۔" پال نے جوزفین کی طرف اشارہ کیا اور پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا مارتھا کے سامنے جاکھڑا ہوا۔

"تم... بیگم تم نکل جاؤ اس گھر سے۔" اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

"اور آج کے بعد میری بیٹی کو گھر سے نکلنے کے لیے مت کہنا ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟" مارتھا چمک کر بولی۔

"میں مارشل سے کہہ کر تمہارے کاغذات ضائع کروادوں گا اور پھر تم دیکھتی رہنا انگلینڈ میں رہنے کے خواب۔" مارتھا ایک لمحہ کے لیے دھک سی رہ گئی۔ اس کا پاسپورٹ اور سارے لیگل ڈاکیومنٹس مارشل کے پاس تھے۔ اور آج کل میں انہیں برٹش پاسپورٹ ملنے والے تھے۔ پال نے ٹھیک اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے فوراً" پینترا بدلا۔

"پال! تم نے تو آنکھیں بند کر رکھی ہیں' لیکن میں تمہاری طرح آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ آنکھیں کھولو پال۔"

پال نے اپنی بند ہوتی آنکھیں پوری کوشش سے کھولیں اور صوفے پر پڑے وال پیپر ایک طرف کرتے ہوئے صوفے پر گر سا گیا۔ وہ دو دن سے کام پر نہیں جارہا تھا۔ پورے گھر میں وال پیپر لگانے اور مرمت کرنا تھی۔ کئی جگہ کا پینٹ خراب تھا' سو وہ سارا دن سیڑھی پر ٹنگا رہ کر بے حد تھک چکا تھا اور صرف آرام کرنا چاہتا تھا۔ تھکن دور کرنے کے لیے اس نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی اور بستر پر لیٹا ہی تھا کہ مارتھا کی آواز سن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مارتھا بھی اس کی پوری دشمن تھی اسے اپنا وہ سرخ چھوٹی اینٹوں والا گرجے سے منسلک گھر یاد آیا۔ اس کا سرسبز لان اور ڈھیروں پھول۔

"آہ" اس کے لبوں سے آہ نکلی۔

"تم صرف آہیں بھر سکتے ہو پال! اپنی بیٹی کو نہیں روک سکتے جو صبح و شام اس لڑکے مصطفیٰ کے گھر کے چکر لگاتی ہے۔" مبالغے میں بھی مارتھا کو کمال حاصل ہے۔ جوزفین نے سوچا۔ "چکر چلا رکھا ہے اس نے مصطفیٰ کے ساتھ۔"

مصطفیٰ کے نام پر جوزفین کی ایک دھڑکن جیسے مس ہوئی تھی اور اندر دور تک خوشبو سی بکھر گئی تھی۔

"مارتھا! خوش جمال اس کی فرینڈ ہے' تم خواہ مخواہ الزام تراشی مت کیا کرو۔" وہ وال پیپر کا ایک ٹکڑا اٹھا کر ڈیزائن دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں' خوش جمال اس کی دوست ہے احمق آدمی! خوش جمال کا تو پردہ ہے' اس کی آڑ میں یہ اس غلام مصطفیٰ سے ملتی ہے کب تک آنکھوں پر پٹی باندھے رکھو گے۔"

"بکو مت!" پال نے اسے جھڑکا۔

"ممی! وہ مصطفیٰ تو بہت کم گھر پر ہوتا ہے۔ وہ تو کوالیفائنگ راؤنڈز کے میچز میں بزی رہتا ہے اور میں تو خوش جمال..." جوزفین نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" مارتھا نے غصے سے کہا تو غیر ارادی طور پر جوزفین کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"کیا؟" مارتھا نے اٹھ کر اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ "کیا میں جھوٹی ہوں؟"

"ممی پلیز' میرے بال چھوڑیں۔" اس نے بال چھڑانے کی کوشش کی۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"چھوڑو۔۔۔ چھوڑو میری بیٹی کو نہیں تو میں پولیس کو فون کرتا ہوں کہ تم میری بیٹی پر تشدد کر رہی ہو؟" پال اٹھتے ہوئے دھاڑا۔

اس نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹکرائی۔

"تمہیں مسئلہ کیا ہے مارتھا؟" وہ جوزفین کے قریب آیا تھا اور اس کے بالوں کو ہولے ہولے سہلا رہا تھا۔

"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے' مسئلہ تمہیں ہو گا پال! جب یہ اس مصطفیٰ سے شادی کرلے گی۔ اپنی ماں کی طرح مسلمان سے عشق اس کے خون میں ہے۔ پادری کی پوتی ہو کر جب یہ شادی رچالے گی اس سے تو ہمارے ہی نہیں' ہمارے پورے خاندان کے منہ پر کالک تھپ جائے گی۔"

وہ صحیح کہہ رہی تھی اسے غلام مصطفیٰ سے عشق تھا اور یہ عشق آج تو نہیں ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس عشق کا بیج بہت پہلے اس کے دل کی زمین پر نمو پا چکا تھا' شاید اس کی پیدائش سے پہلے جب روحیں تخلیق ہوئی تھیں۔ اور اب تو جڑیں پھیل چکی تھیں اور وہ ایک تناور درخت بن گیا تھا' لیکن یہ بات وہ مارتھا سے یا پال سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

"بس اب اور کچھ مت کہنا ورنہ ایک لگاؤں گا۔ منہ ٹیڑھا کردوں گا تمہارا۔" نشے میں آکر وہ بہادر ہو جاتا تھا۔ مارتھا صرف اسے گھور کر رہ گئی۔

"میں اپنی بیٹی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ ایک سچی کرسچن ہے۔ پیور عیسائی۔" غیر ارادی طور پر جوزفین نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ "اور یہ بھی جانتی ہے کہ اس کا دادا پادری ہے۔ پورے ضلعے کے کرسچن اس کی عزت کرتے ہیں۔"

اس نے بہت مان سے جوزفین کی طرف دیکھا اور اس کے اندر جلتے دیئے بھڑک کر بجھے تھے اور شدت کرب سے اس نے آنکھیں میچتے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلا۔

اس ایک سال میں وہ بہت بار خوش جمال کے گھر گئی تھی' لیکن مصطفیٰ سے صرف چند بار ملاقات ہوئی تھی اور ہر بار اس کا نقش پہلے سے زیادہ گہرا ہوا تھا اور ہر بار اسے لگا تھا جیسے وہ مصطفیٰ کو صدیوں سے جانتی ہو۔ وہ سب سے مختلف تھا۔ ایلین' ڈیوڈ' مری سب سے مختلف اس کی آنکھوں سے پسندیدگی جھلکتی تھی' لیکن ان میں ہوس کا رنگ نہیں تھا۔ شفاف' پاکیزہ آنکھیں۔۔۔ سلجھی ہوئی باتیں۔

"ہوں!" مارتھا نے تیز نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا اور پھر کھٹ کھٹ کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

"سنو جوزی!" پال اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ "میں نے پاکستان فون کیا تھا زری ایک بار روزی کو ملی تھی۔۔۔ روزی کے پاس اس کا نمبر ہے۔ اس نے دیا تھا' لیکن اسے یاد نہیں کہ اس نے کہاں لکھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی تلاش کرے گی۔ نمبر مل گیا تو پھر تم چلی جانا اپنی ممی کے پاس۔" اس نے ہچکی لی۔

"یہ عورت۔۔۔ یہ کسی روز تمہیں بیچ دے گی۔" اس نے گالی دی۔ "یہ اس قابل نہیں تھی کہ ایک پادری کی بہو بنتی گوجرانوالے کی بہو۔ ایک دم جھوٹی مکار۔" اس نے پھر گالی دی۔

"کہتی ہے تم خوش جمال سے ملنے نہیں جاتی ہو۔ مصطفیٰ کے ساتھ ڈیٹ پر جاتی ہو۔ میں دیکھتا ہوں اسے۔۔۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ اٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔

"نہیں پاپا۔۔۔ پلیز نہیں۔" جوزی نے دوڑ کر اسے پکڑا۔

"پیچھے ہٹو۔ مت روکو مجھے۔ وہ عورت تمہاری

دشمن ہے۔"

اس نے ہاتھوں سے جوزفین کو پیچھے کیا' لیکن خود لڑکھڑا کر نزدیکی صوفے پر گر گیا اور پھر وہاں ہی ڈھیر ہو گیا۔ جوزفین نے جلدی سے اس کے سر کے نیچے کشن رکھا۔ اس کے جوتے اتارے' اس کے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ وہ شوگر کا مریض تھا اور سیڑھی پر سارا دن کھڑا رہ کر کام کرتا رہا تھا۔ جوزفین ہولے ہولے اس کے پاؤں دبانے لگی۔

"غلام مصطفیٰ۔ کیسا لڑکا ہے جوزی؟" پال نے پوچھا۔

"بہت اچھا پلیئر ہے۔ آپ نے اس کے میچز دیکھے ہیں نا۔"

"ہاں' لیکن پلیئر کے علاوہ۔"

"اچھا ہے۔ اس کے بابا' اماں اور خوش جمال سب بہت اچھے ہیں۔ آپ یقین کریں میں خوش جمال سے ملنے جاتی ہوں بس۔ وہ اپنے میچز میں مصروف رہتا ہے۔ بس کبھی کبھی گھر ہوتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ تم اپنا مذہب چھوڑے بغیر بھی اس سے شادی کر سکتی ہو' لیکن دیکھو۔" اس نے ہچکی لی۔

"تم پھر بھی اس سے شادی نہیں کرو گی۔"

"نہیں کروں گی بابا!" اسے کچھ دیر پہلے پال کی اپنی طرف مان سے دیکھتی نظریں یاد آئیں۔

"تم اچھی لڑکی ہو۔ مجھے تمہیں تمہاری ممی کے پاس سے نہیں لانا چاہیے تھا۔"

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ ہولے ہولے کچھ کہہ رہا تھا۔ جوزفین کی سمجھ میں نہیں آیا تھا' وہ اب اس کے بازو دبا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے' وہ رو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے اور غلام مصطفیٰ کے راستے الگ ہیں ان کی منزل کبھی ایک نہیں ہو سکتی' لیکن پھر بھی وہ اندھا دھند اسی راستے پر بھاگتی جا رہی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بے دم ہو کر راستے میں ہی گر جائے گی' کبھی اس تک نہیں پہنچ پائے گی۔ وہ خود کو روک نہیں پا رہی تھی۔

پال' اس کا تایا' مارشل' اس کے دوسرے چچا' پھوپھیاں اور اس کا دادا جو پادری تھا کوئی بھی پسند نہیں کرے گا کہ وہ ایک مسلمان سے شادی کرلے' لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی جو ہمک ہمک کر مصطفیٰ کی طرف لپکتا تھا۔ اس کے آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے۔ پال نے ذرا سی آنکھ کھول کر اسے دیکھا اور اسے اندر کہیں ادراک ہوا کہ وہ کیوں رو رہی ہے' لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا اس کا پورا ایک خاندان تھا۔ سب اٹھ کھڑے ہوتے ان کے خلاف اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور بے بسی کا ایک گہرا احساس اس کے اندر پھیلتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

مارچ کے ان آخری دنوں میں لندن کا موسم بہت خوشگوار تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اولڈ ٹریفرڈ سے آیا تھا۔ اگلے چند دنوں میں یہ ہونے والا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ سلیکٹرز کے منتخب کرنے والے تھے' لیکن جلد ہی یورپین چیمپنز لیگ کے لیے کھلاڑیوں کے ناموں کا اعلان ہونے والا تھا۔ وہ بہت پر امید تھا۔ پچھلے سارے میچز میں اس کی کارکردگی بہت اچھی رہی تھی۔ اخبارات نے اسے سراہا تھا اگرچہ اسے کچھ مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ ابتدائی میچز میں اس کے خلاف "پاکی" کے نعرے بھی لگے تھے' لیکن محی الدین نے کہا تھا اسے کمزور نہیں پڑنا یہی لوگ ایک دن تمہیں تسلیم کریں گے۔ مانچسٹر یونائیٹڈ کے میچز نے بھی اسے حوصلہ دیا تھا۔ کیوں کہ اس کی نظر صرف اہلیت پر تھی اس کے نزدیک اہم یہ تھا کہ مانچسٹر یونائیٹڈ نے جیتنا ہے۔ ڈیوڈ کی کارکردگی انگلش پریمیر لیگ اور مانچسٹر یونائیٹڈ چیمپنز لیگ میں کچھ اچھی نہیں رہی تھی جس کا اسے بے حد افسوس تھا۔

ڈیوڈ اس کا واحد دوست تھا اور وہ چاہتا تھا کہ دونوں یکساں کامیابیاں حاصل کریں۔ اتنے بہت سارے مصروف دنوں کے بعد آج اس کا ارادہ آرام کرنے کا تھا۔ محی الدین' فاطمہ اور خوش جمال کچھ دیر پہلے ہی

سیف اللہ کے گھر گئے تھے' لیکن اس نے محی الدین سے کہا تھا کہ وہ کچھ دیر آرام کر کے ڈیوڈ سے ملنے آجائے گا۔ ڈیوڈ پچھلے کئی دنوں سے اس سے کترا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے یقیناً" کوئی پریشانی ہے۔ اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا' چار بج رہے تھے۔ وہ کچھ دیر آرام کر سکتا تھا۔

پھر بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں' اسے پتا ہی نہیں چلا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ کچھ دیر تو وہ یونہی لیٹا اندھیرے میں دیکھتا رہا۔ پھر یک دم اٹھ بیٹھا۔ اسے تو ڈیوڈ کی طرف جانا تھا۔ تکیے کے پاس پڑا فون اٹھا کر اس نے میسج چیک کیے۔ خوش جمال کے دو تین میسج تھے۔ اس نے پوچھا تھا کہ وہ گھر پر ہے یا ڈیوڈ کی طرف اور یہ کہ اگر اس کا موڈ بن جائے تو وہ انکل سیف اللہ کی طرف آجائے۔ وہ ڈنر ان کے ساتھ ہی کریں گے۔

اس نے خوش جمال کے میسج کا جواب دیا اور پھر جلدی جلدی تیار ہو کر لاک وغیرہ چیک کیے اور گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر اسٹریٹ لائٹیں جل چکی تھیں۔ لاک سے چابی نکال کر پاکٹ میں ڈالتے ہوئے وہ مڑا تو اس کی نظر جوزفین کے گھر پر پڑی' اور اس نے دیکھا جوزی اپنے گھر کے گارڈن کی طرف سے آرہی تھی وہ ادھر ادھر محتاط نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

یہاں اس اسٹریٹ پر موجود تمام گھروں کے مین دروازوں کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے لان تھے یا گارڈن اور ان کے گرد لکڑی کی باڑ تھی اور لکڑی کا ہی دروازہ تھا۔ وہ بہت دنوں بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ جینز کے اوپر ایک کھلی سی شرٹ پہنے ہوئے تھی اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

وہ ایک ہاتھ سے بال پیچھے کرتی ہوئی اس کے گھر کی طرف آرہی تھی اور وقفے وقفے سے پیچھے مڑ کر بھی دیکھنے لگتی تھی۔ وہ جوں ہی سڑک کراس کر کے اس کے گھر کی طرف بڑھی وہ اندھیرے سے روشنی میں آگیا اور اسے سلام کیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"دھ۔ میں خوش جمال کی طرف آئی تھی۔" وہ اکثر اس کے سامنے بات کرتے ہوئے گھبرا جاتی تھی۔

"وہ سب تو گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا' لیکن سب کے گھر پر نہ ہونے کا سن کر وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی۔

"کوئی پرابلم؟" اس نے پوچھا۔

"اووف ہاں۔ وہ گھر میں ایلین تھا اور۔"

"تو تم اس سے بھاگی ہو۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ لاؤنج میں ممی سے باتیں کر رہا تھا میں کچن کے دروازے سے نکل کر آگئی کہ کچھ دیر خوش جمال کے پاس۔"

"جلو ان کے آنے تک ہم واک کرتے ہیں۔" وہ اس کے مسائل جانتا تھا۔ خوش جمال بتاتی رہتی تھی۔

"آپ کہیں جا رہے تھے؟" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ہاں مجھے ڈیوڈ کی طرف جانا تھا۔"

"وہ آپ کا انتظار کر رہا ہو گا۔" وہ اب اپنی اسٹریٹ سے نکل کر دوسری اسٹریٹ میں چل رہے تھے۔

"اسے علم نہیں ہے میرے آنے کا۔ سو کل چلا جاؤں گا۔"

مصطفیٰ نے اس کی طرف دیکھا اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کے سنہری مائل بھورے بال چمک رہے تھے اور اس کے چہرے پر انوکھی سی خوشی تھی اور یہ بات مصطفیٰ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ اس طرح چلنا اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔ وہ اس وقت بالکل بھول چکی تھی کہ اس کے گھر جانے کے بعد کیا ہو گا۔ وہ اس وقت مار تھا یا ایلین کے متعلق نہیں سوچنا چاہتی تھی وہ اس وقت صرف اس خوشی کو محسوس کرنا چاہتی تھی' جو غلام مصطفیٰ کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے رگ و پے میں رقص کر رہی تھی۔

"اور جب تم گھر واپس جاؤ گی جو تمہیں جانا ہے تو تمہاری ماما تو لڑیں گی تم سے۔" مصطفیٰ نے کہا۔

"ہاں!" وہ مسکرائی۔ "وہ کسی خونخوار بلی کی طرح پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جائیں گی' لیکن زیادہ مسئلہ نہیں ہو گا' تب تک پاپا آجائیں گے اور وہ سنبھال لیں گے ممی

کو۔"

"یعنی تیروں کا رخ ان کی طرف ہوگا۔" مصطفےٰ نے چلتے چلتے رک کر اسے دیکھا۔

"آؤ وہاں بیٹھتے ہیں۔" وہ ایک اسٹور کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اسٹور بند تھا اور اوپر جلتے بلبوں کی روشنی سیدھی ان پر پڑ رہی تھی۔

"ویسے تمہارے پاپا کو ایک کرسچن عورت سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔" اس نے خیال ظاہر کیا۔

"دراصل میری ممی کے بعد پاپا کو ان سے 'میرا مطلب ہے مارتھا ممی سے محبت ہو گئی تھی شاید۔ ویسے اگر آپ کو کسی کرسچن لڑکی سے محبت ہو جائے تو کیا آپ اس سے شادی کریں گے؟" جوزفین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں۔ یہ تو محبت ہونے کے بعد ہی بتایا جاسکتا ہے کہ اس کی شدت کتنی ہے اور ہم اس محبت کی خاطر کتنا آگے تک جاسکتے ہیں۔ کیا وہ اتنی شدید ہے کہ میں اس کی خاطر اپنے والدین کا دل دکھا سکتا ہوں؟ میرا نہیں خیال کہ میں کبھی بابا اور اماں کا دل دکھاؤں گا۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں' یہ بہت مشکل ہوتا ہے والدین کا دل دکھانا یا محبت قربان کر دے یا دل دکھاوے۔"

اسے بھی پال کا خیال آگیا تھا۔ کیا وہ کبھی پال کا مان توڑ سکتی ہے۔ شاید نہیں۔

اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی مصطفےٰ نے بغور اسے دیکھا۔ بھورے بالوں اور سنہری مائل بھوری آنکھوں والی وہ لڑکی جو بہت خوب صورت نہیں تھی' لیکن جس کی سانولی رنگت میں بلا کی ملاحت تھی اور جس کی آنکھوں کا غم اور ان میں بکھرے اداسی کے رنگ اسے متاثر کرتے تھے۔ یہ رنگ جانے پہچانے تھے۔

اس غم سے اس کی برسوں پرانی یاری تھی۔ کبھی اس کی آنکھوں میں بھی اداسی کے ان رنگوں نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ اسے اپنا اور اس کا درد مشترک لگا۔

"جب تمہاری ممی کی ڈیتھ ہوئی تو تم کتنی بڑی تھیں؟"

"نہیں' میری ممی کی ڈیتھ نہیں ہوئی۔ ان کی علیحدگی ہو گئی تھی۔ ممی نے کسی اور سے شادی کرلی تھی۔" اس نے سر جھکا لیا تھا۔ جیسے یہ کوئی بہت غلط بات تھی۔

"اوہ!" مصطفےٰ کے لبوں سے نکلا۔ "اور تمہاری ممی۔ کیا وہ تم سے ملتی ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور کھڑی ہو گئی۔

"چلیں۔"

"کیا ایلین چلا گیا ہوگا؟" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"پتا نہیں' لیکن پاپا آگئے ہوں گے۔" وہ دونوں ایک بار پھر چلنے لگے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔

"سنو جوزی!" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دائیں طرف کی گلی سے نکل کر ڈیوڈ نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"ہے مصطفےٰ!"

"وہ ڈیوڈ! تم کیسے ہو۔ مجھے آج تمہاری طرف آنا تھا' لیکن پھر۔" غیر ارادی طور پر اس نے جوزفین کی طرف دیکھا۔

"ہنہ۔" ڈیوڈ نے جوزی کی طرف اشارہ کیا۔

"ONE NIGIIT STAND" اور حلق پھاڑ کر ہنسا۔

مصطفےٰ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ڈیوڈ ادھر ادھر لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ نشے میں تھا۔ یقیناً" اس نے بہت زیادہ پی رکھی تھی۔

"یہ جوزی ہے۔" اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اچھا جوزی۔" اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا۔ "جوزی۔ وہ ابن کی محبوبہ۔"

"شٹ اپ!" جوزفین کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تو کیا نہیں ہو اس کی محبوبہ؟" اس کی آواز بھی لڑکھڑا رہی تھی۔ مصطفیٰ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"ڈیوڈ! تم نشے میں ہو۔ اس طرح تم خود کو تباہ کر رہے ہو۔ تمہیں اتنی زیادہ ڈرنک نہیں کرنا چاہیے جبکہ آج کل میں ٹیم کے لیے کھلاڑیوں کا انتخاب ہونے والا ہے۔"

"ہم چھا!" ڈیوڈ نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں تو جوزے ٹیم کا کپتان بنا رہا ہے نا۔ تم خوش ہو جاؤ۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"اس وقت تم نشے میں ہو۔ ڈیوڈ میں صبح تم سے بات کروں گا۔"

"جاؤ۔ جاؤ۔" ڈیوڈ نے اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ مصطفیٰ نے جوزفین کی طرف دیکھا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ جو سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ کو گھر تک چھوڑ آئے اس کا گھر یہاں سے پندرہ منٹ کی واک پر تھا۔ جوزفین کو دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا اور جوزفین کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔

"میں ڈیوڈ بیکھم ثانی ہوں۔" ڈیوڈ نے چلا کر کہا۔ "اور مجھے "جوزے" ٹیم سے باہر نہیں کر سکتا۔"

مصطفیٰ کا دل اس کے لیے دکھا۔ سننے میں آ رہا تھا کہ جوزے ڈیوڈ کو ٹیم سے باہر کرنے والا ہے۔ شاید ڈیوڈ نے بھی سن لیا تھا۔ اور یہ شاید اسی کا ردعمل تھا۔

وہ دونوں اب فٹ پاتھ پر چل رہے تھے ڈیوڈ پیچھے رہ گیا تھا۔ صبح موسم بہت خوشگوار تھا لیکن یکایک آسمان پر بادل چھا گئے تھے اور ابھی وہ اپنی اسٹریٹ سے دور ہی تھے کہ ایک دم تیز بارش نے انہیں آلیا۔ تیز تیز چلتے ہوئے مصطفیٰ نے اپنی جیکٹ اتار کر اسے دی۔

"لیکن!" وہ جھجکی۔

"یہ پہن لو جوزی۔" مصطفیٰ نے نرمی سے کہا۔

وہ یونہی گھریلو کپڑوں میں ایلن کے آنے پر کچن کے راستے سے نکل آئی تھی۔ جیکٹ لیتے ہوئے اس نے شکریہ ادا کیا تو مصطفیٰ لمحہ بھر رک گیا تاکہ وہ جیکٹ پہن لے۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے تھی اس کے برابر پہنچنے کے لیے اس نے تیزی سے قدم اٹھائے اور پھسل گئی۔ مصطفیٰ نے یکدم مڑ کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اور اب وہ اس کا ہاتھ پکڑے تیز تیز چل رہا تھا۔ اور جوزفین کو لگا جیسے یہ اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت دن پھر اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ کاش۔ وقت یہیں ٹھہر جائے اور وہ یونہی مصطفیٰ کا ہاتھ تھامے بارش میں بھیگتے ہوئے چلتی رہے اور زندگی ختم ہو جائے۔ اس کے دل نے بے اختیار خواہش کی لیکن بھلا ایسی خواہشیں بھی کبھی پوری ہوئی ہیں؟ وہ اپنی اسٹریٹ میں داخل ہو چکے تھے۔ مصطفیٰ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گھر کے باہر رک کر اس نے جیکٹ اتار کر مصطفیٰ کی طرف بڑھائی۔

"کسی کا دیا ہوا تحفہ واپس نہیں کیا جاتا لڑکی!" وہ کب واپس کرنا چاہتی تھی وہ تو اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ "لیکن مم۔ جی۔ وہ۔ مم۔" اس کے منہ سے بے ربط اور نامکمل جملہ نکلا اور مصطفیٰ لمحے کے ہزارویں حصے میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور اس نے جیکٹ تھام لی۔

وہ شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی لیکن لفظ اس کے اندر ہی گم ہو گئے تھے اور آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

"تمہیں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوشی کہتی ہے بعض رشتوں میں شکریہ اور سوری تکلیف دیتے ہیں۔"

"رشتہ۔ کیا مصطفیٰ سمجھتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی رشتہ ہے؟" اس کے اندر یکدم پھول کھلے تھے اور ساتھ ہی آنسوؤں کی برسات ہوئی تھی۔ اور بھیگی پلکیں لمحہ بھر کے لیے مصطفیٰ کی طرف اٹھی تھیں مصطفیٰ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ بھیگے ہوئے بھورے بال اس کی پیشانی اور رخساروں سے چپکے ہوئے تھے اور پانی کے کچھ قطرے اس کے بالوں اور پیشانی پر اٹکے تھے۔ اور آنکھوں میں جھلملاتے دیے چند موتیوں میں ڈوب گئے تھے اس سے پہلے کہ یہ پانی پلکوں کی حدیں توڑ کر رخساروں تک آتا وہ یک دم تیزی سے مڑی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

مصطفےٰ لمحہ بھر وہاں ہی کھڑا رہا۔ اس کا دل جیسے ان جھلملاتی آنکھوں میں اٹک گیا تھا۔
یہ لڑکی اسے اچھی لگتی تھی۔
"یہ محبت تو نہیں ہے؟" اس نے خود سے پوچھا۔
"ہاں شاید یہ محبت ہی ہے۔"
گھر کا لاک کھولتے ہوئے اس نے اعتراف کیا اور گھر میں داخل ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

محی الدین، فاطمہ اور غلام مصطفےٰ تینوں لاؤنج میں بیٹھے تھے اور خوش جمال کچن سے لاؤنج اور لاؤنج سے کچن کے چکر لگا رہی تھی۔ پورے گھر میں چاروں طرف خوشی اور مسرت کا احساس بکھرا ہوا تھا۔ فاطمہ کی آنکھیں نم تھیں گو وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ پڑھ کر مصطفےٰ پر پھونک رہی تھی۔ محی الدین کی نم آنکھیں بھی بار بار مصطفےٰ کی طرف اٹھتی تھیں اور پھر وہ فوراً ہی نظریں جھکا لیتے تھے کہ کہیں مصطفےٰ کو ان کی نظر ہی لگ جائے۔ کچھ دیر پہلے وہ مصطفےٰ سے گلے ملتے اور اسے مبارکباد دیتے ہوئے جذباتی ہو گئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن پھر بھی آنکھیں بار بار بھر آتی تھیں اور یہ خوشی و تشکر کے آنسو تھے۔

خود مصطفےٰ کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایسا ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ اپریل میں ہونے 2010-2011 کے یورپین چیمپئنز لیگ کے لیے جس ٹیم کا انتخاب کیا جائے گا۔ اس کی کپتانی کا سہرا اس کے سر رکھا جائے گا۔ انٹرنیشنل کلب کی جرسی پہنا ہی کسی اعزاز سے کم نہ تھا کہ اب اسے ایک اور اعزاز مل گیا تھا۔ اس نے تو صرف یہ چاہا تھا کہ جب ٹیم کے کھلاڑیوں کا نام اناؤنس ہو تو اس میں اس کا بھی نام شامل ہو۔

اس ایک سال سے زیادہ عرصے میں اس نے بے شمار میچز کھیلے تھے اور حیرت انگیز گول داغے تھے اور کچھ ایوارڈ بھی ملے تھے اسے۔ تاہم کچھ تعصب ضرور پایا جاتا تھا کہ جب ورلڈ پلیئر آف دی ایئر کے لیے فیفا ایوارڈ روبی کو دیا گیا تو کچھ صحافیوں نے دبے لفظوں میں اس کا نام لیا تھا۔ لیکن اسے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ روبی بہترین کھلاڑی تھا۔ اور اب بھی اگر کپتانی اسے سونپی جاتی تو اسے افسوس نہ ہوتا۔ لیکن یہ ایک غیر متوقع خوشی تھی جو اسے ملی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تم اس کے حق دار ہو۔" جوزے نے اس کے کندھے تھپکے تھے۔ "یہ پہلا موقع ہے کہ مانچسٹر یونائیٹڈ نے کسی پاکستانی کھلاڑی کو چنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہماری امیدوں کو نہیں توڑو گے۔ اور مجھے مانچسٹر یونائیٹڈ کی انتظامیہ کے سامنے شرمندہ نہیں کرو گے۔" اور وہ جان گیا تھا کہ ایسا جوزے کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ ذرا بھی متعصب نہیں تھا۔

"مجھے آج تمہارا بھائی بہت یاد آ رہا ہے۔ اور مجھے خوشی ہو رہی ہے تمہاری اس کامیابی پر۔" آرسنل کلب کا منیجر فرگوسن بھی اس وقت وہاں ہی تھا۔ "وہ اگر زندہ رہتا تو ایک عظیم فٹ بالر بنتا اس کے شاٹ شاندار تھے اور رفتار حیران کن میں اس کی زندگی کا وہ آخری گول کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔"

اس نے سر جھکا کر عبدالہادی کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔

ڈیوڈ کا نام ان کھلاڑیوں میں شامل نہیں تھا مصطفےٰ کو افسوس ہوا تھا' وہ اس کا دوست تھا۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا' اس کا حوصلہ بڑھانا چاہتا تھا کہ وہ ہمت نہ ہارے۔ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا اس بینچ تک آیا تھا جہاں وہ مایوس دل شکستہ سا سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"ڈیوی!" اس نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا تو اس نے سر اٹھایا' ایک نفرت بھری نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر تیزی سے ایک سمت بڑھ گیا تھا۔

"نہیں۔ یہ ڈیوڈ تھا اس کا واحد دوست' کیسے اسے نظر انداز کر کے چلا گیا تھا۔"

"دراصل وہ ڈس ہارٹ ہوا ہے اس لیے۔" اس نے خود ہی دل کو سمجھا لیا تھا' ایک دو روز تک ٹھیک ہو جائے گا تو پھر میں اسے سمجھ دوں گا۔

"شراب نوشی کی کثرت نے اس کی کارکردگی کو متاثر کیا ہے ورنہ وہ اچھا کھلاڑی ہے۔ انتظامیہ کو ایک بار اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنا چاہیے۔" اخبارات نے تبصرہ کیا تھا اور اس کا بھی یہی خیال تھا۔

"ٹھیک دس منٹ بعد آپ سب ڈائننگ ٹیبل پر آجائیں۔" خوش جمال نے ہاتھ میں پکڑی ڈش ٹیبل پر رکھی۔ وہ خوشی سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ اس نے گھر آتے ہی گلاب کا ایک بڑا بکے مصطفےٰ کو دیا تھا۔

مصطفےٰ نے اپنی کیفیت سے باہر آکر خوش جمال کی طرف دیکھا اور پھر ٹیبل کی طرف۔ جو لاؤنج میں ہی ایک طرف لگی ہوئی تھی۔ اور خوش جمال نے چائے کے ساتھ اچھا خاصا اہتمام کرلیا تھا۔

"ہم صرف چار بندے ہیں خوشی!"

"ابھی پانچواں بھی آرہا ہے۔" وہ مسکرائی۔ خوشی اس کے وجود کے ہر حصے سے پھوٹ رہی تھی۔

"کون جوزی؟" وہ سمجھ گیا تھا کہ خوش جمال نے ضرور اسے خبر کردی ہوگی۔ تب ہی ڈور بیل ہوئی تھی اور خوش جمال لاؤنج سے باہر نکل گئی تھی۔ اور پھر فورا" ہی جوزی کے ساتھ واپس آئی تھی۔ جوزی نے سب کو مشترکہ سلام کرنے کے بعد مبارک دی اور پھر ہاتھ میں پکڑا چاکلیٹ کا چھوٹا سا ڈبا مصطفےٰ کے سامنے ٹیبل پر رکھا۔

"آپ کے لیے اس خوشی کے موقع پر۔"

وہ اس روز کے بعد آج جوزی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ناک تھوڑی سوجی ہوئی تھی اور ناک کے ساتھ رخسار پر ہلکا نیل تھا۔ اس نے نیٹ کا سفید ٹخنوں تک لمبا فراک پہنا ہوا تھا جس میں کہیں کہیں سفید نگینے جگمگاتے تھے۔ اور اس نے اپنے بالوں کو ایک سفید رنگ کے سلکی رومال سے باندھا ہوا تھا اور ایسا ہی ایک سفید سلکی رومال گلے میں لٹکایا ہوا تھا۔ وہ بغیر میک اپ کے سادا سے چہرے کے ساتھ بھی اسے اچھی لگ رہی تھی۔ لیکن یہ نیل۔ وہ پوچھنا ہی چاہتا تھا۔ کہ خوش جمال نے ٹیبل کے پاس کھڑے کھڑے آواز دی۔

"سب فورا" آجائیں نہیں تو ہر چیز ٹھنڈی ہوجائے گی۔"

چائے بہت خوشگوار ماحول میں دلچسپ باتوں کے درمیان پی گئی تھی۔ محی الدین اور فاطمہ چائے پی کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہ تینوں لاؤنج میں آکر باتیں کرنے لگے تھے۔

"ہم بہت جلد ایک شاندار دعوت کریں گے اس خوشی میں۔" خوش جمال دعوت پلان کررہی تھی کہ جب اس کی کسی کولیگ کا فون آگیا تو وہ معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی اب وہ دونوں اکیلے تھے۔

"یہ بہت معمولی ہے۔" جوزفین نے خوش جمال کے جانے کے بعد چاکلیٹ کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

"میرے لیے بہت قیمتی ہے۔" مصطفےٰ نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی اس کے رخسار گلگوں ہوگئے۔

"یہ نیل۔ یا گر گئی تھیں؟" مصطفےٰ اس کا نیل دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔ اس رات ممی نے مارا تھا۔" جوزفین کی نظریں جھک گئیں اور مصطفےٰ کے اندر کوئی پرانا درد جاگا۔

"ولیم ناراض ہو کر چلا گیا تھا اور ممی بہت غصے میں تھیں۔"

"تم اپنی ممی کے ساتھ کیوں نہیں گئیں۔ کیا ان کے دوسرے ہزبینڈ نے تمہیں رکھنے سے انکار کردیا تھا۔" مصطفےٰ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔ وہ اچھے آدمی تھے۔ پیار کرتے تھے مجھ سے۔" وہ سر جھکائے بتارہی تھی۔

"میں خود ممی کو چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ پاپا مجھے ملنے آئے تھے تو میں ممی کو بتائے بغیر ان کے ساتھ آگئی۔"

"کیوں؟" مصطفےٰ نے پوچھا۔ "تم اپنی ممی کے پاس رہتیں تو کم از کم سوتیلی۔ ممی کے ظلم سے بچ جاتیں۔"

"دراصل میں ممی سے ناراض تھی۔ مجھے ان پر بہت غصہ تھا۔"

"تم کیوں ناراض تھیں ان سے جوزی۔؟"

"وہ مارتھا ممی سے زیادہ خائف تھیں انسوں نے ہادی

کو گھر سے نکال دیا تھا۔"

"ہادی۔" وہ چونکا۔

"ہاں ہادی۔ ان کا سوتیلا بیٹا۔ وہ اسے بہت مارتی تھیں اور انکل حبیب سے اس کی جھوٹی شکایتیں لگاتی تھیں۔"

"تم۔" مصطفیٰ نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "تم مشاعل ہو؟"

"ہاں۔ لیکن تمہیں کیسے پتا۔ یہ میرا فرسٹ نیم ہے۔ پاکستان میں سب مجھے فرسٹ نیم سے بلاتے تھے یہاں مارتھا ممی مجھے جوزی کہہ کر بلانے لگیں۔"

"میں۔ میں ہادی ہوں۔"

اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "لیکن تم تو؟"

اس کا منہ تھوڑا سا کھلا تھا اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس کی سیاہ، بھنورا آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ہاں وہی ہادی کی آنکھیں تھیں۔

"مشاعل۔ مشاعل بی لیوی۔ میں ہادی ہی ہوں۔"

اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہادی تو ماما مجھے پیار سے بلاتی تھیں۔ میرا اصل نام تو غلام مصطفیٰ ہی ہے۔"

"یہ کیسی کہانیوں جیسی بات ہوئی ہے نا۔؟"

وہ اسے دیکھ رہا تھا اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا جب خوش جمال نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اور اس کا دل ڈوب گیا۔

"خوشی۔ خوشی!" مصطفیٰ نے اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے خوش جمال کی طرف دیکھا۔

"یہ۔ یہ مشاعل ہے۔ کیسا عجیب اتفاق ہے۔" اور خوش جمال کا ڈوبتا دل جیسے ڈوب کر ابھرا اور وہ قدم بڑھا کر اس کے قریب آئی۔ تو وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اسے تفصیل بتانے لگا۔ اور پھر تفصیل بتاتے بتاتے اسے خوش جمال کی بات یاد آئی تو اس نے جوزفین کی طرف دیکھا۔

"خوش جمال نے کہا تھا تم جب کبھی مجھے ملو تو مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تم میرا خیال رکھتی تھیں۔ اور۔"

"کچھ رشتوں میں شکریہ اور سوری تکلیف دیتے ہیں۔" اس نے مصطفیٰ کی بات دہرائی تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔ خوش جمال بھی مسکرا دی۔

"جب پہلی بار میں نے مصطفیٰ کو دیکھا تو مجھے اس کی آنکھیں بہت جانی پہچانی لگی تھیں جیسے میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو ان آنکھوں کو۔"

وہ خوش جمال کو بتا رہی تھی اور مصطفیٰ کے دل میں برسوں پرانا دکھ جاگ اٹھا تھا۔ کہ وہ پاپا کو نہیں بتا سکا تھا کہ اس نے سنی کو نہیں گرایا۔ اور وہ اس سے ناراض ہی چلے گئے۔

انکل کو کراچی میں بہت دن لگ گئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو انہوں نے ہادی کو بہت ڈھونڈا۔ تھانے میں بھی رپورٹ لکھوائی تھی۔ انہوں نے دبئی میں کسی کے ساتھ پارٹنر شپ کی تھی انہیں ہر صورت وہاں جانا تھا ہادی کی وجہ سے پہلے ہی وہ لیٹ ہو گئے تھے۔ وہ ضروری کام کر کے دبئی سے واپس آئے تو ممی نے انہیں بتایا کہ تھانے سے آدمی آیا تھا انہیں ایک دس گیارہ سالہ بچے کی لاش ملی تھی جنگل سے۔ ممی گئی تھیں لاش دیکھنے۔ لاشیں مسخ ہو گئی تھیں لیکن ممی نے اس کے لباس سے اور جوتوں سے پہچان لیا تھا وہ ہادی ہی تھا۔ لاش کی حالت صحیح نہیں تھی۔ اس لیے ممی گھر نہیں لائی تھیں۔ اور اسے تھانے والوں نے ہی دفنا دیا تھا۔ پہلے مجھے لگا تھا ممی جھوٹ بول رہی ہیں۔ لیکن جب انکل خود تھانے گئے تو انہیں ایس ایچ او نے بتایا کہ ایک لاش ملی تھی اور آپ کی وائف آئی تھیں اور انہوں نے پہچانا تھا۔ اس روز میں اور میتو بہت روئے تھے اور انکل کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا وہ ہر وقت کمرے میں لیٹے رہتے اور ہادی کی تصاویر دیکھتے رہتے۔ اور یہ وہی دن تھے جب پاپا مجھے ملنے آئے تھے اور میں چپکے سے پاپا کے ساتھ چلی آئی تھی۔"

وہ خوش جمال کو بتا رہی تھی اور وہ ساکت سا سن رہا تھا۔

"پہلے میں پاپا کے ساتھ لاہور آئی جہاں وہ پڑھاتے تھے۔ پاپا نے ممی کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے ساتھ

لے آئے ہیں۔ ممی بہت چیخی چلائی تھیں پاپا نے فون
بند کروا دیا تھا۔ پھر چند ماہ بعد ہم کراچی آگئے۔ اب مجھے
ممی یاد آئی تھیں۔ میں نے لاہور سے ایک بار انہیں
فون کیا تھا۔ تو انہوں نے کہا تھا کہ اگر پاپا مجھے زبردستی
اپنے ساتھ لائے ہیں تو وہ ان پر کیس کریں گی۔ لیکن
میں نے کہا کہ میں خود آئی ہوں اپنی مرضی سے اور میں
ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ بعد میں ایک دو بار میں
نے انہیں فون کیا تو انہوں نے میری آواز سنتے ہی فون
بند کر دیا۔"

"اور پاپا۔ میرے پاپا کو کیا تم نے یا مینو نے بتایا تھا کہ
میں نے سنی کو کہیں گم کروایا تھا اور تمہاری ممی نے
جھوٹ بولا تھا۔"

وہ ذرا سا خاموش ہوئی تو مصطفے نے یکدم پوچھا' وہ
ابھی تک اسی دکھ کے حصار میں تھا۔

"ہاں۔ انکل کو پتا تھا۔ انہوں نے گیٹ کے باہر لکھا
ہوا پڑھ لیا تھا اور پھر انہوں نے مینو سے اور مجھ سے
پوچھا تھا تو ہم نے بھی بتا دیا تھا۔"

"تھینک گاڈ! پاپا مجھ سے ناراض نہیں تھے۔"

اسے لگا جیسے برسوں سے اس کے دل پر دھرا بوجھ
ہٹ گیا ہو اور وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا ہو۔

"تمہارے پاپا تمہیں یاد کر کے بہت روتے تھے
ہادی۔"

وہ اب اس کے لیے غلام مصطفے نہیں ہادی تھا۔
غلام مصطفے سے وہ تکلف سے بات کرتی تھی لیکن
ہادی سے بے تکلفی سے بات کر رہی تھی۔ تب ہی
مصطفے کا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر روبی کا نام چمک رہا
تھا۔ وہ فون آن کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ
فاصلے پر کھڑا ہو کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ گاہے
گاہے وہ اس کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا جو حیران کن
خوشی کے ساتھ خوش جمال کو ان دنوں کے متعلق
بتا رہی تھی' جب وہ اور ہادی ایک ہی گھر میں رہتے
تھے۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے فاطمہ! نیند نہیں آ رہی کیا؟" انہیں
کروٹیں بدلتے دیکھ کر محی الدین نے ہاتھ میں پکڑی
کتاب تکیے کے پاس اوندھی کر کے رکھی۔

"کیا عبدالہادی یاد آ رہا ہے؟"

"وہ بھولتا کب ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "اللہ
ہمارے مصطفے کو نظر بد سے بچائے۔"

"آمین۔!" انہوں نے بغور فاطمہ کو دیکھا۔ "کوئی
پریشانی ہے فاطمہ۔"

"نہیں تو بس یونہی سوچ رہی تھی' وقت کتنی
جلدی گزر گیا۔ کل مصطفے اور خوش جمال بچے تھے آج
شادی کے قابل ہو گئے ہیں۔"

"شادی پر یاد آیا تم نے خوش جمال سے اس رشتے
کے متعلق بات کی؟ سیف اللہ بہت تعریف کر رہا ہے
اس کے داماد کا بھائی ہے۔ اس کی بیٹی اپنے گھر میں بہت
خوش ہے۔ مجھے تو یہ رشتہ بہت مناسب لگا ہے۔"

"ہاں لیکن خوش جمال نے منع کر دیا ہے۔"

"لیکن کیوں؟" محی الدین کو حیرت ہوئی۔

"وہ اگر چاہے تو مل لے۔ میں اسے معیوب نہیں
سمجھتا اگر وہ۔۔۔" "نہیں ایسی بات نہیں ہے۔" فاطمہ
نے ان کی طرف دیکھا۔

"پھر کیا بات ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ نے بھی سوچا کہ وہ ہر رشتے سے انکار کر دیتی
ہے۔ حالانکہ اس کے لیے جتنے بھی رشتے آئے سب
اچھے تھے۔" فاطمہ نے آہستگی سے کہا۔

"تو کیا کوئی اور۔۔۔؟" ان کے لبوں سے بے ساختہ
نکلا۔

"اور کون۔۔۔ اپنا مصطفے؟" فاطمہ کو بھی تو کل ہی پتا
چلا تھا کہ خوش جمال مصطفے کے علاوہ کسی اور کے
ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ انہوں نے کل جب
اس رشتے کا ذکر کیا تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا تو اس کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہیں یکدم ادراک ہوا تھا
اور جب انہوں نے تصدیق چاہی تھی تو اس نے سر
جھکا لیا تھا۔

"کیا مصطفے بھی یہی چاہتا ہے؟" محی الدین کے
اندر جیسے ایک ساتھ بہت سے پھول چٹکے تھے دل میں

دلی خواہش کی کونپل مٹی کا سینہ چیر کر باہر نکل آئی تھی۔ اگر ایسا ہو جائے تو بھلا اس سے اچھا کیا ہو سکتا ہے۔

"پتا نہیں۔" فاطمہ نے بے چینی سے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑا۔ "لیکن دونوں کا آپس میں بہت جوڑ ہے' میرا مطلب ہے دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آپ بات کریں نا مصطفیٰ سے۔"

"میں۔" محی الدین نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "اگر اس کا ایسا کوئی خیال ہوتا تو وہ خود ذکر کرتا۔"

"بچہ ہے اب وہ کیا کہے گا۔ یہ تو ہمیں خود سوچنا ہے۔" فاطمہ ماں تھیں' ان کے دل میں بیٹی کا خیال تھا۔

"لیکن فاطمہ! جب میں نے سیف اللہ کے بتائے رشتے کا ذکر کیا تھا مصطفیٰ سے تو اس نے تعریف کی تھی لڑکے کی اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔" انہیں اچانک خیال آیا تھا۔

"لیکن آپ بات کریں گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔" فاطمہ اس وقت صرف خوش جمال کی ماں بن کر سوچ رہی تھیں۔

"ہاں۔ وہ انکار نہیں کرے گا فاطمہ! میں جانتا ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ سوچے کہ ہم نے اس لیے اسے پالا پوسا ہے کہ آج اس سے اس احسان کا بدلہ لیں۔ نہیں فاطمہ! تم خوش جمال سے پھر بات کرو کہ وہ اس رشتے کے متعلق سوچے اور تم بھی اب سو جاؤ۔"

انہوں نے لیٹتے ہوئے کروٹ بدل لی تھی۔ لیکن فاطمہ کی آنکھوں سے نیند دور تھی۔ اس نے خوش جمال کی آنکھوں میں مصطفیٰ کے نام پر جلتے دیے دیکھے تھے۔ وہ کیسے ان دیوں کو بجھا دیتیں۔ وہ کیسے اپنی بیٹی کی خوشی چھین لیتیں۔ ایک بار بات کر لینے میں کیا حرج تھا۔ سو انہوں نے صبح ناشتے کے بعد جب مصطفیٰ لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھتے ہوئے "مجوزے" کے فون کا انتظار کر رہا تھا مصطفیٰ سے بات کرنے کا سوچا اور اس کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

"مصطفیٰ! میں سوچ رہی ہوں تمہارے معجزے کے بعد تمہاری اور خوش جمال کی شادی کر دیں۔" مصطفیٰ نے ریموٹ سے آواز آہستہ کی۔

"کیا خوش جمال نے اس انجینئر کو اوکے کر دیا۔ وہ انکل سیف اللہ کے داماد کا بھائی۔" وہ مسکرایا۔

محی الدین صحیح کہتے تھے اس کے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ فاطمہ نے ایک گہری سانس لی۔

"نہیں۔ دراصل۔ وہ میں نے سوچا تمہاری اور خوش جمال کی شادی۔" وہ اٹکیں۔ "تم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے ہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہو گے۔ اور ہماری آنکھوں کے سامنے رہو گے' باہر کہیں رشتہ کرتے ہوئے دل ڈرتا ہے سو طرح کے وہم آتے ہیں۔"

وہ سر جھکائے کہہ رہی تھیں اور وہ ساکت بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے جو مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی تھی وہ دم توڑ چکی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو ان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ اگر خوش جمال ان کے دل کا ٹکڑا تھی تو وہ بھی تو دل کا ٹکڑا ہی تھا۔ بے شک انہوں نے اسے جنم نہیں دیا تھا لیکن وہ انہیں خوش جمال سے کم عزیز نہیں تھا۔

"بیٹا! یہ صرف ہماری خواہش ہے کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہے۔ اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو کوئی بات نہیں۔ میرے دل میں ایک خیال آیا تو میں نے کہہ دیا۔"

وہ دل گرفتی سے کہتی ہوئی لاؤنج سے باہر چلی گئیں۔ اور وہ وہاں ہی بیٹھا رہا۔ ابھی تو اس کے دل میں محبت کی کونپل پھوٹی تھی۔ ابھی تو اسے اس جذبے کا ادراک ہوا تھا۔ ایک انوکھا سا خوب صورت سا احساس اس کے من کو گل رنگ کیے رکھتا تھا۔ ابھی تو اس نے اس وادی میں قدم رکھا تھا اور۔

"کیا وہ اماں اور بابا کی خواہش پر اپنی محبت قربان کر سکتا ہے؟"

اس نے خود سے پوچھا۔ بابا نے اسے اس وقت

گلے لگایا تھا، سہارا دیا تھا، جب مشاعل کی ممی نے اسے گھر سے نکل دیا تھا۔ اگر وہ اسے سہارا نہ دیتے تو وہ آج یہاں نہ ہوتا جہاں ہے۔ شاید جنگل میں ملنے والی لاش اس کی ہوتی اور اماں۔

اماں کے لمس میں اس نے ماں کا لمس تلاشا تھا۔ اماں جب سردیوں کی راتوں میں اٹھ کر نیچے گرا ہوا کمبل اس پر ڈالتیں تو اس کی آنکھ کھل جاتی تھی اور اسے ماما یاد آجاتیں۔ کیا ماما اس سے اس سے زیادہ محبت کرپاتیں جتنی اماں نے اس سے کی تھی؟

اور خوش جمال۔ کیا وہ بھی؟

اس نے سوچا اس روز اس نے سارا دن خوش جمال کو ادھر ادھر آتے جاتے کام کرتے دھیان سے دیکھا۔ اسے دیکھ کر اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو دیپ جل اٹھتے تھے۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی پلکوں کا اٹھنا اور گرنا اس کے محبت آشنا دل نے اسے یقین دلایا کہ یہ محبت ہے۔ پہلے وہ نہیں جانتا تھا لیکن اب جان گیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اماں ، بابا اور خوش جمال کی خواہش قربان کرکے اپنی محبت کے ایوان نہیں سجا سکتا۔ ہاں وہ ان کی خواہش پر اپنی محبت قربان کرسکتا ہے۔ اور اس نے فاطمہ کے سامنے سر جھکا دیا۔

''اماں جان! آپ نے اور بابا نے میرے لیے جو فیصلہ کیا ہے۔ وہ مجھے دل و جان سے قبول ہے۔''

اور فاطمہ نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے ڈھیروں دعائیں دیں۔ لیکن اس کے اندر برسات ہو رہی تھی۔ اپنی نئی نویلی محبت کے مرجانے پر ماتم بپا تھا۔ پہلی محبت کے بچھڑنے کا دکھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پورے گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ خوش جمال تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ خوش گلو پرندوں کی طرح چہکتی پھرتی تھی۔ اور اس کے چہرے پر ست رنگی خوشیوں کے رنگ دمکتے تھے۔ اور یہ رنگ پہلے اسے نظر کیوں نہیں آئے۔ اس نے اپنے دل میں خوش جمال کے لیے ایسا جذبہ کیوں محسوس نہیں کیا جو جوزی کے لیے کیا تھا۔

جوزی نے تو اسی روز اس کے دل میں اپنی محبت کا بیج بودیا تھا، جس روز اس نے پہلی بار اسے اپنے گھر سے باہر روتے دیکھا تھا اور آج اسے اب ہوا تھا۔ کاش یہ اور آج اسے کبھی نہ ہوتا۔ اس کا نوخیز دل پہلی پہلی محبت کا دکھ برداشت نہیں کرپارہا تھا۔ اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ مچی تھی اور آنکھوں میں دھول اڑتی تھی اور اس دھول کو سب سے پہلے خوش جمال نے محسوس کیا۔ وہ خوش جمال تھی جو ہمیشہ اس کے دل میں اتر کر اس کی پریشانی جان لیتی تھی تو اب کیسے نہ جان پاتی۔

دو تین روز تو وہ اپنی ہی خوشی میں مگن رہی تھی۔ لیکن اب وہ اسے دیکھ رہی تھی منور کررہی تھی اور اس کے چہرے پر کھلتے ست رنگی خوشیوں کے پھول مرجھائے جارہے تھے۔

مصطفیٰ نے صرف اماں اور بابا کی خواہش کا احترام کیا ہے۔ ورنہ اس کا دل اسے اس روپ میں قبول نہیں کررہا وہ جان گئی تھی۔

لیکن کیا کوئی اور۔؟

اور جوزی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

چور نظروں سے مصطفیٰ کو دیکھتی مصطفیٰ کے نام پر لبوں پر چھلکتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں اترتی جگمگاہٹیں۔

''توجوزی؟''

ایک لمحہ کے لیے اس کے اندر اندھیرے اتر آئے

مصطفیٰ جوزی سے محبت کرتا ہے۔

''لیکن۔ میں اسے اتنا چاہوں گی۔ اتنا خیال رکھوں گی کہ وہ جوزی کو بھول جائے گا۔ میرا اور اس کا تو سالوں کا ساتھ ہے اور جوزی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے مصطفیٰ کی خواہش کو نظر انداز کیا تھا اور پہلی بار وہ اپنے لیے خود غرض ہوگئی تھی۔ ورنہ اب تک تو وہ مصطفیٰ کے لیے اپنی چھوٹی چھوٹی خواہش اور خوشیاں قربان کرتی آئی تھی۔ لیکن اس روز اسے لگا وہ خود غرض نہیں ہوسکتی۔

اس روز رونی مصطفیٰ سے ملنے آیا تھا۔ بنگال سے

تعلق رکھنے والا یہ کھلاڑی بہت خوش مزاج اور مخلص تھا۔ اور اسے بھی جوزے نے ہی ہائیر کیا تھا۔ وہ لنچ ٹائم تھا اور وہ مصطفیٰ سے پوچھنے آئی تھی کہ روفی لنچ کرے گا یا چائے بنالوں ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر لمحہ بھر رک کر اس نے اپنا اسکارف درست کیا تھا جب اس نے روفی کو کہتے سنا۔

"تمہیں کیا ہوگیا ہے غلام مصطفیٰ۔ جوزے بہت پریشان ہے ریکنٹ میچز میں تمہاری کارکردگی دیکھ کر۔ انتظامیہ کی طرف سے دباؤ ہے۔ صحافی بھی کہہ رہے ہیں کہ جوزے پچھتانے والا ہے اس لیے اسے پہلے ہی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔ جوزے نے مجھے بھیجا ہے اگر تمہیں کوئی پریشانی ہے تو ہم سے شیئر کرو۔ ہو سکتا ہے ہم تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔"

اور وہ وہاں ہی ٹھہر کر ان کی باتیں سننے لگی۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو روفی۔! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ جیسے میں اب کھیل نہیں پاؤں گا۔ جیسے میرا دل مر رہا ہے ہولے ہولے۔ اور میں ختم ہو رہا ہوں دھیرے دھیرے۔"

"او مائی گاڈ۔ کہیں تمہیں بھی اپنے بھائی کی طرح TACHYCARDIA کی بیماری تو نہیں ہے۔ میں جوزے کو بتاتا ہوں وہ بہترین ڈاکٹرز سے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے روفی۔ بس میرا دل۔ میرا خیال ہے میں اب کبھی نہیں کھیل سکوں گا۔ جوزے کو چاہیے کہ وہ انتظامیہ کو مطلع کر دے۔"

خوش جمال کا دل جیسے اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا تھا وہ مصطفیٰ سے کچھ پوچھے بنا واپس کچن میں آئی تھی۔

"نہیں، تم کھیل نہیں چھوڑ سکتے مصطفیٰ! بابا کا خواب، ان کی خوشی۔ بلکہ ہم سب کا خواب غلام مصطفیٰ عظیم فٹ بالر۔ نہیں۔"

اس نے اپنے دل کے کئی ٹکڑے ہوتے محسوس کیے۔

وہ کھلاڑی کی بیٹی تھی۔ اس کے بابا فٹ بالر تھے۔ اس کے دادا کو فٹ بال سے عشق تھا۔ اس کا بھائی۔

اس کا تیرہ سالہ بھائی۔ فٹ بال کے گراؤنڈ میں ایک حیرت انگیز کک لگاتے ہوئے دنیا سے چلا گیا تھا۔ فٹ بال سے محبت اس کی گھٹی میں تھی۔ اور وہ مصطفیٰ سے بھی محبت کرتی تھی وہ اسے ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ فیصلہ کرتے ہوئے اس نے اپنے دل کو ہزاروں کرچیوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ اور ٹرالی میں چائے کا سامان لگاتے ہوئے اس کے آنسو اس کے رخساروں کو بھگوتے رہے۔ لیکن روفی کے جانے کے بعد جب وہ مصطفیٰ کے کمرے میں گئی تو اس کی آنکھیں خشک تھیں گو اندر اب بھی برسات ہو رہی تھی اور یہ برسات نہ جانے کب تک ہونی تھی۔

مصطفیٰ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سامنے دیوار پر نظریں جمائے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"جب تم فارغ ہو کبھی تو انکل سیف اللہ کے نواسے کی مبارک باد دے آئیں۔ اماں بتا رہی تھیں عافیہ اور اس کے میاں ہم دونوں کا پوچھ رہے تھے۔"

"اب تو فارغ ہی فارغ ہوں جب کہو چلے چلتے ہیں۔" اس کے لہجے میں کیا تھا ایسا جس نے خوش جمال کو اندر تک ہلا دیا۔ اور وہ جو ابھی تک طے نہیں کر پائی تھی کہ کیسے بات شروع کرے ایکدم اس نے پوچھا۔

"مصطفیٰ! جوزی تمہیں کیسی لگتی ہے۔"

"کیا مطلب کیسی لگتی ہے؟" مصطفیٰ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "اچھی لڑکی ہے اور تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو اسے۔"

"ہاں لیکن تم تو اسے اس کے بچپن سے جانتے ہو۔" مصطفیٰ نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

"دراصل۔" خوش جمال جو کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی بیٹھ گئی۔ "اماں اور میں سوچ رہے ہیں کہ جوزی کو تمہارے لیے مانگ لیں۔"

"کیا۔؟" مصطفیٰ کی حیرت واضح تھی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"وہی جو تم نے سنا۔" وہ شعوری کوشش سے

مسکرائی۔

"لیکن۔" اس نے نفی میں سرہلایا۔ "یہ کیسے۔"

"اماں نے تم سے اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا اور تم نے اچھے بچوں کی طرح اس خواہش پر سرجھکادیا۔ لیکن میں تمہاری طرح اچھی بچی نہیں ہوں اور میں نے تمہارے لیے جوزی کو پسند کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کے ساتھ خوش رہو گے۔" اور اس نے ہونٹ مزید پھیلائے۔

"تم اس سے محبت کرتے ہو مصطفیٰ!؟" وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور دل تھا کہ تکرار کیے جاتا تھا کہ وہ کہہ دے کہ میں تو جوزی سے محبت نہیں کرتا۔ لیکن مصطفیٰ نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ بے حد مضطرب سا نظر آنے لگا تھا۔ اس نے دو تین بار بے یقینی سے خوش جمال کی طرف دیکھا۔ وہ خوب صورت تھی۔ جوزی سے زیادہ خوب صورت لیکن دل تو جوزی کے نام پر دھڑکا تھا۔

"تمہارا کیا خیال تھا کہ میں تمہارے دل کا حال نہیں جانتی۔" خوش جمال نے نگاہیں جھکالیں۔ "اب جلدی سے بتاؤ۔ میں اور اماں کس روز جوزی کے گھر جائیں۔"

"ابھی نہیں۔ پہلے میں خود جوزی سے بات کرلوں۔"

"ہیں تو کیا تم نے ابھی تک اس سے بات نہیں کی؟"

خوش جمال نے آنکھیں پھیلائیں۔ اور خود کو اس اداکاری پر آسکر ایوارڈ کا حق دار قرار دیا۔ دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا وہ ہنس رہی تھی۔

"تم کس تردد میں پڑگئے ہو غلام مصطفیٰ میں بابا اور اماں ہم سب تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔ اور کل ہم جوزی کے گھر۔"

"نہیں خوش جمال! ابھی نہیں کہا نا پہلے میں اس سے بات کرلوں۔"

وہ ابھی تک متذبذب سا خوش جمال کو دیکھ رہا تھا۔

کیا پہلے اس کی آنکھوں نے دھوکا کھایا تھا یا آج دھوکا کھارہی ہیں۔ اس کا فون بج رہا تھا۔

"فون تو اٹھاؤ مصطفیٰ!؟" خوش جمال نے کہا تو اس نے چونک کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف جوزے تھا۔

"جی سر۔ میں کچھ اپ سیٹ تھا اس لیے۔"

"تم لوگوں کی پروا مت کرو غلام مصطفیٰ۔ وہ جب تمہارا کھیل دیکھیں گے تو انہیں یاد نہیں رہے گا کہ تم کون ہو۔ مجھے شرمندہ مت ہونے دو۔" جوزے کہہ رہا تھا۔

"سر۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔"

"ان شاءاللہ!" خوش جمال نے آہستگی سے کہا اور اسے باتیں کرتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب اس میں مزید وہاں کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ اور ابھی اسے اماں سے بھی بات کرنا تھی۔ جو بے حد خوش تھیں۔ اندر جوزے اسے ڈانٹ رہا تھا۔

"میں نے تم پر اس لیے محنت نہیں کی تھی کہ تم ہمت ہار کر کھیلنا ہی چھوڑ دو فوراً" مجھے ملو۔"

اور کچھ ہی دیر بعد وہ تیار ہو کر گھر سے نکل رہا تھا خوش جمال نے اپنے کمرے سے اسے جاتے دیکھا اور بے فکری سے سوچا کہ اس نے اپنی محبت کھو کر اس کا کیریر بچالیا تھا۔ اس نے ایک فٹ بالر کو ضائع ہونے سے بچالیا تھا۔ لیکن اس کا اپنا دل جو۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور اس کے رخسار بھگو گئے۔ اسے یقین تھا کہ اب مصطفیٰ دل لگا کر کھیل سکے گا اور ایسا ہی ہوا تھا اگلے چند میچز میں اس نے شان دار گول داغے تھے اور شائقین نے اسے بے تحاشا سراہا تھا اور جوزے نے فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

اسے ابھی تک جوزی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دوبار اس نے اسے فون بھی کیا تھا۔ لیکن اس نے فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ آج اس کا ارادہ اس کے اسٹور پر جانے کا تھا۔ وہ جوزے کے ساتھ اولڈ ٹریفلڈ سے نکلا تو صحافیوں نے اسے گھیر لیا تھا وہ اس سے مختلف سوال کررہے تھے۔ جوزے کی مدد سے بمشکل ان سے جان چھڑا کر وہ اپنی کار تک آیا تھا۔ اور کار میں

بیٹھتے ہوئے جب اس نے وقت دیکھا تو نو بج رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ اسٹور بند ہو چکا ہو گا اور۔۔۔ خیر کل سہی۔ وہ بہت آرام سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اور اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ خوش جمال کے متعلق کچھ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔ چند دن پہلے اسے لگا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ عام دنوں سے زیادہ۔ اور اب بھی وہ اسے غم زدہ نظر نہیں آئی تھی اور اس نے جوزی کے ساتھ اس کی شادی کے حوالے سے کافی باتیں کی تھیں۔

پچھلے دو دن سے وہ انکل سیف اللہ کے ہاں تھی۔ اور اس نے فاطمہ کو فون کر دیا تھا کہ عافیہ گھر آئی ہوئی ہے اور وہ مجھے آنے نہیں دے رہی۔ عافیہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ اس نے گاڑی کا رخ انکل سیف اللہ کے گھر کی طرف موڑا۔ وہ ایک بار پھر خوش جمال سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر آدھے راستے سے ہی پلٹ پڑا۔ نہیں بھلا میں کیا کہوں گا اس سے۔ میں خوامخواہ ہی پریشان ہو رہا ہوں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ جوزی کا نام کیوں لیتی اس کے سامنے۔ اب وہ پھر گھر کی طرف جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے بریک پر پاؤں رکھا تھا' سامنے سے کوئی دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے دو آدمی تھے۔ "بچاؤ۔ بچاؤ۔" دوڑنے والی لڑکی تھی اور چلا رہی تھی۔

"ہیلپ' ہیلپ!" وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ لڑکی کے پیچھے بھاگنے والے آدمی اس کے سامنے رک گئے تھے غیر ارادی طور پر لڑکی کو اس نے بازو سے پکڑ کر پیچھے کیا۔ اور ابھی وہ ان سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ دونوں آدمی اس پر پل پڑے ان کے ہاتھوں میں موٹے ڈنڈے تھے۔ زمین پر گرتے ہوئے اس نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ "بھاگ جاؤ۔" لیکن وہ اطمینان سے کھڑی تھی۔ دونوں آدمی اسے بری طرح مار رہے تھے۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔

"ٹانگیں توڑ دو۔"

بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس نے لڑکی کی آواز سنی تھی۔ لیکن سر پر پڑنے والی چوٹ نے اسے کچھ سوچنے نہیں دیا تھا بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے کانوں میں کسی گاڑی کی آواز آئی تھی اور ساتھ ہی لڑکی کی آواز۔

"بھاگو۔ جلدی۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں تھا سب سے پہلے اس کی نظر جس چہرے پر پڑی' وہ مجی الدین کا تھا اور ان کے ساتھ ہی جوزے تھا پریشانی جس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر دونوں ایک ساتھ اس پر جھکے تھے۔

"کیا ہوا۔ کیسے ہوا یہ سب۔؟" کیا ہوا تھا اس نے ذہن پر زور دیا اور اٹھنے کی کوشش کی ٹانگوں میں درد کی ٹیس اٹھی تھی۔

"تم سڑک پر زخمی حالت میں ملے تھے۔ وہ تو شکر ہوا کہ پولیس کی ایک پیٹرول کار نے تمہیں دیکھ لیا اور اسپتال پہنچایا۔" مجی الدین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اٹھنے سے منع کیا۔

"تو بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے گاڑی کی جو آواز سنی تھی وہ پولیس کی پیٹرول کار تھی۔ اس نے سوچا۔ سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جوزے تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ ڈاکٹر سے تفصیلی بات کر کے آ رہا تھا۔ اگرچہ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی' لیکن فریکچر ہوا تھا اور بیس سے پچیس دن تک کے لیے پلاسٹر لگنا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اپریل میں ہونے والے یورپین چیمپنز لیگ کے مقابلوں میں وہ شرکت نہیں کر سکے گا۔ تشویش میں مایوسی بھی شامل ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا تھا کیا کوئی؟" اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے ساری بات بتا دی۔

"اوہ مائی گاڈ! کیا ضرورت تھی ہمدردی کرنے کی؟" جوزے کی مایوسی غصے میں ڈھل گئی۔ "کیا تم نہیں جانتے تھے کہ یہ میچز تمہارے کیریر کے لیے کتنے اہم تھے۔۔۔ کم از کم تین ماہ سے پہلے تم کسی میچ میں شرکت نہیں کر سکتے۔ میں نے نئی ڈاکٹروں سے بات کی ہے۔

پلاسٹر کھلنے کے بعد بھی تمہیں ریسٹ اور ورزش کی ضرورت ہوگی۔"

مصطفیٰ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ وہ خود اور اس کا خاندان سب ان میچز کے متعلق کتنے پرجوش ہے۔ فاطمہ اور خوش جمال ہر لمحہ اس کی کامیابیوں کے لیے دعاگو تھیں۔ اور اسے گمان سا تھا کہ خوش جمال۔۔۔

اس نے معذرت طلب نظروں سے جوزے اور محی الدین کو دیکھا اور اپنی نم پلکوں کو انگلیوں سے پونچھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کسی انسان کی مدد کرنا میرے لیے میرے کیریر سے زیادہ اہم ہے سر۔ انسان کیریر سے زیادہ اہم ہے۔۔۔ میں نہیں جانتا تھا کہ دھوکا اور فراڈ ہے۔۔۔ میرے سامنے ایک عورت تھی جو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔"

"اٹس اوکے!" جوزے کے چہرے کے سخت عضلات نرم ہوئے تھے۔ اور محی الدین کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش تھی۔

"تم نے ٹھیک کہا۔"

جوزے نے اس کے کندھے تھپکے۔

"ورلڈ کپ تمہارا منتظر ہے ینگ مین۔ تم صحت مند ہو کر یقیناً" ورلڈ کپ میں شرکت کر سکو گے بلکہ اس سے پہلے والے میچز میں بھی۔"

تب ہی دروازے کو ہلکا سا ناک کر کے ڈیوڈ اندر داخل ہوا۔

"ہیلو مصطفیٰ۔۔۔ تمہارے حادثے کا بہت افسوس ہوا۔" مصطفیٰ اور محی الدین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بہتر ہوں، لیکن تمہیں کیسے پتا چلا۔"

مصطفیٰ نے پوچھا۔

"وہ ایلن نے بتایا شاید اسے جوزی نے بتایا ہو۔ میں پریشان ہو کر چلا آیا زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟"

محی الدین بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پولیس کے فون پر وہ گھر میں کسی کو بتائے بغیر اسپتال آئے تھے اور پھر ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے مصطفیٰ کے فون پر جوزے کی کئی مس کالز کے بعد ایک کال اٹینڈ کر کے اسے اس حادثے کا بتایا تھا۔

"بائیں ٹانگ میں فریکچر ہے۔"

جوزے بے حد ناراض نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ڈیوڈ نے اسے بہت مایوس کیا تھا۔ لڑکیاں اور شراب۔ اسے تباہ کر رہی تھیں۔ آج اگر وہ فٹ ہوتا تو اسے مصطفیٰ کے حادثے سے اتنی پریشانی نہ ہوتی اسے۔

"اوہ!" ڈیوڈ کے چہرے پر یکدم چمک آئی تھی۔

"پھر تو یہ اپریل میں ہونے والے مقابلوں میں شرکت نہیں کر سکے گا۔"

"بہت افسوس کے ساتھ بدقسمتی سے لیس۔"

جوزے اپنے لہجے کی تلخی چھپا نہیں سکا تھا۔ مانچسٹر یونائیٹڈ کلب کی کامیابیاں اس کی زندگی کا حاصل تھیں اسے اس کلب اور فٹبال سے عشق تھا۔

"کبھی کبھی ہمدردی مہنگی بھی پڑ جاتی ہے اور۔۔۔"

وہ بات کرتے کرتے کسی خیال سے اچانک خاموش ہو گیا تھا۔ مصطفیٰ اور محی الدین کی نظریں بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف اٹھی تھیں۔

ان تینوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔۔۔ مصطفیٰ کو یاد آیا کہ جب اس نے محی الدین سے ڈیوڈ کے رویے کا شکوہ کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا۔

"یاد رکھو مصطفیٰ! جب کوئی دوست بغیر وجہ کے نظر چرانے لگے، چھپنے لگے اور ملنے سے کترائے تو سمجھ لو کہ اس نے تمہارے خلاف سازش کی ہے، تمہارا کچھ چرایا ہے یا تمہیں کوئی نقصان پہنچایا ہے، لیکن تمہیں اس کا علم نہیں ہے۔"

"لیکن بھلا ڈیوی نے میرا کیا چرانا ہے اور میرے خلاف کیا سازش کرنی ہے۔"

اس روز اس نے سوچا تھا، لیکن اس وقت جو ادراک اسے ہوا تھا اس نے جیسے اس کا دل چیر دیا تھا۔

اس ملک میں وہ اس کا واحد دوست تھا۔ اس کے

ہوتے ہوئے اس نے کبھی کسی اور کو دوست بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اس اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کی جو دل چیرتی تھی۔

محی الدین، جوزے اور وہ.... تینوں نے ایک ہی بات سوچی تھی۔ جوزے کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا بن گیا تھا۔ محی الدین افسردگی سے مصطفیٰ کو دیکھ رہے تھے۔ ڈیوڈ کے ہونٹوں پر پراسراری مسکراہٹ تھی اور وجود سے انجانی خوشی پھوٹتی تھی۔ آنکھوں کی سرخی سے پتا چلتا تھا کہ وہ ابھی بھی کچھ نشے میں ہے۔

"او کے غلام مصطفیٰ! میں پھر چکر لگاؤں گا۔"

جوزے نے محی الدین سے مصافحہ کیا۔ مصطفیٰ کے کندھے پر تھپکی دی اور ڈیوڈ پر ایک غصیلی نظر ڈالی۔ جو کچھ ابھی اس نے جانا تھا۔ اس نے اسے بہت تکلیف دی تھی۔ اس نے مانچسٹر یونائیٹڈ کو بہت دھچکا پہنچایا تھا۔

"کیا یہ اب کبھی نہیں کھیل سکے گا؟"

ڈیوڈ نے محی الدین سے پوچھا، لیکن جواب جوزے نے دیا تھا۔

"یہ کھیلے گا۔ اس لیے کہ یہ فٹ بال کھیلنے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے ڈیوڈ کیمرون.... تم ڈیوڈ بیکھم نہیں بن سکتے، لیکن یہ ڈیوڈ بیکھم اور رونالڈو کی جگہ لے گا۔"

ایک نظر ڈیوڈ کے حیران چہرے پر ڈال کر جوزے نے قدم باہر کی طرف بڑھا لیے۔ ڈیوڈ کا منہ حیرت سے کھلا تھا اور وہ جوزے کے پیچھے ہی باہر نکلنے لگا تو محی الدین نے اس کی طرف دیکھا۔

"اچھے دوست وہ ہوتے ہیں ڈیوڈ کیمرون! جو دوستوں کی راہ کے کانٹے چن لیتے ہیں۔ ان کی راہوں میں کانٹے نہیں بچھاتے۔ تمہارے آنے کا شکریہ۔"

محی الدین نے ایسا کیوں کہا اس کا خمار آلود ذہن سمجھ نہیں سکا اور اسے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے جو چاہا تھا وہ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور محی الدین مصطفیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ انہوں نے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے۔

"ایسے دوستوں کو دل کی مسند سے اتار دینا چاہیے غلام مصطفیٰ!"

"لیکن اس نے تو زندگی میں جس جس کو ایک بار دوست کہہ دیا اسے کبھی دل سے نہ نکال سکا تھا اور یہ ڈیوڈ کیمرون۔۔۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور محی الدین ہولے ہولے اس کا سر سہلانے لگے۔

۞ ۞ ۞

"مصطفیٰ... مصطفیٰ کہاں ہو؟"

خوش جمال اسے پکارتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ وہ ٹانگیں پھیلائے صوفے کی پشت سے سر ٹیکے آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے مصطفیٰ؟" وہ اسے یوں آرام سے بیٹھے دیکھ کر حیران ہوئی۔

"نہیں جانا تھا۔"

"کیا جانا بہت ضروری ہے خوش جمال؟" اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو نہیں جاتے۔" خوش جمال اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

پلاستر اترنے کے بعد ٹانگ میں تھوڑا کھنچاؤ تھا اس لیے وہ فزیو تھراپی کے لیے جا رہے تھے۔

"بس آج جی نہیں چاہ رہا۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"تم کچھ پریشان ہو مصطفیٰ! پریشان نہ ہو ڈاکٹر صاحب کہہ تو رہے تھے کہ بہت جلد تم پہلے کی طرح دوڑ سکو گے اور۔۔"

"نہیں۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا خوش جمال! ڈیوڈ نے ایسا کیوں کیا۔ دوست ہو کر چھپ کر وار کیا۔ وہ مجھ سے کہتا۔ تم مت کھیلو۔ میں وجہ پوچھے بغیر چھوڑ دیتا کھیلنا.... میں چھوڑ سکتا تھا خوشی وہ مجھے آزماتا تو۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"اس نے مجھ پر ظلم کیا خوشی! ظلم یہ نہیں کہ اس نے مجھے مروایا... میری ٹانگیں توڑنے کی کوشش کی۔ بلکہ ظلم یہ ہے کہ اس نے لفظ دوست پر ضرب لگائی میری دوستی کی توہین کی... یہ اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی خوش جمال...!"

"ٹیوات مصطفیٰ!" وہ اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "وہ تمہارا دوست نہیں تھا۔ دوست ہوتا تو ایسا نہ کرتا وہ تمہاری دوستی کے قابل نہیں تھا۔"

"جس تکلیف سے میں گزر رہا ہوں وہ کیسے اتنی جلدی فراموش کر سکتا ہوں خوش جمال!"

مصطفیٰ نے نظریں اٹھائیں اور کچھ دیر یونہی اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ایسی نہیں لگ رہی تھی جیسے ہمیشہ نظر آتی تھی۔ خوش، مطمئن اور پرسکون۔ وہ زندگی جو اس کے چہرے پر اسے ہمیشہ رقص کرتی نظر آتی تھی وہ زندگی مفقود تھی اور اس کی آنکھوں میں ملال کے رنگ بہت گہرے تھے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے خوشی؟"

"نہیں۔ مجھے کیا ہونا ہے۔" وہ واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

"نہیں۔ کچھ تو ہے خوش جمال! تم بہت اپ سیٹ لگ رہی ہو اور کچھ کمزور بھی لگ رہی ہو۔ پلیز بتاؤ نا کیا بات ہے۔ سب ٹھیک ہے نا... آفس کا کوئی پرابلم؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس تمہاری وجہ سے ہم سب پریشان تھے۔ بابا، اماں اور میں، لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔ بابا تو بہت ٹینشن میں تھے کہ پلاستر اترنے کے بعد کہیں کوئی ڈیفیکٹ نہ رہ جائے۔ اچھا خیر یہ بتاؤ۔ تم نے جوزی سے بات کی تھی؟"

"نہیں... میرا خیال تھا کہ ٹھیک ہونے کے بعد ہی بات کروں گا۔ اور کافی دنوں سے وہ نظر بھی نہیں آئی۔"

"اوہ۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اس کے انکل اور آنٹی سات ہفتوں کے لیے پاکستان گئے ہیں اور اسے اپنے بچوں کے پاس گھر چھوڑ گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ آجائے تو بات کروں گا۔" اس کی نظروں کے سامنے جوزی کا سراپا لہرایا اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"کیا وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے مصطفیٰ؟" اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں... کبھی اس نے ظاہر نہیں کیا، لیکن کیا اس سے فرق پڑتا ہے خوشی میں تو اس سے محبت کرتا ہوں۔"

پہلی بار اس نے خوش جمال کے سامنے کھل کر اعتراف کیا۔

"شاید نہیں، لیکن اگر وہ کہیں اور انٹرسٹڈ ہو اس کے والدین انکار کر دیں تو...؟" خوش جمال کی نظریں ابھی تک کارپٹ کے ڈیزائن سے الجھی ہوئی تھیں۔

"نہیں..." مصطفیٰ نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "ایسا نہیں ہے... ہوتا تو وہ بتاتی اور انکار میرا نہیں خیال کہ اس کے پاپا انکار کریں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے تم اس سے بات کر کے بتا دینا۔ بابا اور اماں بات کریں گے اس کے پیرنٹس سے۔"

خوش جمال اٹھ کھڑی ہوئی۔ آنسو نکلنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ کتنا مشکل ہوتا ہے نا اپنی محبت کسی اور کو سونپنا۔

"اوکے۔ پھر تم فون کر دینا ڈاکٹر کو اور کل کسی وقت کا ٹائم لے لینا۔"

وہ بات کر کے رکی نہیں تھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ مصطفیٰ نے پاس پڑا فون اٹھا کر ڈاکٹر کے اسسٹنٹ کا نمبر ملایا۔ وہ ایک خوش مزاج شخص تھا اور اس کے کھیل کا مداح۔

"چند دنوں بعد ہی آپ کھیل کے میدان میں ہوں گے۔ غلام مصطفیٰ۔" ہمیشہ کی طرح اس نے آج بھی کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"ان شاء اللہ!" اور واقعی چند دنوں بعد وہ پریکٹس کے لیے اولڈ ٹریفرڈ آیا تو اس کا کھیل دیکھنے کے بعد

جوزے نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

"تم یورپین چیمپنز لیگ کے میچز نہیں کھیل سکے، لیکن مجھے یقین ہے آنے والے تمام میچز میں تم اپنی شہرت کے جھنڈے گاڑو گے۔"

ایسا یقیناً" ہونے والا تھا۔ اس روز وہ جوزے اور محی الدین کے ساتھ پارکنگ کی طرف جارہا تھا جب صحافیوں نے انہیں گھیر لیا۔

"سنا ہے غلام مصطفےٰ کے معاہدے میں توسیع کی جارہی ہے اور انگلش سیزن 2011 کے کھلاڑیوں میں مصطفےٰ کا نام بھی شامل ہے؟" انہوں نے جوزے سے پوچھا تھا۔

"آپ کو یقین ہے کہ غلام مصطفےٰ مانچسٹر یونائیٹڈ کے لیے اچھا انتخاب ہوگا۔"

صحافی دونوں سے تابڑ توڑ سوال کررہے تھے بمشکل ایک گھنٹے بعد وہ ان کے نرغے سے نکلا تھا۔

"اللہ کرے غلام مصطفےٰ تم جوزے کی امیدوں پر پورا اترو۔"

محی الدین نے اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی تو وہ مسکرا دیا۔

محی الدین پروکس ماؤتھ کلب کے ساتھ ان کا ایک دوستانہ میچ دیکھنے آئے تھے۔ اس میچ میں اس نے حیرت انگیز کارکردگی دکھائی تھی اور وہ پروکس ماؤتھ کلب سے تین صفر پر جیت گئے تھے۔ محی الدین اسے محتاط رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے راستے میں ہی اتر گئے تھے۔ انہیں کسی کام سے جانا تھا۔ اور اسے بھی آج جوزی سے ملنا تھا۔ ان تین دنوں میں جوزی سے اس کی صرف چند ملاقاتیں ہوئی تھیں وہ بھی مختصر سی۔ تین بار وہ گھر آئی تھی اور دو بار وہ اسے گھر سے باہر اسٹاپ کی طرف جاتی ہوئی ملی تھی اور اب تو اپنے انکل کے گھر سے آئے ہوئے بھی اسے کافی دن ہوگئے تھے، لیکن اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے وہ اس سے ملنے کے لیے وقت ہی نہیں نکال پارہا تھا۔ کل صبح اس نے اسے گھر سے نکل کر اسٹاپ کی طرف جاتے دیکھا تو فوراً" گھر سے نکل کر تقریباً" دوڑتا ہوا اسٹاپ تک آیا تھا۔

"کیسی ہو جوزی؟" جوزفین نے اس کی طرف دیکھا لمحہ بھر کے لیے جیسے اس کے اندر چراغاں ہوا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"انکل کے گھر سے کب آئی ہو مشاعل۔ کیا میں تمہیں مشاعل کہہ کر بلا سکتا ہوں۔ دراصل مجھے اس نام میں زیادہ اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔"

اس نے ساتھ ہی وضاحت بھی کردی تو جوزفین نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مشاعل! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے آج شام کو تم پارک میں آجانا۔ زیادہ ٹائم نہیں لوں گا۔"

"آج نہیں کل شام چھ بجے۔ آج مجھے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔"

"اوکے ٹھیک ہے۔" اور وہ اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اس کی بس نہیں آگئی۔

اور اب سات بجنے والے تھے وہ لیٹ ہوگیا تھا، لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اس کا انتظار کررہی ہوگی اور ایسا ہی تھا وہ اس کا انتظار کررہی تھی۔

"سوری مشاعل! میں لیٹ ہوگیا۔" وہ اس کے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا۔

"میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی پہلے ہی دیر ہوگئی ہے اور ممی کا تمہیں پتا ہے نا؟" مصطفےٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہاری شاپنگ ہوگئی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ پاپا کچھ دنوں تک پاکستان جارہے ہیں۔ دادا جان اور دادی کے لیے کچھ گفٹ خریدنے تھے۔" اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا تو مصطفےٰ کو احساس ہوا کہ اسے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

"مشاعل! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اماں اور بابا تمہارے گھر آنا چاہتے ہیں، لیکن میں پہلے تم سے بات کرنا چاہتا تھا، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔" اس نے زندگی میں

اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا تھا اور کوئی خواہش نہیں کی تھی کہ یہ سیاہ بھنورا آنکھوں والا لڑکا اس کا ہوجائے۔ وہ اس سے محبت کرے ایسے ہی جیسے وہ اس سے کرتی ہے۔ اتنی نہ سہی اس سے کچھ کم ہی سہی لیکن وہ اس سے محبت کرے اور اب جب کہ اس کی خواہش پوری ہوگئی تھی اور وہ اسے اپنانے کی بات کررہا تھا اس سے محبت کا اعتراف کررہا تھا تو اس کا جی چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر رودے زمین و آسمان ایک کردے۔ سب کچھ جل تھل ہوجائے، لیکن وہ ہونٹ بھینچے بیٹھی تھی۔ وہ خوش قسمت تھی، بہت خوش قسمت کہ غلام مصطفیٰ اس سے محبت کرتا تھا۔

وہ بہت بد قسمت تھی کہ وہ اس محبت کو اپنے سر کا تاج نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ اس شخص کو مایوس کرنے والی تھی جس سے وہ عشق کرتی تھی اور جو بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"وہ ہاں!" اسے جیسے اچانک کچھ یاد آیا تھا اور اس نے اپنی پاکٹ میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی۔

"یہ لاکٹ ہے مشاعل! میں نے تمہارے لیے خریدا تھا۔ چھوٹا سا گفٹ۔" اس نے ڈبیا کھولی۔ گولڈ کی چین میں آنسو کی شکل کا چھوٹا سا سفید زرقون تھا۔

جوزفین نے اس کے ہاتھ میں موجود اس خوب صورت چین کو دیکھا۔ لمحہ بھر کو وہ جیسے سب کچھ بھول گئی وہ سب کچھ جو پچھلے کئی دنوں سے خود کو سمجھاتی آئی تھی۔ کسی خوب صورت جذبے نے اندر زقند بھری تھی اور اس نے ہاتھ پیچھے کرکے گلے میں پڑی چین کا لاک کھولا اور چین اتار کر مٹھی میں بند کرلی۔

عام سی چند پونڈ کی آرٹیفشل چین جس میں موجود چھوٹی سی نگینوں سے بجی صلیب ہمیشہ اس کی شرٹ یا سوئٹر کے اندر ہوتی تھی اور اب اس کی مٹھی میں بند تھی۔ اس نے مسکرا کر مصطفیٰ کی طرف دیکھا اور اپنا رخ موڑا اور مصطفیٰ کے دل میں ایک ساتھ ہزاروں قمقمے جل اٹھے۔

"تھینک یو۔!" اس نے اس کے بھورے بال نرمی سے ہٹائے اور لاکٹ کا لاک کھول کر اس کے گلے میں ڈال دیا اور مسکرایا۔

"اس پذیرائی کا شکریہ جوزی!" وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن وہ اپنے ہاتھ کی بند مٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنی بند مٹھی کھولی اور اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا مصطفیٰ نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور ہاتھ میں موجود چین کو اٹھایا اور اب وہ نگینوں سے بجی اس ننھی سی صلیب کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا یہ کوئی عام لاکٹ تھا یونہی فیشن کے طور پہ پہنا جانے والا یا پھر۔"

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے مصطفیٰ!؟"

اس نے صلیب والی چین اس کے ہاتھ سے اٹھا کر پھر اپنی مٹھی میں بند کرلی۔

درختوں میں لگے ننھے ننھے بلبوں کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے سنہری مائل بھورے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اس نے انہیں پیچھے نہیں کیا تھا۔ اس مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بہت ستا ہوا لگ رہا تھا اور وہ اپنی بند مٹھی کو دیکھ رہی تھی۔

"میرے دادا پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر کے گرجا میں پادری ہیں۔" اس نے اپنی بند مٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور میرا پورا نام مشاعل جوزفین ہے اور پاپا کا نام پال نذیر ہے۔"

اور وہ جو ابھی کچھ سمجھنے نہ سمجھنے کی کیفیت میں تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بند مٹھی کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جکڑ لیا۔

"نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ اس سے کچھ فرق پڑتا ہو۔ محبت میں ہر چیز بے معنی ہوجاتی ہے۔ صرف محبت باقی رہ جاتی ہے۔ جو کچھ نہیں دیکھتی جو بے دھڑک آتش نمود میں کود جاتی ہے۔"

"میری ممی اور پاپا کی آپس میں پہلے دن ہی نہیں بنی تھی۔ وہ جتنا عرصہ پاپا کے ساتھ رہیں روز جھگڑے ہوتے۔"

وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

"پھر ممی اور پپا میں ڈائیورس ہو گئی۔ ممی نے انکل حبیب کے آفس میں جاب کرلی اور پھر ان سے شادی کرلی اور مجھے اپنے ساتھ تمہارے گھر لے آئیں۔ مجھے علم نہیں' لیکن مارتھا ممی کہتی تھیں کہ انہوں نے تمہارے پاپا سے شادی کرنے کے لیے اپنا مذہب تبدیل کرلیا تھا۔"

"مشاعل! مجھے اس سب سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ میں نے کہا نا کہ محبت میں سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے' لیکن تم کیا تمہیں اس سے فرق پڑتا ہے۔"

اس نے اپنے ہاتھ میں دبی اس کی بند مٹھی کھول کر صلیب والی چین کو اٹھا کر لہرایا۔

"مجھے۔" اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے دھواں سا بھرا تھا۔ "نہیں' جب ممی کے ساتھ تمہارے گھر آئی تھی۔" اس نے پھر نظریں جھکالی تھیں۔

"تو تم مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا تم سے کھیلوں' باتیں کروں۔ تمہیں اپنے اس گھر کے متعلق بتاؤں' جو چرچ سے منسلک تھا' لیکن تم مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اس وقت جب میں محبت کے مفہوم تک سے ناآشنا تھی۔ میں نے ہر دن اور ہر رات مقدس مریم سے دعا کی کہ تم میرے دوست بن جاؤ۔ تم مجھے ناپسند نہ کرو۔ جب ممی تمہیں مارتی تھیں تو میرا جی چاہتا تھا کہ تمہاری تکلیف میں لے لوں۔ میں تمہارے لیے روتی بھی اور دعا کرتی تھی کہ وہ درد جو تمہیں ہو رہا ہے وہ مجھے ہو جائے اور تم ٹھیک ہو جاؤ۔"

اس نے ذرا سی گردن اونچی کی۔ گوندکی لکیر والی سنہری رو پہلی چین اس کی خوب صورت گردن میں سج گئی تھی اور زرقون کا آنسو گردن سے نیچے جلد سے چپکا ہوا تھا۔

"تو مشاعل! اللہ نے تمہاری دعا سن لی۔" وہ مسکرایا۔

"اللہ نے میرے دل میں تمہاری محبت بھر دی۔"

"ہاں اللہ نے میری دعا سن لی' لیکن میں۔ میرا مذہب۔"

اس کی آنکھیں یک دم آنسوؤں سے بھر گئیں اور آنسو رخساروں پر پھیل آئے۔

"مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا مشاعل! تم بتاؤ۔ کیا تمہیں اس سے فرق پڑتا ہے؟" اس نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

"وہ محبت جو مجھے تم سے ہے غلام مصطفیٰ اسے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن مجھے فرق پڑتا ہے۔"

وہ اب زارو قطار رو رہی تھی اور مصطفیٰ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرے خاندان کو فرق پڑتا ہے۔ میں اپنے پاپا کا مان نہیں توڑ سکتی غلام مصطفیٰ۔ میرا دادا ایک پادری ہے۔ میں نہیں دیکھ سکتی کہ پورا خاندان میرے پپا پر انگلیاں اٹھائے۔ میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں' بچپن سے کرتی ہوں۔"

زارو قطار روتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"مجھے معاف کردو مصطفیٰ! میں نے تمہیں تکلیف دی' میں نے تمہیں رنج پہنچایا۔ جس طرح میں تمہیں ممی کی مار سے نہیں بچا سکتی تھی اس طرح تمہیں اس دکھ سے بھی نہیں بچا پا رہی۔"

مصطفیٰ ساکت بیٹھا تھا۔ صلیب والی چین اس کے ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ مشاعل نے جھک کر صلیب اٹھائی اسے چوما اور ساکت بیٹھے مصطفیٰ کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی اور بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی یوں جیسے اس کی شبیہہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں محفوظ کر رہی ہو۔ جیسے اسے پتا ہو کہ آج کے بعد پھر وہ ان سیاہ آنکھوں کو نہیں دیکھ سکے گی۔ آنسو اب بھی اسی روانی کے ساتھ اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

مصطفیٰ اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا' وہ اس کے آنسو

پونچھنا چاہتا تھا' لیکن اس کے ہاتھ یونہی گود میں دھرے رہے۔ اس کے اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا' اسے تسلی دینا چاہتا تھا اسے بتانا چاہتا تھا وہ اس سے ناراض نہیں ہے۔

وہ صحیح کہہ رہی ہے' یہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ اپنے خاندان کو چھوڑنا انہیں تکلیف دینا۔ محبت مرتی نہیں ہمیشہ دل کے نہاں خانوں میں زندہ رہتی ہے۔ تو۔۔۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن لفظ اس کے اندر ہی بن کر ٹوٹ رہے تھے۔

وہ یونہی روتی ہوئی مڑی اور ہولے ہولے چلنے لگی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تب وہ چونکا اسے لگا جیسے پارک میں موجود روشنیاں اور قمقمے یک دم بجھ گئے ہوں۔

پھر وہ اٹھا اور تیز تیز چلتا ہوا پارک سے باہر آیا۔ وہ کچھ فاصلے پر اسے یونہی سر جھکائے ہولے ہولے چلتی نظر آئی۔ گھر پارک سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ یہاں تک پیدل آئی ہو گی اور اب پیدل ہی واپس جا رہی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنی گاڑی کو دیکھا اور اس کی طرف بڑھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ اس کے قریب گاڑی روک چکا تھا۔

"آجاؤ مشاعل!"

اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا۔ مشاعل نے رک کر ایک نظر اسے دیکھا اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔ آنسو اب بھی رخساروں کو بھگوتے ہوئے گردن اور گردن سے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

"مت روؤ مشاعل۔۔۔!" اس نے بے بسی سے مشاعل کی طرف دیکھا۔ "میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا۔ رشتوں کا مان نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ رہی محبت۔۔۔ تو وہ تو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔۔۔ میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔"

اس سے زیادہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

وہ سنجیدگی سے سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے کیوں کہ اس کے آنسوؤں سے مصطفیٰ کو تکلیف ہو رہی تھی اور وہ اسے تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی وہ صرف ایک بات سوچنا چاہتی تھی کہ وہ مصطفیٰ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہے۔ جب وہ گھر کے سامنے اتری تو ایک اور خواب لمحہ دل کی البم میں محفوظ ہو چکا تھا۔

مصطفیٰ تیزی سے گاڑی آگے نکال لے گیا تھا اور پھر کتنی ہی دیر تک وہ یونہی بے مقصد مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھرا اور پھر محی الدین اور فاطمہ کی پریشانی کے احساس نے اسے چونکایا اور نادم سا ہو کر اس نے گھر کا رخ کیا۔

وہ چپکے سے اپنے کمرے میں جا کر سوجانا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ڈور بیل بجانے کے بجائے اپنی چابی سے دروازہ کھول لیا تھا۔ وہ کم از کم خوش جمال کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو جیسے اس کے اندر اتر کر اس کے دل کا حال جان لیا کرتی تھی' لیکن اس کے کمرے کے دروازے کے پاس سے دبے پاؤں گزرتے ہوئے وہ سسکیوں کی آواز پر ٹھٹک کر رک گیا۔ کیا خوش جمال رو رہی تھی' لیکن کیوں اس سے پہلے کہ وہ نیم وا دروازے کو دھکیل کر اندر جاتا اسے عافیہ کی آواز سنائی دی۔ وہ آج صبح سے ادھر آئی ہوئی تھی اور شاید خوش جمال نے اسے روک لیا تھا۔

"لیکن تم نے ایسا کیوں کیا خوش جمال؟ اپنی محبت کی قربانی کیوں دی۔۔۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ جوزی کو بھول جاتا۔۔۔ تم اتنی اچھی ہو کہ۔۔۔"

"ہاں شاید۔" خوش جمال کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "لیکن میں نہیں چاہتی تھی عافیہ! کہ اس کا کیریر تباہ ہو۔ وہ اپ سیٹ تھا اتنا کہ کھیل چھوڑ دینے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی پریشانی اس کے کھیل کو متاثر کر رہی تھی۔ وہ اماں اور بابا کی خواہش رد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی محبت کی قربانی دے رہا تھا تو کیا میں نہیں

دے سکتی تھی۔"

"تم نے اماں کو بتایا؟" عافیہ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔ میں نے کئی بار بتانا چاہا لیکن اماں کا خوشی سے دمکتا چہرہ دیکھ کر میری ہمت جواب دے گئی۔ وہ ایک بار جوزی سے بات کر لے تو پھر۔"

اور اس نے قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھا دیے اس کی آنکھوں کے سامنے کئی منظر آرہے تھے۔

خوش جمال کی بھیگی پلکیں۔

اس کا متفکر چہرہ

اس کی پھیکی رنگت.....

اور ہر منظر اس کہانی کی تصدیق کر رہا تھا جس کا غم اسے اب ہوا تھا' لیکن جس کا اوراک اس کے اندر پہلے سے موجود تھا۔

☼ ☼ ☼

دبئی کے ایک خوب صورت ولا کے ٹی وی لاؤنج میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے ٹی وی دیکھتے ہوئے حبیب الرحمن ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ بہت سارے صحافیوں میں گھرے ہوئے غلام مصطفے کا کلوز اپ دکھایا جا رہا تھا۔ غلام مصطفے ابھرتا ہوا پاکستانی فٹ بالر۔ ایک بار پھر مانچسٹر یونائیٹڈ کا حصہ بننے جا رہا ہے۔

"غلام مصطفے آپ کا تعلق پاکستان سے ہے۔"

اب پھر وہ صحافیوں کے ہجوم میں گھرا نظر آرہا تھا اور ایک صحافی پوچھ رہا تھا۔

"جی!" غلام مصطفے کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ "پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر سے تعلق ہے میرا' لیکن میں پچھلے دس سالوں سے یہاں ہوں۔ میں نے اپنے کھیل کا آغاز آرسنل کلب کی طرف سے کیا تھا۔"

"آپ کو یہ شوق اپنے والد کی طرف سے ورثے میں ملا۔ آپ کے ڈیڈ اور مرحوم بھائی بھی اچھے کھلاڑی ہیں۔"

"جی!" اس نے پاس کھڑے محی الدین کی طرف دیکھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب محی الدین نے صحافی کی بات کا جواب دیا تھا۔

"اسے یہ شوق اپنے ماموں اور اپنے نانا سے ملا ہے۔ اس کے مرحوم ماموں عبدالهادی بہت اچھے کھلاڑی تھے اور اس کے والد کو کھیلنے کا شوق نہیں تھا۔"

محی الدین کو ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ بات یاد رہتی تھی کہ لے پالکوں کو ان کے باپوں کے ناموں سے محروم مت کرو۔

"آپ... !" صحافی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"میرے بابا ہیں' میرا سب کچھ۔" غلام مصطفے کی آنکھوں میں محی الدین کے لیے عزت تھی احترام تھا۔ محبت تھی۔

"ہاں میں اس کا بابا ہوں اور یہی میرا سرمایہ اور میری عمر بھر کی پونجی ہے' لیکن اس کے حقیقی باپ کا نام حبیب الرحمن تھا۔"

ان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لیا تھا' اسکرین کا منظر بدل گیا تھا۔ اب نیوز کاسٹر کوئی اور خبر سنا رہا تھا۔

"زری!" ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ اپنے کمرے سے ننی بھی بھاگتا ہوا آگیا تھا۔

"کیا ہوا پاپا۔"

"زری!" وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر پھر چیخے تھے۔

"کیا ہوا؟" زری گیلے ہاتھ صافی سے پونچھتی ہوئی کچن سے آئی تھی۔

"تم نے... تم نے ہادی کی لاش کو تھانے میں اس کے کپڑوں سے پہچانا تھا اور اس کے جوتوں سے۔"

"جی جی!"

"جھوٹ بولتی ہو تم۔ جھوٹ بولا تم نے۔" وہ یک دم چیخے اور اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھے وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی۔

"تم نے پہچانا تھا ہادی کی لاش کو؟"

"مجھے لگا تھا کہ وہ ہادی ہے۔" زری نے خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"نہیں۔ تمہیں لگا نہیں تھا۔ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ تم جانتی تھیں۔ تمہیں پتا تھا۔ وہ ہادی نہیں تھا۔" انہوں نے آنسو بھری آنکھوں سے سنی کی طرف دیکھا اور ٹوٹتی آواز میں بولے۔

"اس عورت کو میری نظروں سے دور کردو۔ ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔"

"مما پلیز! آپ باہر جائیں۔"

سنی نے زری کے بازو پر ہاتھ رکھا اور مڑ کر حبیب الرحمٰن کی طرف دیکھا، جو صوفے پر گرسے گئے تھے۔

"پاپا۔!" وہ تیزی سے ان کے پاس آکر بیٹھ گیا اور اپنا بازو ان کے گرد حمائل کیا۔

"کیا ہوا۔ پلیز مجھے بتائیں ساری بات۔"

"اس عورت نے مجھ پر بہت ظلم کیا۔ تمہارے بھائی کو گھر سے نکال دیا۔ اور۔۔۔"

ان کی آواز گھٹ گئی۔ سر جھک گیا اور آنکھیں برسنے لگیں۔ کتنے کرب سے گزرے تھے وہ، کتنی اذیت اٹھائی تھی انہوں نے۔ سینے میں ایک زخم تھا مسلسل رستا ہوا۔

کراچی میں خلاف توقع انہیں بہت دن لگ گئے تھے۔ وہ دبئی میں کسی کے ساتھ پارٹنر شپ میں بہت بڑا بزنس کرنے والے تھے اور جب وہ واپس آئے تو لاؤنج میں بیٹھے سب کو گفٹ دیتے ہوئے انہیں ہادی کا خیال آیا تھا۔

"ہادی کہاں ہے؟"

"وہ تو گھر سے بھاگ گیا تھا، اسی روز جب اس نے سنی کو گرایا تھا۔" زری نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"کیا!" انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"میں نے بہت ڈھونڈا ہر جگہ نہیں ملا۔" زری سر جھکائے ہوئے تھی۔

"اور تم نے مجھے بتایا نہیں ذکر تک نہیں کیا ہر دوسرے دن میں فون کرتا تھا۔"

"میں نے تمہاری پریشانی کے خیال سے نہیں بتایا تھا۔"

"وہ میرا بیٹا تھا کوئی چیز نہیں تھا۔"

"بچوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں آپ نے اسے فون پر اس بری طرح ڈانٹا کہ وہ۔"

زری نے انہیں الزام دیا تو وہ بھی یہی سمجھنے لگے کہ ان کی ڈانٹ سے۔

اور پھر انہوں نے اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا پاگلوں کی طرح گاڑی دوڑاتے پھرے۔ ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھا۔ تھانے میں رپورٹ لکھوائی اور اسی روز گیٹ کے باہر والی دیوار پر ان کی اچانک نظر پڑی تھی۔ "میں نے سنی کو نہیں گرایا پاپا! ممی نے۔" اور انہوں نے مشاعل اور مینو سے پوچھا تھا۔ مینو تو پہلے خاموش رہی تھی، لیکن مشاعل نے تصدیق کی تھی کہ سنی کو گرایا ہی نہیں تھا۔ وہ تو یونہی رو رہا تھا۔

انہیں اس لمحے زری سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھنا اور بولنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھنٹوں گیٹ کے باہر کھڑے اس کے لکھے جملے کو پڑھتے رہتے۔ اس پر انگلیاں پھیرتے۔

"مجھے یقین ہے ہادی۔۔۔!"

وہ زیر لب کہتے اور اس کے لکھے لفظوں پر ہونٹ رکھ دیتے اس کی اس آخری تحریر کو انہوں نے اتنی بار چوما کہ ان کے ہونٹ چھل گئے تھے۔ وہ راتوں کو اٹھ کر اس کے کمرے میں چلے جاتے اس کا تکیہ اس کے کھلونے اس کی کتابیں ایک ایک چیز کو چومتے لپٹ لپٹ کر روتے تھے۔

اور پھر انہیں دبئی جانا پڑ گیا۔ ناگزیر ہو گیا تھا انہیں سارے معاہدوں پر دستخط کرنے تھے۔ اگر وہ نہ جاتے تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے۔ ہو سکتا ہے سارا سرمایہ ہی ڈوب جاتا، لیکن وہ بہت سارے دن وہاں نہیں رہے تھے۔ جلد لوٹ آئے تھے اور زری نے انہیں بتایا کہ ہادی کی لاش مل گئی تھی اور انہیں لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہو جائیں گے۔ یہ دکھ برداشت نہیں کر پائیں گے۔ بہت وقت لگا تھا انہیں سنبھلنے میں اور پھر وہ اپنے ایک دوست عبدالرحمٰن کو گھر کرائے پر دے کر دبئی آگئے تھے۔

"پاپا!" سنی نے آہستگی سے کہا۔ "حوصلہ کریں۔۔۔

مت اس طرح روئیں آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"حوصلہ کیسے حوصلہ کروں سنی۔ تمہاری ماں نے مجھے مار دیا۔ اس عورت نے فریب دیا مجھے۔ نہ جانے کس کی آنکھوں کا نور تھا وہ جس کی قبر پہ یہ مجھے لے گئی۔ میں اتنے سالوں سے تڑپ رہا ہوں۔ میرا بیٹا اس دنیا میں نہیں رہا۔ اللہ کی مرضی اتنی ہی زندگی تھی۔ میں خود سے کہتا لیکن اسے میرے گھر سے کفن بھی نصیب نہیں ہوا لاوارثوں کی طرح دفن ہوا۔ یہ اذیت میں آج تک سہ رہا تھا۔ یہ عورت ڈائن ہے سنی۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ وہ زندہ ہے۔"

"پاپا پلیز! مجھے ساری بات بتائیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"

حبیب الرحمٰن نے اپنے آنسو پونچھے اور ہولے ہولے اسے بتانے لگے۔

☼ ☼ ☼

"پاپا!" جوزفین لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھتے پال کے قریب آئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ پال نے آواز آہستہ کرکے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا موڈ خراب تھا۔ مارتھا نے اسے بتایا تھا کہ وہ غلام مصطفیٰ کے ساتھ ڈیٹ پر گئی ہے۔ مارتھا کے ساتھ ایک طویل لڑائی کے بعد وہ تھک کر یہاں لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا تھا اور مارتھا غصے سے بیڈ روم میں بند ہو گئی تھی۔

"تم کہاں تھیں اب تک؟" اس نے لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"پاپا! میں پارک میں چلی گئی تھی۔ دل بہت گھبرا رہا تھا۔"

"ہوں!" اب کے اس نے بغور دیکھا۔ "کیا مارتھا سے تمہاری لڑائی ہوئی ہے۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور پال کے پاس بیٹھ گئی۔

"پاپا آپ کو ممی کا نمبر مل گیا تھا؟"

"ہاں۔ وہ روزی نے بتایا تو تھا۔ نیلی فون اسٹینڈ پر دیکھو۔ ڈائری میں لکھا تھا۔ روزی کے نام کے ساتھ۔"

"پاپا! میں ممی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔"

"اتنے سالوں بعد کیا وہ تمہیں رکھ لے گی۔" پال نے دل گرفتی سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں پاپا۔ لیکن اگر انہوں نے نہ رکھا تو میں دادا کے پاس پاکستان چلی جاؤں گی۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔"

پال نے افسردگی سے سر ہلایا۔

"آپ کی سیٹ کنفرم ہو گئی۔" اس نے فون اسٹینڈ کی طرف جاتے پوچھا۔

"نہیں۔" پال نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔ اسے اب یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ مارتھا نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے اور اس کی بھی۔ شاید اس کے جانے کے بعد حالات بہتر ہو جائیں۔" اس کا دل رونے لگا۔

"لڑکیاں بیاہ کر بھی تو باپ کے گھر سے رخصت ہو جاتی ہیں۔"

وہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔ اور وہ خود ڈائری ہاتھ میں لیے فون اسٹینڈ کے پاس کھڑی تھی۔

"ہاں یہی بہتر ہے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ یہاں مصطفیٰ کے گھر کے سامنے رہی تو کیسے روک پائے گی خود کو مصطفیٰ کو دیکھنے سے۔ اسے دیکھ کر دل کیسے نہ اس کی قربت کے لیے مچلے گا۔

وہ جانتی تھی وہ نہیں روک سکے گی۔ خود کو۔ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکے گی۔ وہ پال کا مان توڑ دے گی۔ محبت اتنی ہی زور آور ہوتی ہے کہ اپنی راہ میں آتی ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہاتی ہوئی لے جاتی ہے۔ کسی تیز بڑے سیلابی ریلے کی طرح۔ وہ بھی ڈرتی تھی کہ کہیں پال، دادا اس کی پہچان سب اس ریلے میں بہہ نہ جائیں اس لیے بہتر تھا کہ وہ یہاں سے چلی

جائے یہاں نہ رہے' دور ہوگی تو شاید وہ اس زور آور محبت کو دبا لے اور شاید مصطفیٰ کو بھی اسے بھولنے میں آسانی ہو۔

اس نے گلے میں موجود چین کو چھوا۔ خوب صورت چین ایک آنسو کو اپنے دامن میں لیے اس کی گردن سے لپٹی تھی۔

اس نے پاپا کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اور ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے ابھی ٹی۔ وی پر اسے دیکھا ہے سنی! کھیلوں کی خبروں میں' وہ غلام مصطفیٰ ہے فٹ بالر۔ مانچسٹر یونائیٹڈ سے وابستہ کھلاڑی۔ اور اس کے ساتھ محی الدین تھا۔ عبدالہادی کا دوست میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ جب تمہاری ممی نے اسے گھر سے نکالا ہو گا تو وہ اپنے ماموں عبدالہادی کے دوست کے پاس چلا گیا ہو گا۔"

وہ ابھی تک صوفے پر بیٹھے تھے اور ابھی تک سنی کا ایک بازو ان کے گرد حمائل تھا اور ابھی تک ان کے رخسار بھیگے ہوئے تھے۔

"غلام مصطفیٰ!" سنی نے سوالیہ نظروں سے حبیب الرحمٰن کو دیکھا۔ "بھائی کا نام تو ہادی ہے۔"

"ہادی تو پیار سے ام کلثوم اسے بلاتی تھی اور پھر سب ہی ہادی کہنے لگے۔"

"غلام مصطفیٰ! مانچسٹر یونائیٹڈ کا پاکستانی کھلاڑی' وہ تو میرا فیورٹ کھلاڑی ہے۔ بہت پھرتیلا اور چست۔ ایک میگزین میں اس کی تصاویر ہیں۔ میرے پاس ہے وہ میگزین میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ اف۔ او مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے کہ میرا بھائی غلام مصطفیٰ انٹر نیشنل کلب کی نمائندگی کرتا ہے۔"

وہ اٹھا لیکن حبیب الرحمٰن نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"سنی' مائی سن! مجھے اس کے پاس لے چلو۔ پتا کرو اس کا کہیں سے اس کا ایڈریس ڈھونڈو۔ وہ تو اتنا مشہور کھلاڑی ہے۔ کہیں سے کوئی رابطہ مل جائے گا۔"

وہ ایک بار پھر رونے لگے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر لمحوں میں اس کے پاس پہنچ جائیں۔

"پاپا۔" سنی نے انہیں تسلی دی۔ "آپ پریشان نہ ہوں اتنے مشہور کھلاڑی کا ایڈریس معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔ صبح میں پہلے تو مانچسٹر یونائیٹڈ سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان شاء اللہ پتا چل جائے گا۔ میں آپ کو لے کر جاؤں گا بھائی کے پاس پر اس۔ ہم ڈھونڈ لیں گے اسے۔"

"اور اگر اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ مجھ سے ناراض ہوا تو۔؟" انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سنی کی طرف دیکھا۔

"ایسا نہیں ہو گا پاپا!" اس نے ان کا بازو تھپتھپایا۔

تب ہی فون کی بیل بجی اس کا خیال تھا کہ سٹنگ روم میں بیٹھی ہوئی زری فون اٹھا لے گی لیکن فون بج بج کر بند ہو گیا تھا۔

"اس وقت پتا نہیں کس کا فون ہے۔" سنی نے سوچا اور میگزین لینے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ تب ہی بیل دوبارہ ہونے لگی۔ تو اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!"

"ہیلو!" دوسری طرف سے کسی لڑکی کی آواز آئی تھی' سہمی ہوئی اور روئی روئی سی آواز۔ "یہ حبیب الرحمٰن صاحب کا نمبر ہے۔"

"جی آپ کون؟" سنی نے پوچھا۔

"وہ میں۔ مجھے ممی سے بات کرنی ہے۔ میرا مطلب ہے مسز حبیب الرحمٰن سے۔"

"آپ۔ کون؟" سنی نے پھر پوچھا۔

"میں مشاعل ہوں اور آپ۔"

"میں سنی ہوں۔"

"سنی۔ اتم آواز سے کتنے بڑے بڑے لگ رہے ہو۔" مشاعل کی آواز سے اشتیاق جھلکتا تھا۔

"ہاں۔ میں اونیل میں ہوں۔" اس نے بتایا۔

"ممی کیسی ہیں اور انکل؟"

"سب ٹھیک ہیں۔ آپ کہاں سے بات کررہی ہیں؟"

"لندن سے، مجھے ممی سے بات کرنی ہے۔" اس نے کہا تو اس نے حبیب الرحمن کو بتایا۔

"مشاعل ہے۔"

اس نے اپنی اس بہن کو دیکھا تک نہ تھا وہ تقریباً دو سال کا تھا جب وہ اپنے پاپا کے ساتھ چلی گئی تھی لیکن ممی سے اس نے کئی بار اس کا ذکر سنا تھا۔ وہ اس سے سخت خفا تھی اور اکثر اس خفگی کا اظہار کرتی تھی کہ اس نے اس کے بجائے اپنے پاپا کے پاس رہنا پسند کیا تھا۔

"ممی۔ مما! مشاعل کا فون ہے وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے ادھر سے فون اٹھالیں۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"کون مشاعل؟ میں کسی مشاعل کو نہیں جانتی۔" وہ سٹنگ سے ہی چیخ کر بولی تھی۔ "کہہ دو اس سے مجھے اس سے بات نہیں کرنا۔"

"مما پلیز۔" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کرنیں نا بات۔"

"کیوں کروں بات؟" وہ سٹنگ روم سے اٹھ کر لاؤنج میں آبیٹھی تھی۔ حبیب الرحمن سے رخ موڑ لیا۔ "آج کیا ضرورت پڑ گئی ہے اسے میری، باپ مرگیا ہے یا اس نے گھر سے نکال دیا ہے۔" وہ ہمیشہ سے انتہا پسند تھی۔

سنی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر مشاعل کو مخاطب کیا۔

"مشاعل! وہ ممی آپ سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔" اسے لگا جیسے وہ رو رہی ہو۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں انہیں سمجھاؤں گا۔ اور آپ کی بات کرواؤں گا ان سے۔"

"مجھے پتا تھا سنی۔ وہ مجھ سے بات نہیں کریں گی پھر بھی میں نے ان سے بات کرنا چاہی۔" وہ روئی روئی آواز میں بولی۔

"سنی! تم ممی کو بتانا میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں میں نے ہمیشہ انہیں بہت یاد کیا۔ بچوں کے لیے ماں، باپ دونوں ہی بہت بیش قیمت ہوتے ہیں۔ وہ ان کی آپس کی نفرتوں اور جھگڑوں کے متعلق نہیں جانتے ہیں انہیں بس صرف یہ پتا ہوتا ہے کہ یہ ان کے ماں باپ ہیں اور انہیں ان دونوں کے ساتھ ہی رہنا ہے اور جب انہیں کسی ایک کے پاس رہنا پڑتا ہے تو وہ دوسرے کو کبھی نہیں بھولتے۔"

"کیا کہانیاں سنا رہی ہے؟" زری کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ سنی نے اسے جواب نہیں دیا تھا۔ اس کا دل مشاعل کے لیے دکھ رہا تھا۔

"سنی!" ایک ذرا توقف کے بعد مشاعل نے پوچھا۔ "انکل گھر میں ہیں۔ کیا میری ان سے بات ہوسکتی ہے؟"

"ہاں پاپا گھر میں ہیں لیکن ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" سنی نے بتایا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ کس کیفیت سے گزر رہے ہیں۔

"لیکن مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنا تھی سنی۔ پھر پتا نہیں موقع ملے یا نہ ملے۔ مجھے ان سے ہادی کے متعلق بات کرنی ہے۔ پلیز۔"

"وہ ہادی سے متعلق آپ سے بات کرنا چاہتی ہے پاپا!"

سنی نے حبیب الرحمن کی طرف دیکھا۔ تو وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہادی کے متعلق!" انہوں نے آگے بڑھ کر ریسیور اس سے لے لیا۔

"اسے تو ہمیشہ سے ہی ہادی کی پیڑ (درد) تھی۔" زری بڑبڑائی تو سنی نے تاسف سے انہیں دیکھا۔

"ہیلو۔ ہیلو مشاعل بیٹا! میں حبیب الرحمن بول رہا ہوں۔ کیسی ہو؟"

"انکل! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے آپ کو بتانا تھا کہ ہادی زندہ ہے اسے کچھ نہیں ہوا تھا وہ یہاں رہتا ہے ہمارے گھر کے سامنے۔ کئی بار میری ملاقات ہوئی ہے اس سے لیکن مجھے پہلے آپ کا نمبر نہیں پتا تھا۔"

وہ بتا رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"ریلیکس بیٹا۔ مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ۔ اور تمہارے

"بس اس کا نمبر ہو گا نا۔ مجھے بتاؤ۔" ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"سنی۔ سنی جلدی سے کاغذ قلم لے کر آؤ۔"

سنی نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے ریسیور پکڑ لیا تھا۔ اور وہ نڈھال سے صوفے پر گر گئے تھے۔ وہ اتنے سالوں سے جس بیٹے کو مردہ سمجھ رہے تھے۔ وہ زندہ تھا۔ موجود تھا۔ ایک بار پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن یہ آنسو خوشی کے تھے شکر کے تھے۔

سنی نے نمبر لکھ کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ کیونکہ فون بند ہو گیا تھا۔

"کس کا نمبر لکھوا رہی تھی۔" زری ابھی تک وہاں ہی کھڑی تھی۔

"مجھے مت کہنا حبیب الرحمٰن کہ میں اس سے بات کروں یا اپنے پاس رکھ لوں۔"

حبیب الرحمٰن نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"مما! یہ ہادی بھائی کا نمبر ہے۔"

"ہادی کا نمبر۔ اوہ تو یہ آگ اس نے لگائی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"سنی!" حبیب الرحمٰن کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اپنی ماں سے کہو چلی جائے یہاں سے۔ ایک بار میں نے اسے اس لیے معاف کر دیا تھا کہ تم بھی ہادی کی طرح ماں کی ممتا سے محروم نہ ہو جاؤ۔ تمہاری خاطر میں نے اسے معاف کیا تھا لیکن شاید اب ایسا نہ کر سکوں۔ میں اسے دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"پاپا پلیز۔" سنی دوڑ کر ان کے پاس آیا۔ "پاپا پلیز میری خاطر۔ میں جانتا ہوں ممی نے بہت برا کیا۔ بہت غلط کیا۔ لیکن پاپا وہ میری ماں ہیں۔ میں ان سے بہت محبت کرتا ہوں۔ آپ انہیں معاف کر دیں۔"

سنی کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ وہ گھبرایا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔

حبیب الرحمٰن نے سنی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی نوعمر تھا۔ کون سا بہت بڑا ہو گیا تھا۔ چودہ پندرہ سال کا ہی تو تھا۔

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں نے تمہاری خاطر اور اپنے ہادی کی زندگی کے صدقے اسے معاف کیا۔ لیکن اپنی مما کو سمجھاؤ کہ میرے سامنے مت آیا کرے۔"

وہ سنی کا بازو تھپتھپا کر کھڑے ہو گئے اور اس سے فون نمبر لے کر فون کی طرف بڑھ گئے۔

☆ ☆ ☆

وہ آنکھیں موندے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے ایک ہی شبیہہ تھی جوزی کی۔ مشاعل کی۔

جب وہ مشاعل تھی تو چھوٹی سی مہربان پری کی طرح لگتی تھی اسے۔ وہ اظہار نہیں کرپاتا تھا لیکن دل ہی دل میں اعتراف ضرور کرتا تھا کہ وہ اپنی ممی سے مختلف ہے ہمدرد اور مہربان۔

اور پھر جب اس نے اسے جوزی کے روپ میں دیکھا۔ تو وہ روتی ہوئی پریشان سی لڑکی اسے اچھی لگی۔ جو اپنے ممی پاپا کی لڑائی پر گھر سے باہر آ کر روتی تھی۔ وہ اسے پسند کرنے لگا تھا۔

اور پھر جب اس نے جانا وہ مشاعل ہے تو وہ جیسے دل میں اتر گئی۔

اور پھر جب اسے لگا وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ تو وہ اسے زندگی کے ہم سفر کے روپ میں دیکھنے لگا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی محبت کا اظہار کرتا کہ اس کی خواہش نے اس کے سب کی دیے۔ اسے لگا جیسے وہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا ہو۔ وہ جوزی کی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا اور ماں اور بابا کی خواہش کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کشمکش نے اس کے ذہن کو بھی متاثر کیا اور وہ سوچنے لگا اب وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا تب خوش جس نے اسے زندگی کی نوید دی اور آج۔ آج وہ خود اس کی زندگی سے نکل گئی تھی۔

کاش وہ اس کی زندگی میں نہ آتی اور اگر آئی بھی تھی تو اسے اس سے محبت نہ ہوتی۔

"اور یہ آسان نہیں ہے۔" اس نے ایک گہری

سانس لی۔ "وہ اسے کیسے بھول پائے گا۔ لیکن اسے بھولنا ہو گا۔ ان کے لیے۔ ان سب کے لیے جنہوں نے اس کے لیے خواب دیکھے۔ جو اس کے لیے تھکے ہر مشکل میں اس کے ہم قدم رہے۔ اسے مشاعل جوزفین کی محبت کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں دفن کرنا ہو گا۔

"یا اللہ مجھے اس درد کو برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔ میرے درد محبت کو میرے لیے چراغ راہ بنا اسے کم کر دے ربا۔!"

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلتے ہوئے زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔ جیسے اس درد کو ہمیشہ کے لیے دل کی گہرائیوں میں اتار رہا ہو۔

فون کی مسلسل ہوتی بیل۔ پر اس نے آنکھیں کھول کر سامنے گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد بیل پھر ہونے لگی تھی۔ فون سیٹ لاؤنج میں تھا۔ یوں سب کے پاس اپنے اپنے سیل فون تھے۔

"کس کا فون ہو سکتا ہے؟" اس نے سوچا۔ وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اسے محی الدین کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے بیڈ روم سے فون سننے کے لیے نکل آئے تھے۔

"ہیلو۔ السلام علیکم!" انہوں نے دہرایا۔

"جی۔ جی محی الدین بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟"

پھر یکدم ان کی آواز بلند ہوئی۔

"کون۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ تو۔" پھر ان کی آواز آہستہ ہو گئی یا وہ خاموش ہو کر دوسری طرف کی بات سن رہے تھے۔

"اللہ جانے کس کا فون ہے۔"

اس نے سوچا۔ "خیر جس کا بھی ہو میرا نہ ہو مجھے اس وقت کسی سے بات نہیں کرنی۔"

اس نے پھر آنکھیں موند کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ کچھ دیر بعد محی الدین کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی وہ کہہ رہے تھے۔

"یقین کریں حبیب بھائی! ہم کئی بار گئے۔ میں اپنا فون نمبر دے کر آیا' میسج دیا اور پھر رحمن صاحب کے انتقال کا پتا چلا۔ نام کی مناسبت سے دھوکا کھا گئے۔"

وہ چونکا۔ محی الدین کی بات کو سمجھنے کی کوشش کی اور پھر تسی اور اک نے اسے بیڈ سے اٹھا دیا۔

"یہ بابا کس سے بات کر رہے ہیں۔ کون ہو سکتا ہے۔"

"وہ آپ ہی کا ہے حبیب بھائی!۔ بس اللہ نے کچھ عرصہ کے لیے اس کی ذمہ داری ہمیں سونپی تھی۔"

اسے محی الدین کی آواز بھرائی ہوئی سی لگی۔

وہ الجھ کر دروازے تک آیا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ محی الدین نے اسے دیکھ کر اشارے سے اپنے قریب آنے کے لیے کہا۔

"بابا! اس وقت مجھے کسی سے بات نہیں کرنی آپ منع کر دیں۔"

قریب آکر اس نے سرگوشی کی تو محی الدین ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے مسکرائے۔

"یہ کسی نہیں ہیں۔ تمہارے پاپا ہیں۔"

"پاپا!" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا یعنی ابھی کچھ دیر پہلے اسے جو ادراک ہو رہا تھا وہ صحیح تھا۔

"ہاں بیٹا تم بات کرو اپنے پاپا سے۔ بہت بے چین ہیں۔ بعد میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں۔"

اس نے ائرپیس کانوں سے لگایا۔

"ہادی۔ ہادی میری جان۔ میرے بچے میری زندگی!"

دوسری طرف حبیب الرحمن رو رہے تھے۔

"مجھے معاف کر دو۔ میرے بچے میں نے تمہارا دھیان نہیں رکھا اور تمہیں کھو دیا۔"

"پاپا! میں نے سنی کو نہیں گرایا تھا۔ میں تو اس سے بہت پیار کرتا تھا۔" اب وہ بھی رو رہا تھا۔

"میری جان۔ مجھے پتا ہے میں جانتا ہوں۔ میں۔"

حبیب الرحمن دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے۔ بڑی دیر بعد وہ سنبھلے تھے۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت ناراض ہو۔ بہت خفا ہو۔ میں نے۔"

"پاپا! میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ میں بھی

بھی آپ سے ناراض نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا آپ کو
یکدم غصہ آجاتا ہے لیکن۔"

"میں نے تمہارے بعد کبھی غصہ نہیں کیا۔ میری
سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں خود کو کیا سزا دوں۔ کیا
کروں ایسا کہ روز محشر ام کلثوم کا سامنا کر سکوں۔"

"پاپا پلیز! ریلیکس ہو جائیں۔ میں تھوڑا بزی ہوں
ورلڈ کپ کے لیے کیمپ لگنے والا ہے۔ میں جیسے ہی
فارغ ہوتا ہوں' آپ سے ملنے آؤں گا۔"

"میں خود آؤں گا تمہارے پاس جیسے ہی ممکن ہوتا
ہے فوراً۔ تمہیں ایک بار گلے لگانے۔ سنو' محی
الدین سے کہو۔ تم اس کے بیٹے ہو۔ ہمیشہ اسی کے بیٹے
رہو گے۔ میرا تم پر کوئی حق نہیں ہے۔ بس مجھے اتنی
اجازت دے دیں کہ میں ایک نظر آکر تمہیں دیکھ
لوں۔ ان آنکھوں کی پیاس بجھ جائے گی' تمہیں گلے
لگالوں تو دل کو سکون مل جائے گا قرار آجائے گا۔"

اس نے پھر ریسیور محی الدین کو پکڑا دیا تھا اور اب
حبیب الرحمن ان سے بھی یہی بات کر رہے تھے۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ! غلام مصطفیٰ
آپ کا بیٹا ہے۔ ہم تو محض ایک امانت دار تھے۔ وہ آپ
کی امانت ہے۔"

"کیا ہوا۔ اس وقت کس کا فون ہے خیریت ہے نا
سب۔ اتنی دیر سے آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟" فاطمہ
بوکھلائی ہوئی سی کمرے سے باہر نکلی تھیں۔

"بالکل خیریت ہے۔" مصطفیٰ نے اپنے آنسو
صاف کرتے ہوئے سنبھل کر ان کی طرف دیکھا۔ اور
پھر انہیں حبیب الرحمن کے متعلق بتانے لگا۔

فاطمہ کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ وحشت بھری نظروں
سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ کتنے مہینے انہوں نے
خوف کے عالم میں گزارے تھے کہ کسی روز حبیب
الرحمن آکر اسے لے جائیں گے۔ وہ اسے پیار کرتے
ہوئے جھجک جاتی تھیں۔ وہ گیارہ سال کا تھا جب ان
کے پاس آیا تھا' سہما ہوا سا اور بارہ سال بعد وہ جب
بھرپور جوان تھا اور وہ ہر خوف سے آزاد ہو گئی تھیں تو۔

"تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے مصطفیٰ؟" ان کی
آواز میں ہزاروں آنسوؤں کی نمی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ! میں بھلا آپ کو چھوڑ
کر کہاں جاؤں گا۔ میرا سب کچھ آپ ہی ہیں' میرا جینا
مرنا سب آپ کے ساتھ ہے۔"

اس نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ لیکن پھر بھی ان
کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ دل پر ہاتھ رکھے
متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی مصطفیٰ۔"
انہوں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"مجھے اپنی جنت چھوڑ کر کہیں نہیں جانا اماں۔ وہ
میرے والد ہیں۔ ان کی زندگی کا سن کر خوشی ہونا اور
ملنے کی خواہش پیدا ہونا فطری ہے۔ لیکن میری جگہ
آپ کے قدموں میں ہی ہے۔"

اس نے انہیں یقین دلایا۔ اور محی الدین کی طرف
دیکھا جو اپنے مخصوص نرم لو دیتے لہجے میں کہہ رہے
تھے۔

"نہیں حبیب بھائی! دوسری شادی کوئی جرم نہیں
ہے' لیکن دوسری شادی کر کے اپنی پہلی اولاد سے
غافل ہو جانا یقیناً جرم ہے۔"

"خوشی کے پاپا!" فاطمہ نے کپکپاتی آواز میں انہیں
مخاطب کیا شاید وہ ان سے بھی یقین دہانی چاہتی تھیں
کہ وہ مصطفیٰ کو اپنے باپ کے پاس نہیں بھیجیں گے۔
محی الدین نے ان کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر ریسیور
مصطفیٰ کی طرف بڑھایا۔

"تو یہ بات کرو اپنے پاپا سے۔"

اور ریسیور اسے پکڑا کر فاطمہ کو ہولے ہولے
سمجھاتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لیے اپنے کمرے
میں چلے گئے۔

"آپ کب تک آئیں گے پاپا۔" بہت دیر تک ان
کی بات سننے کے بعد مصطفیٰ نے پوچھا۔ اور رخ موڑ کر
اپنے دائیں طرف کھڑی خوش جمال کو دیکھا جو کچھ دیر
پہلے ہی اپنے کمرے سے نکل کر آئی تھی اور محی الدین
اور فاطمہ کے جانے کے بعد بھی وہیں ہی کھڑی تھی۔
شاید وہ پوری بات جاننا چاہتی تھی۔ جو کچھ اس نے سنا

تھا اس سے وہ زیادہ نہیں جان پائی تھی۔ اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی تھیں اور رخساروں پر سرخی تھی اور وہ جو پچھلے کئی گھنٹوں سے سوچ رہا تھا کہ کیسے وہ کیسے خوش جمال سے کہے گا کہ اسے جوزی سے شادی نہیں کرنی' کیسے اسے اپنے اس فیصلے سے آگاہ کرے گا جو کچھ دیر پہلے اس نے کیا تھا۔ کس طرح بات کرے کہ اسے یہ نہ لگے۔ کہ جوزی نے اسے ٹھکرا دیا تو وہ اس کی طرف پلٹا۔ حالانکہ اگر وہ پہلے خوش جمال کے دل کا حال جان جاتا تو وہ اپنی محبت قربان کر دیتا۔ اتنی ہی عزیز تھی اسے خوش جمال۔

اس نے ایک نظر خوش جمال پر ڈالی اور لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے وہ بات سوجھ گئی جس سے وہ خوش جمال کی عزت نفس کو مجروح ہونے سے بچا سکتا تھا۔

"جیسے ہی ویزا ملا۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہیں لگاؤں گا میں تو بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں ہادی۔" حبیب الرحمن کہہ رہے تھے۔

"دیر لگایئے گا بھی مت پاپا۔"

اس نے ایک نظر پھر خوش جمال پر ڈالی جو اس طرح اسی انداز میں کھڑی تھی۔

"آپ آپ کے ہوتے ہوئے میں بابا اور اماں سے خود اپنے رشتے کی بات کرتا ہوا بالکل بھی اچھا نہیں لگوں گا پاپا۔"

"جی پاپا۔ آپ کی ہونے والی بہو بہت پیاری ہے' بالکل اپنے نام کی طرح خوش جمال۔"

اور خوش جمال کو لگا جیسے اس کے کانوں نے کچھ غلط سنا ہو۔ یہ مصطفیٰ نے کیا کہا۔

"جی پاپا۔ وہ میرے پیارے بابا اور اماں کی اکلوتی بیٹی ہے۔"

"یہ مصطفیٰ کیا کہہ رہا ہے۔"

اس نے بے اختیار ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر رک گئی۔ نہیں شاید میں نے غلط سنا ہے۔ میری سماعت نے وہی لفظ کشید کیے ہیں جو میرا دل سننا چاہتا ہے۔

وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کر اس کی طرف مڑا۔

"یہ۔ یہ ابھی تم نے کیا کہا تھا؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"وہی جو تم نے سنا خوش جمال!"

وہ دو تین قدم چل کر بالکل اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور بغور اسے دیکھنے لگا۔

وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ جوزی سے کہیں زیادہ خوب صورت اور اس کا دل اس سے بھی زیادہ خوب صورت تھا۔ اس بیش قیمت دل کو توڑنے جا رہا تھا وہ اور یہ شاید اللہ کو بھی پسند نہیں آیا تھا تب ہی تو۔

اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

"اب جب پاپا' ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ پراپر طریقے سے باضابطہ طور پر پاپا' اماں اور بابا سے میرے لیے تمہارا ہاتھ مانگیں۔"

"لیکن تم نے تو جوزی سے بات کرنا تھی مصطفیٰ! اور تم اس سے محبت کرتے تھے۔"

"ہاں مجھے ایسا ہی لگا تھا خوش جمال۔ میں نے تمہارے متعلق اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا شاید اس لیے کہ ہم ایک ہی گھر میں ایک ساتھ پلے بڑھے تھے۔ میں تم سے بہت محبت کرتا تھا۔ تم جانتی ہو۔ لیکن مجھے لگتا تھا' اس محبت کی نوعیت مختلف ہے۔ میں اس کے لیے ہمیشہ سے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا تھا۔ وہ صرف پسندیدگی تھی' احسان مندی تھی بلکہ میں نے سمجھا یہ محبت ہے۔ لیکن جب میں اس کی طرف جا رہا تھا تو مجھے لگا میرا بایاں پہلو خالی ہے۔ اور میرا دل یہیں کہیں اسی دہلیز پر رہ گیا ہے اور ابھی تو میں نے صرف اس کی طرف جانے کا سوچا اور میرا دل خالی ہو گیا اور اگر۔ تب میں نے جانا کہ میں اور تم ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں' اماں اور بابا کا فیصلہ بالکل صحیح ہے۔"

کبھی کبھی کسی اپنے کی خوشی کے لیے جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔

اس نے سوچا اور شعوری کوشش سے مسکرایا اور

ایک قدم آگے بڑھ کر خوش جمل کے ٹھنڈے ہوتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

"مجھے یقین ہے خوش جمل ہم دونوں بہت خوش رہیں گے۔"

خوش جمل کے چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ اترے تھے اور آنکھوں میں ہزاروں کرمک شب جگمگانے لگے تھے۔ لیکن اس کے اندر جتنے سارے چراغ بجھ گئے تھے اور چاروں اور اندھیرا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ خوش جمل کو اندھیروں میں چراغ جلانا آتا ہے اور ایک دن وہ اس کے دل کے اندھیروں میں بھی چراغاں کردے گی اور وہ مشاعل جوزفین کی محبت کو ایسے ہی بھول جائے گا کہ جیسے وہ کوئی خواب تھا۔

وہ خوش جمل کی طرف دیکھ کر پھر مسکرایا۔

"تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو جاکر آرام کرو۔ ان شاءاللہ صبح بات کریں گے۔"

اور اسے وہاں ہی حیران چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ ابھی آنکھیں جلتی تھیں اور دل میں دھول اڑتی تھی۔

☆ ☆ ☆

2011 کا انگلش پریمیر لیگ کا پہلا میچ شروع ہوچکا تھا۔ مانچسٹر یونائیٹڈ پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اتری تھی ایک بار پھر جوزے نے مانچسٹر یونائیٹڈ کی کپتانی مصطفٰے کو سونپی تھی۔

پہلے میچ کے پہلے ہاف میں ہی مصطفٰے نے مخالف ٹیم پر گول کردیا تھا اور وی۔ آئی۔ پی انکلوژر میں مجی اندین اور حبیب الرحمٰن ساتھ ساتھ بیٹھے تھے وسطلان اسٹیڈیم میں مصطفٰے کے نام کے نعرے لگ رہے تھے اور ان دونوں کے چہرے خوشی سے تمتمار ہے تھے۔

عین اسی وقت پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر میں اپنے دادا کے ساتھ سرخ چھوٹی اینٹوں والے چرچ کے داخلی دروازے کے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی ایک بار اس نے ایک چرچ میں عشائے ربانی کی تیاری کرتی ننوں کو دیکھ کر سوچا تھا کہ کیا کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ان ننز کے ساتھ عشائے ربانی میں شامل ہوکر ان کے ساتھ اس میز پر بیٹھے۔ اور پھر خود ہی اس نے اپنی اس سوچ کی نفی بھی کردی تھی۔ لیکن آج وہ ان کا حصہ بننے جارہی تھی۔ اس نے پاپا کا سر مار تھا کے سامنے جھکنے نہیں دیا تھا بلکہ بلند کردیا تھا۔ ہاں دل کی منڈیر پر اب بھی مصطفٰے کا نام جگمگاتا تھا۔ لیکن ایک دن آئے گا جب وہ اسے بھول جائے گی ایسے ہی جیسے وہ کوئی خواب تھا۔ اس نے خود کو یقین دلایا۔

چرچ کے صحن میں جھاڑو دیتا نو عمر لڑکا گنگنا رہا تھا۔

کہ جیسے خواب تھا کوئی بکھر گیا

کہ جیسے رنگ تھا کوئی اتر گیا

کہ جیسے خواب تھا۔

"ہاں جیسے خواب تھا کوئی۔" اس نے زیر لب کہا۔ انگلیوں سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ اپنے دادا کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور چرچ کا دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر چلی گئی۔

☆

حمیرا نوشین

"یہ دونوں بہنیں مجھے لے ڈوبیں گی۔ انہوں نے اپنے ساتھ ساتھ میرے نصیب پر بھی سیاہی پھیر رکھی ہے۔ پتا نہیں کیا سوچ کے بیٹھی ہوئی ہیں۔ اگر اللہ نے دبتا رنگ اور موٹے نین نقوش بنا دیے ہیں تو بندہ تھوڑی محنت کر کے کچھ تو اپنی شکل کو نکھار سکتا ہے کہ اس گھر سے تو دھکا لگے۔ بے شمار کریمیں لا کے ڈھیر کردیں، سینکڑوں رنگ گورا کرنے کے ٹوٹکے بتادیے۔ مگر مجال ہے جو ان پر رتی برابر بھی اثر ہوا ہو۔ ماں کی راتوں کی نیندیں اڑ رہی ہیں تو باپ کو فکر و پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے مگر ان کو احساس نہیں ہے۔ ہزار دفعہ چھوٹی ہو کے سمجھا چکی ہوں کہ یہ چادر کی بکل مار کے چیکی سی شکل لے کے مہمانوں کے سامنے مت جایا کرو۔ تھوڑا سا چہرے پہ فاؤنڈیشن لگا کے لائٹ سی لپ اسٹک لگالو۔ دوپٹا سر کے بجائے شانے پر ڈال لو۔ خوب صورت نہ سہی قبول صورت تو لگو۔ پر ان کی عقل میں میری بات کہاں سماتی ہے۔ جب ماں کا ہی ان کو احساس نہیں ہے تو میں کس کھیت کی مولی ہوں۔ اب میں اپنے منہ سے یہ کہتی کیا خاک اچھی لگوں گی کہ تمہارے رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے میری عمر بھی نکل جائے گی۔ اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کرلو۔ ابھی تو پھر بھی اکا دکا رشتہ بھولے بھٹکے آجاتا ہے۔ دو چار سال اور گزرے تو اسی دہلیز پہ بیٹھی رہ جائیں گی۔ پھر دونوں بہنیں مل کر مدرسہ کھول لینا اور ساری عمر بچوں کو درس دیتی رہنا۔ ماں باپ کو اپنے غم میں وقت سے پہلے قبر میں پہنچا دینا اور مجھے تو سلگا سلگا کر ماریں گی یہ ملانیاں۔

عاقب کب تک انتظار کرے گا۔ اس کی ماں نے تو دن رات اس کے سر پر شادی کی تلوار لٹکا رکھی ہے کہ آخر تم شادی کے لیے ہاں کیوں نہیں بھرتے۔ خاندان اور حلقہ احباب میں حسین سے حسین لڑکی اس کی نظر التفات کی منتظر ہے۔ وہ بے چارہ "کچھ عرصہ ٹھہر جائیں" کہہ کہہ کر تھک چکا ہے اور ہر ملاقات پر میرے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ دیکھو! وقت میرے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم مجھے کھو دو۔ ہر مرتبہ یہ فقرہ مجھے اذیت میں مبتلا کرتا ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ مسجدوں میں نکل جاؤں اور مولویوں کی منت کر کے اپنی بہنوں کا رشتہ کروا دوں۔ یا اللہ! تو ہی میری سن لے۔ دو مولوی بھیج دے جو میری بہنوں کو شرعی طریقے سے رقعوں میں بیاہ کرلے جائیں۔ پتا نہیں میری دعائیں کب رنگ لائیں گی۔"

میں نے بے بسی سے ہونٹ کاٹے۔

۞ ۞ ۞

"حلیمہ بیٹا! آج شام کو وہ پنک کلر کا سوٹ پہن لینا جس پر امبر ائیڈری ہے اور بیٹا! میری مانو تو معمولی سی ہم رنگ لپ اسٹک بھی لگا لینا۔ آج شام کو راشدہ خالہ کچھ خواتین کو لے کر آرہی ہیں۔ اللہ سے امید ہے کہ میری بچی کے نصیب بھی کھل جائیں گے بڑی آس دلائی ہے تمہاری خالہ نے۔"

امی نے ہمیشہ کی طرح بجیا کو دھیمے لہجے میں سمجھایا مگر مجھے آج بھی قوی امید تھی کہ امی کا مدعا سمجھ کر بھی وہ انجان ہی بنی رہیں گی اور وہی کریں گی جو ہمیشہ سے ہر آئے مہمان کے سامنے کرتی رہی ہیں۔ میں نے تو جل کر کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ان کو سمجھانا بھینس کے

آگے بین بجانا کے مترادف تھا مگر شام کو بالکل میری سوچ کے مطابق ہی ہوا۔

امی کے کہنے پر گلابی جوڑا تو انہوں نے زیب تن کر لیا تھا' لبوں پر پنک لپ اسٹک بھی سجالی تھی کی آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر بھی نمودار ہو گئی مگر دوپٹے کے معاملے میں کوئی رو رعایت نہیں تھی۔ بالوں کی کس کے چوٹی گوندھ کے پیشانی کو مزید چوڑا کر لیا۔ اوپر سے پورے سر کو دوپٹے سے ڈھانپ کر اپنے گرد ایسے لپیٹا جیسے کسی میلاد میں جا رہی ہوں۔

چائے کی ٹرالی لیے سنجیدہ سی صورت بنائے جب وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو خواتین بجیا پر ایک نظر ڈالنے کے بعد آپس میں نظروں کا تبادلہ کرنے لگیں۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے پر اپنی رائے بھی واضح کر دی۔ میں جو کھڑکی سے لگی یہ سارا منظر ملاحظہ کر رہی تھی ان کی نظروں کو دیکھتے ہی بھانپ گئی تھی کہ "یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی" اور وہی ہوا جس کے خوف سے ہمارے دل لرز رہے تھے۔ انہوں نے تو چائے کے ساتھ رکھے لوازمات سے بھی انصاف کرنا گوارا نہ کیا اور خالی چائے پی کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"معاف کرنا بہن! آپ کی بچی بہت سادہ ہے ہمارے بچے کی ڈیمانڈ بولڈ اور پرکشش لڑکی ہے، ہمیں اجازت دیں۔" انہوں نے تو غیر اخلاقیات کا ایسا مظاہرہ کیا کہ بجیا کے منہ پر ہی صاف انکار کر کے چل دیں۔ امی صوفہ پر بیٹھی جیسے ڈھے سی گئیں۔ راشدہ خالہ ان کو تسلی دینے لگیں اور بجیا نارمل چہرہ لیے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

"ہونہہ! یہ کہاں باز آئیں گی اپنی سادگی سے۔" میں نے نخوت سے جملہ ان کی طرف اچھالا اور امی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼
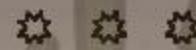
کئی دنوں کے بعد سورج اپنی تمتماکیوں سمیت جلوہ گر ہوا تھا۔ میرے امتحانات قریب تھے اور میں پوری دلجمعی سے پڑھائی میں مصروف تھی۔ میں صبح ناشتے کے بعد اپنی کتابیں لے کر اوپر چھت پر چڑھی تو "آفتاب" صاحب کو رخصت کر کے ہی نیچے سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھائے۔ سامنے سے آتی بوتیک کا اسٹائلش سوٹ پہنے' لیرز میں کٹے بال' تراشیدہ بھنویں اور ہلکے سے میک اپ میں لمبی صراحی دار گردن میں دوپٹا ڈالے بجیا کو دیکھ کر میں غش ہی تو کھا کر رہ گئی۔

"یہ یہ آپ ہیں حلیمہ بجیا!" میں حیران ہوئی۔

"ہاں غور سے دیکھ لو مجھے۔ تمہارے من پسند روپ میں کیسی لگ رہی ہوں میں۔" وہ مسکرائیں۔

"بہت بہت ہی پیاری۔" میں نے ان کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں۔ خوشی سے سرشار امی کچن سے باہر نکلیں تو ہم دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

"امی! آج تو ہماری بجیا پر سے دیکھنے آنے والی مہمان خواتین کی نگاہیں ہی نہیں ہٹیں گی۔ بس آج آپ مٹھائی تیار رکھیں۔"

"ان شاء اللہ" امی بھی بجیا کی اس تبدیلی سے بڑی مطمئن نظر آرہی تھیں۔

"اچھا چلو تم کچن میں جاؤ۔ نسیمہ کی مدد کرواؤ۔ صبح سے اکیلی لگی ہوئی ہے۔" امی نے مجھے کچن کی طرف دھکیلا۔

"اور ہاں تم ڈرائنگ روم کا رخ نہ کرنا۔" وہ ہمیشہ کی طرح مجھے نصیحت کرنا نہ بھولیں۔

"مجھے اچھی طرح پتا ہے اور آج تو بجیا کے سامنے میرا چراغ کیا جلے گا۔" میں نے انہیں تو صفی نگاہوں سے دیکھا تو وہ شرما سی گئیں۔

میں گنگناتے ہوئے نسیمہ کے ساتھ کام کروانے لگی۔ آج تو بجیا کا یہ روپ دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اچھی بھلی شکل کو کیسے بگاڑ رکھا تھا۔

آج تو بس لڑکے والے آئیں منگنی کی انگوٹھی ہی نہ پہنا جائیں۔" میں دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی اور نسیمہ کی طرف دیکھ کر اسے بھی نظروں ہی نظروں میں نصیحت کی کہ کچھ سبق دیکھو بجیا سے مگر وہ ہر بات سے بے نیاز اپنے کاموں میں لگی رہی۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم میں بجیا چائے کی ٹرالی لے کر جاچکی تھیں اور میں حسب روایت کھڑکی کی اوٹ سے سارا منظر آنکھوں میں قید کر رہی تھی۔ بجیا مسکراتا چہرہ لیے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتی اک شان بے نیازی

سے بیٹھی تھیں اور رشتے کے لیے آئی خواتین آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کر رہی تھیں۔

"ہمیں آپ کی بچی پسند ہے" کے الفاظ لوا کر بھی دو۔ اور کتنا صبر آئے گا۔" میں ان کی خاموشی سے جھنجلائی' مگر اگلے ہی پل میری سماعتوں نے وہ الفاظ سنے کہ میں گنگ رہ گئی۔

"بہن! ہمیں تو پتا چلا تھا کہ آپ کی بچی بہت سادہ اور فیشن سے مبرا ہے۔ ہمارا بچہ مذہبی ذہن کا مالک ہے' اسے صوم و صلوۃ کی پابند اور شریعت کے مطابق پردہ کرنے والی لڑکی چاہیے تاکہ دونوں کی ذہنی ہم آہنگی ہو سکے۔ شاید ہمیں کسی نے غلط معلومات دیں۔" مہمان خواتین نے مجھ سمیت سب پر بم پھوڑا۔ امی ساکت رہ گئیں اور بجیا۔۔۔ وہ تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق جہاں کی تہاں رہ گئیں۔ خود میرے تلووں سے زمین نکل گئی۔

"ہائے اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ کیسا نادر موقع میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ آج اگر بجیا سر پہ دوپٹا اوڑھے ان کے سامنے بیٹھی ہوتیں تو منگنی کی انگوٹھی ضرور ان کے ہاتھوں میں سج جاتی۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔" مارے دکھ کے میری آنکھوں سے آنسو ہی نکل آئے۔

"ہاں۔" ذہن میں جھماکا ہوا۔

"اوہ یس۔۔۔ یہ ٹھیک ہے۔" عقل نے بروقت گھوڑے دوڑائے اور میں بھاگتی ہوئی نسیمہ کے کمرے کی طرف دوڑی' جو عشاء کی نماز کی نیت باندھنے ہی لگی تھی۔ دوپٹا سر کے گرد اچھی طرح لپیٹے' صاف ستھرا میک اپ سے بے نیاز چہرہ۔ "ہاں یہی ہے ان کے خوابوں کی تعبیر۔" میں نسیمہ کو کھینچ کر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔

"ارے ارے مجھے چھوڑو' یہ کیا کر رہی ہو۔ کہاں لے کے جا رہی ہو۔ مجھے نماز پڑھنی ہے۔" بولتی جا رہی تھی' اور میں اس کی پروا کیے بغیر اسے ڈرائنگ روم میں لے کر داخل ہو گئی۔

"آنٹی! آپ کو جس نے بتایا ہے' بالکل درست بتایا ہے۔ یہ ہیں میری بجیا صوم و صلوۃ کی پابند' شرعی پردہ کرتی ہیں۔ نماز پڑھ رہی تھیں اس لیے آنے میں دیر ہو گئی۔" میں نے نسیمہ بجیا کو ان کے سامنے صوفہ پر بٹھایا تو وہ خواتین جیسے اپنا مطلوبہ گوہر پا کر کھل اٹھیں۔

"ہاں بالکل! ہمیں ایسی ہی بچی کی تلاش تھی۔ ماشاء اللہ بڑی نیک بچی ہے۔ ہمارا بچہ بھی بہت سادہ و نیک ہے۔ اللہ نے چاہا تو دونوں کی زندگی بڑی اچھی گزرے گی۔" انہوں نے نسیمہ بجیا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بس ہماری طرف سے تو رشتہ پکا ہی سمجھیں اب آپ بتائیں ہمارے بچے کو دیکھنے کب آ رہی ہیں۔" خاتون نے فوراً" نسیمہ بجیا کے لیے اپنی پسندیدگی ظاہر کر دی۔

امی حیرت سے منہ کھولے کبھی مجھے' کبھی نسیمہ بجیا کو' حلیمہ بجیا کو اور کبھی مہمان خواتین کو تکے جا رہی تھیں۔

"آنٹی! ان شاء اللہ بہت جلد ہم بھی آپ کے گھر حاضری دیں گے۔" میں نے چپکے سے امی کا ہاتھ دبا کر انہیں ہوش دلایا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں بہن! ہم بھی ضرور جلد ہی آپ کے گھر تشریف لائیں گے۔" امی حیرت' خوشی اور کچھ افسردگی لیے جذبات سے گویا ہوئیں اور میں دل میں سوچ رہی تھی حلیمہ نہ سہی نسیمہ کو تو دھکا لگا۔ ایک سل سرکی ہے تو دوسری بھی ایک دن ٹل ہی جائے گی۔ شروعات تو ہوئی۔ خواتین رخصت ہوئیں تو میں شرمندہ سی بجیا سے نظریں ملائے بغیر اپنے کمرے کی طرف ہو لی۔

"آف میری پیاری حلیمہ بجیا۔ ہماری خاطر ذہن و دل سے جنگ کر کے اپنا چولا بدلا اور پھر بھی مقدر ہار گئے۔"

مجھے حقیقتاً" افسوس ہوا۔ اب پتا نہیں وہ اپنا یہی حلیہ اپنائے رکھیں گی یا پہلے والی جون میں واپس آ جائیں گی۔ میں تو خجالت سے یہی سوچ رہی ہوں۔ مگر بہرحال میرا آدھا مسئلہ تو حل ہوا۔۔۔!

☆

دوسری قسط

صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ

"سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔" پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

✡ ✡ ✡

مدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں۔ پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔ مدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

ناولٹ

عبداللہ پابند صوم و صلوٰۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آتی ہے۔

عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔

شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔

ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل ڈاکٹر حماد کا انتقال ہو چکا ہے۔

نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔

اوریدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے۔ جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔

عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔

سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

وہ جب سے ارسل سے مل کر آئی تھی۔ ایک بارش کمرے سے باہر اور ایک اس کی آنکھوں سے ہو رہی تھی۔ اپنے کمرے میں موجود پلیٹیں، ایک جگ اور تین کپ توڑنے کے بعد وہ دھڑام سے اپنے بیڈ پر بیٹھی اور کشن آنکھوں پر رکھ کر لیٹ گئی۔ وہ اب بے آواز رو رہی تھی۔ آج پھر اس پر ڈپریشن کا دورہ پڑا تھا۔ جو اگلے کئی گھنٹوں تک رہتا تھا۔

"رونے سے اگر مسئلے حل ہو جاتے تو یقین مانو اب تک پوری دنیا آنسوؤں کے پانی میں ڈوب چکی ہوتی۔" اس کی روم میٹ رباب، جو خاموشی سے اس کی تخریبانہ کارروائی کو غور سے دیکھ رہی تھی، ہاتھ میں پکڑا قرآن پاک الماری میں رکھ کر بڑے سادہ سے انداز سے بولی۔ شانزے نے آنکھوں پر رکھا کشن ہٹایا اور وہ کشن اب کارپٹ پر پڑا بالکل اسی کی طرح اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔

"تم نے افتخار عارف کی نظم "بارھواں کھلاڑی" پڑھی ہے کبھی؟" شانزے کا لہجہ خاصا عجیب تھا۔

"ہاں۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" رباب نے اس کا دھواں دھواں سا چہرہ دیکھا۔

"سارے بدقسمت لوگ بارھویں کھلاڑی کی طرح ہوتے ہیں۔ جن کو تقدیر اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقع بہت کم دیتی ہے۔ وہ لوگ اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں، یہاں تک کہ زندگی کا میچ ہی ختم ہو جاتا ہے اور وہ خالی ہاتھ اور خالی دامن لیے گمنامی کی موت مر جاتے ہیں۔" وہ حد درجہ قنوطیت کا شکار تھی۔

"ایسے نہیں کہتے شانزے۔ تمہیں قدرت اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع ضرور دے گی۔" رباب نے اسے حوصلہ دیا۔

"مجھے معلوم ہے، میری قسمت میں کوئی ایسا لمحہ نہیں آئے گا۔ جس میں لوگوں کی نظریں مجھ پر ٹھہر جائیں۔" مایوسی اس کے لفظ لفظ سے ٹپک رہی تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ گلے شکوؤں کی ایک گٹھڑی بندھی رہتی، جسے موقع دیکھتے ہی وہ کھول کر بیٹھ جاتی۔

"تم لوگوں کی نظروں کے بجائے اس کی نظر میں آنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی ہو شانزے! جس کی نظر کرم سے تقدیر بدل جاتی ہے۔" رباب نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بس بس رہنے دو۔" اس نے فوراً ہی اس کی بات کو مسترد کیا۔ "مجھے زندگی میں اس نے دیا ہی کیا ہے۔" وہ بچوں کے سے انداز سے بسوری۔

"بہت بری بات ہے شانزے! اللہ کو ایسی ناشکری کی باتیں پسند نہیں۔" رباب خوف زدہ ہوئی۔

"اور مجھے وہ سب پسند نہیں، جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔" وہ مایوسی کی اس انتہا پر تھی، جہاں انسان پہلے اپنی ذات اور پھر دنیا کی ہر چیز سے منکر ہو جاتا ہے۔

"نماز پڑھا کرو، سکون ملے گا۔" رباب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"جن کو اللہ نے سکون نہ دینا ہو، وہ انہیں کسی بھی چیز میں نہیں دیتا۔" وہ اس کی ہر بات بے دردی سے رد کر رہی تھی۔

"شانزے! ایسے نہیں کہتے۔" رباب نے حواس باختہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے ہندو ازم، یہودیت، عیسائیت سب میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملا۔" شانزے نے تکیہ گود میں رکھ کر تلخ لہجے میں کہا۔

"تم قرآن پڑھو، ان شاء اللہ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" رباب خاموشی سے اس کے پاس آن بیٹھی اور محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ خاموش رہی اس نے رباب کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"تم اپنی پھپھو کے گھر واپس کیوں نہیں چلی جاتی ہو شانزے۔؟"

"وہ گھر جہاں مجھے دیکھ کر صبح شام 'استغفار استغفار' کی گردان کی جاتی ہے۔" شانزے کے استہزائیہ انداز پر وہ الجھی۔

"میں گناہ کی وہ پوٹلی ہوں جسے میری ماں جائز نکاح کے ہوتے ہوئے ناجائز سمجھ کر پھینک کر چلی گئی۔" شانزے ایک دفعہ پھر خود ترسی کا شکار ہوئی۔

"تم اپنے باپ سے رابطہ کیوں نہیں کرتی ہو؟"

رباب نے کچھ سوچ کر کہا۔

"میرے والد۔ ان کو تو ایک مذہبی جنونی نے قتل کر دیا تھا۔" شانزے کی بات نے اسے حیران کیا۔

"وہ کیوں۔۔۔؟"

"ظاہر ہے، میرے باپ نے اس کے مذہبی نظریات کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہو گی۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تم مسلمان ہو ناں۔۔۔؟" رباب نے بے تابی سے پوچھا۔

"میرا سارا خاندان مسلم ہے، اس لیے میں بھی بائے برتھ مسلمان ہی ہوں۔" وہ اٹھی اور الیکٹرک کیتلی میں پانی گرم کرنے لگی۔

"پھر تم نے ہندو ازم، یہودیت اور عیسائیت کو پڑھنے کی کوشش کیوں کی؟" رباب اب الجھن آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"سکون کی تلاش میں۔۔۔" اس نے ٹی بیگ نکال کر کپ میں رکھا اور گرم پانی ڈالنے لگی۔

"تم نے اسے اسلام میں تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" رباب حد درجہ سنجیدہ ہوئی۔

"کسی نے کہا ہی نہیں۔۔۔" وہ سادگی سے مسکرائی تو رباب نے سکون کا سانس لیا۔ وہ ابھی اس حد تک بھی گمراہ نہیں ہوئی تھی جتنا وہ سوچ چکی تھی۔

شانزے اور رباب کی دوستی بہت عجیب انداز میں ہوئی تھی۔ رباب کو ہوسٹل آئے ایک مہینہ ہی ہوا تھا۔ جب وارڈن نے اسے بلا کر خصوصی طور پر درخواست کی کہ وہ ماس کمیونیکیشن کی شانزے کو اپنے ساتھ رکھ لے کیونکہ اس کے جھگڑالو مزاج کی وجہ سے کوئی بھی اسے رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ شانزے کی ایک روم میٹ تو تنگ آ کر خود اس کا کمرہ چھوڑ کر چلی گئی اور باقی دوسری نے شانزے کو خاصا ٹف ٹائم دیا، جس کے نتیجے میں ہوسٹل والوں کو کئی تاریخی جنگیں دیکھنے کو ملیں۔

آخری معرکہ تو بہت زوردار ثابت ہوا۔ شانزے نے اپنی روم میٹ رومانہ کا سر پھاڑ دیا تھا۔ ہوسٹل میں باقاعدہ انکوائری کمیٹی بیٹھی۔ وہ تو شانزے کی قسمت اچھی تھی کہ ثابت ہو گیا کہ دونوں کا قصور ففٹی ففٹی ہے۔ اس لیے وارننگ دے کر معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ اس قصے میں شانزے کو اپنا روم چھوڑ کر رباب کا روم میٹ بننا پڑا۔ جو ایک سادہ اور بے ضرر سی لڑکی تھی اور اسلامیات میں ایم فل کر رہی تھی۔

"تم نے رومانہ کنول کا سر کیوں پھاڑا۔۔۔؟" کافی دن کے بعد رباب نے یوں ہی اس کا موڈ اچھا دیکھ کر پوچھا۔

"اس نے مجھے گالی دی تھی۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"لیکن کیوں۔۔۔؟"

"کیوں کہ میں نے اس کا سیل فون توڑ دیا تھا۔" اس کی وضاحت نے رباب کو ہکا بکا کیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟" رباب حیران ہوئی۔

"کیوں کہ وہ ساری رات اپنے بوائے فرینڈ سے باتیں کر کے میری نیند ڈسٹرب کرتی تھی۔" اس کے معصوم انداز پر رباب کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی، جس کا شانزے نے خاصا غلط مطلب اخذ کیا تھا۔

"تمہیں تمہارا ابھی تو کوئی ایسا فرینڈ نہیں ہے۔۔۔؟" شانزے کے اگلے سوال پر رباب کو کرنٹ سا لگا۔

"استغفراللہ۔۔۔ میں تمہیں ایسی لڑکی لگتی ہوں۔۔۔" رباب نے برا سا منہ بنایا۔

"ایسی لڑکی سے تمہاری کیا مراد ہے؟" شانزے سے بحث میں جیتنا آسان تھوڑی تھا۔

"میں لڑکوں سے دوستی کو گناہ سمجھتی ہوں۔" رباب نے اس دفعہ کھل کر کہا۔

"سوری۔۔۔ میرا نظریہ اس سے مختلف ہے، میں دوستی کو برا نہیں سمجھتی۔ ہاں اس چیز کو برا سمجھتی ہوں کہ کوئی آپ کی وجہ سے ڈسٹرب ہو یا ذہنی اذیت کا شکار ہو۔"

شانزے نے کھل کر اپنا موقف بتایا، جو رباب کو خاصا عجیب تو لگا، لیکن وہ چپ رہی۔

ویسے بھی شانزے کے ساتھ اس کا وقت دوسروں کی نسبت خاصا اچھا گزر رہا تھا۔ رباب کو اس کی روم میٹ بنتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ شانزے خاصی بے ضرر سی اور کسی حد تک دوسروں کے معاملے میں ٹھیک ٹھاک قسم کی بے حس لڑکی واقع ہوئی ہے۔ وہ رباب کی ذاتیات میں بالکل بھی دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح سے وہ بالکل بھی پسند نہیں کرتی تھی کہ کوئی اس کے پرسنل معاملات کو کریدے۔

اس نے ایک دن خود ہی کسی دھن میں بتادیا تھا کہ اس کے والدین میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ مدر کا کچھ پتا نہیں اور وہ فادر کو کسی نے قتل کروا دیا تھا۔ اس کی پرورش اس کی دادی اور پھپھو نے مل کر کی تھی۔ اس کے پھپھا ٹھیک ٹھاک قسم کے بزنس مین تھے، کچھ اس کی دادی مرتے ہوئے اپنے حصے کا ایک گھر شانزے کے نام کر گئی تھیں۔ جس کا اچھا خاصا کرایہ شانزے کی ضروریات زندگی کے لیے کافی تھا۔ اس لحاظ سے اسے معاشی مسائل کا بالکل بھی سامنا نہیں تھا۔

اس نے بی ایس کرنے کے بعد ایم ایس میں ایڈمیشن بس ہوسٹل میں رہنے کے لیے لے رکھا تھا ورنہ اسے اب پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ صرف اور صرف شوبز میں اپنا ایک نام اور مقام بنانا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا۔۔۔؟" موناے ابرو چڑھا کر عدینہ کے سامنے سخت تعجب کا اظہار کیا۔ "اوہ میرے خدایا۔۔۔" اس کے ماتھے کے بل گہرے ہو گئے۔

"آپا صالحہ کا دماغ ٹھیک ہے؟" پوری بات سنتے ہی مونا کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔ عدینہ کی بھیگی آنکھوں میں ناگواریت کا احساس ابھر ہوا۔ مونا کو ایک لمحے میں احساس ہوا کہ آپا صالحہ کے بارے میں اس کے تلخ الفاظ عدینہ کو اچھے نہیں لگے، کچھ بھی تھا وہ اس کی ماں تو تھیں۔

"آئی ایم سوری۔۔۔" وہ تھوڑا سا سنبھل کر بولی۔

"لیکن آپا نے آپ کی اور عبداللہ بھائی کی منگنی کیوں توڑ دی۔" مونا کے سوال نے اس کے دل پر تیز دھار والی چھری چلائی۔ عدینہ کی بھیگی آنکھوں کے بند ایک دفعہ پھر ٹوٹ گئے۔ وہ آہستگی سے سارا واقعہ اسے سنا گئی۔

"آپ کو عبداللہ بھائی سے ایک دفعہ ضرور بات کرنی چاہیے۔۔۔" مونا نے اسے اکسایا۔

"نہیں کر سکتی۔۔۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ وہ دونوں اب چھت پر چلی آئی تھیں۔ عصر کی نماز کا وقت ہونے والا تھا۔

"آخر کیوں۔۔۔؟" مونا نے احتجاجی نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپا نے منع کیا ہے۔۔۔" عدینہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا۔ وہ خاصی افسردہ لگ رہی تھی۔

"تو آپ ان کو مت بتائیں۔۔۔" مونا کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

"میں کوئی بھی کام آپا سے چھپ کر نہیں کرتی۔۔۔" عدینہ کی اپنی مجبوریاں تھیں، آپا نے شاید کچھ چیزیں گھٹی میں ڈال کر اسے پلا دی تھیں، وہ چاہتے ہوئے بھی ان سے انحراف نہیں کر سکتی تھی۔

"لیکن ایک بار بات کرنے میں کیا حرج ہے؟ یا پھر آپا سے ہی پوچھ لو۔" مونا نے منہ بنا کر کہا۔

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اگر عبداللہ کے ساتھ میری نسبت طے نہ ہوئی تو شاید۔۔۔" عدینہ کی ادھوری بات کا مطلب وہ سمجھ چکی تھی۔

"تو ٹھیک ہے، لیکن کچھ پتا بھی تو چلے، آپا نے ایسا کیوں کیا؟" مونا ہلکا سا جھنجلائی۔

"دونوں کے درمیان میں شاید کسی بات پر تلخ کلامی ہوئی تھی۔ اسی لیے آپا بہت غصے میں ہیں۔" عدینہ ٹھیک ٹھاک پریشان تھی۔

"اب تک سو نفل تو وہ پڑھ چکی ہوں گی۔۔۔" مونا نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

وہ دونوں جانتی تھیں کہ آپا صالحہ سخت پریشانی یا دکھ کے لمحات میں جب جائے نماز پر کھڑی ہوتیں تو پھر

گھنٹوں نفل پڑھتی رہتیں' اس کے بعد جب وہ فارغ ہوتیں تو ان کے چہرے پر ایک الوہی سی چمک ہوتی جو دیکھنے والوں کو بے اختیار نظریں چرانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

''تو اب آپ کیا کریں گی۔۔۔؟'' موٹا کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

دل مسلسل بغاوت پر اترا ہوا تھا۔ محبت اب تک ہزار دلیلیں دے چکی تھی' لیکن عقل کی ایک نگاہ' عدینہ کے اندر کا سارا جوش ختم کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ وہ عشق اور عقل دونوں کو ساتھ لے کر چلتی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر اس کے حلال' حرام' گناہ اور ثواب کے نظریات تھے' جو آپا نے اسے رٹا رکھے تھے۔ وہ دونوں بیچ آ گئی تھیں۔

☆☆☆

آج فضا میں عجیب سی اداسی تھی۔ ہوا بھی سانس روک کر کھڑی تھی' ہر طرف گھٹن کا راج تھا۔ آپا نے آج نہ دوپہر کا اور نہ ہی رات کا کھانا کھایا تھا۔ وہ اور بے بے دونوں بے معنی سی بحث میں الجھی ہوئی تھیں۔ جو موٹا یا عدینہ کے آنے پر فوراً ہی ختم کر دی جاتی اور ان کے جانے کے بعد منقطع سلسلہ وہیں سے جوڑ لیا جاتا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ کافی دیر تو عدینہ کروٹیں بدلتی رہی اور تنگ آ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ موٹا سو چکی تھی۔

''آخر ایسی کون سی بات تھی جو عبداللہ اس کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔۔۔؟'' اس سوچ نے اس کی نیند حرام کر دی۔

''ان کہی باتیں' اور ادھورے جملے' خوب صورت ریپر میں لپٹے کسی گفٹ پیک کی طرح ہوتے ہیں۔ انسان یا تو اپنی پسندیدہ چیز کے خیال سے خوشی سے جھومتا رہتا ہے یا یہ سوچ کر خود کو پریشان رکھتا ہے کہ اگر گفٹ پیک میں سے من پسند چیز نہ نکلی تو کیا ہو گا۔''

''آپا کو تو عبداللہ بہت پسند تھا' ایسا کیا ہوا' جو ان کی ساری پسندیدگی' دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔'' ایک نئی سوچ نے اس کا دامن تھام لیا۔ نیند نے بھی شاید اس رات اس کے پاس نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

وہ ننگے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔ آپا کے کمرے کا زیرو واٹ کا بلب روشن تھا۔ وہ پاس سے گزری' اندر سے آنے والی ریڈیو کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اسے دھچکا سا لگا۔ آپا اور موسیقی دونوں متضاد چیزیں تھیں۔ لیکن اس وقت ریڈیو کی ہلکی ہلکی سی آواز کھڑکیوں سے باہر آ رہی تھی۔ عدینہ کو پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ آپا کو موسیقی سے بھی شغف تھا۔

بلھیا کی جاناں میں کون۔۔۔؟
نہ میں مومن وچ مسیتاں۔۔۔
نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں۔۔۔
نہ میں پاکاں وچ پلیتاں۔۔۔
نہ میں موسیٰ' نہ میں فرعون۔۔۔
بلھیا کی جاناں' میں کون۔۔۔

رات کی خاموشی اور تیرگی میں جب پورے صحن میں موتیا کے پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ صحن کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ آسمان پر موجود چاند اسے آج سے پہلے کبھی اتنا تنہا نہیں لگا تھا۔ دماغ میں بے معنی سوچوں کا ہجوم تھا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی ویسے ویسے اس کا دل پگھل رہا تھا۔ رات کا وہ نہ جانے کون سا پہر تھا۔ وہ ننگے پاؤں صحن سے چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف چل پڑی۔ اس کے گھر کی اور مدرسے کی چھت ایک تھی اور دوسری جانب بھی سیڑھیاں تھیں۔ اس نے مدرسے کی جانب جھانکا' سامنے صحن کے ساتھ بنے برآمدے میں رکھی چارپائی پر اسے عبداللہ کا گمان ہوا۔

چاند کی چاندنی میں اس کا وجود صاف پہچانا جا رہا تھا۔ عدینہ کے دل کی دھڑکنیں بے تاب ہوئیں۔

یہ وہ شخص تھا جس کی محبت نے کسی مکڑی کی طرح آہستہ آہستہ اس کے وجود کے گرد جالا بنا تھا اور

آکٹوپس کی طرح اس کے وجود کو اپنی ذات کے حصار میں جکڑ لیا تھا اور وہ بھی کولہو کے بیل کی طرح اس کی چاہت کے کنویں کے اردگرد چکر لگا کر خوش ہوتی رہتی تھی۔"

آج رات اگر اس پر بھاری تھی تو اس کے ساتھ ساتھ عبداللہ بھی پرسکون نہیں تھا۔ دل کا دل سے کہیں نہ کہیں تعلق تو جڑا ہوا تھا۔ سفید کرتے شلوار میں وہ چارپائی پر رکھے گول تکیے پر کہنی جمائے ہاتھ میں سیل فون پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ عدینہ کو سخت افسوس لاحق ہوا۔

وہ منڈیر پر کہنیاں جمائے مکمل محویت سے اپنے سے کافی فاصلے پر موجود عبداللہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ عبداللہ نے بھی شاید خود کو کسی کی نظروں کے حصار میں محسوس کر لیا تھا۔ اس نے بے چینی سے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کے اردگرد بچھی چارپائیوں پر بہت سے بچے لائن میں سو رہے تھے۔ ایک دم اس نے نظر اٹھا کر چھت کی منڈیر پر کھڑی عدینہ کو دیکھا، اسے ایک لمحے کو اس پر بھٹکی ہوئی روح کا گمان ہوا۔ وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ چھت کی جانب جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ عدینہ کا دل بے ہنگم انداز سے دھڑکا، وہ ایک لمحے کے ہزارویں پل میں سمجھ چکی تھی کہ وہ اسے دیکھ کر چھت پر آ رہا ہے۔ عدینہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ پلٹی اور بجلی کی سی رفتار سے اپنی طرف کی سیڑھیوں کی طرف تیز تیز چلنے لگی۔

"میری بات سنو عدینہ..." وہ چھت پر پہنچ چکا تھا اس کی آواز پر عدینہ کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔ اسے لگا اس نے اس وقت چھت پر آ کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی کی ہے۔ اس لیے وہ رکی نہیں اور سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے..." عبداللہ کی پکار پر اس کے قدم سست تو ہوئے، لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا، اسے معلوم تھا وہ اگر پلٹ کر دیکھ لے گی تو پتھر کی ہو جائے گی۔

"میری آخری بات سن لو عدینہ! پھر پتا نہیں زندگی موقع دے یا نہ دے۔" وہ اب چھت کی سب سے اوپر والی سیڑھی سے نیچے جھانک کر بڑے افسردہ انداز سے اس سے درخواست کر رہا تھا، لیکن عدینہ اس وقت آخری سیڑھی پر پہنچ چکی تھی۔

وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اس طرح اکیلے ملنا، اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے بہتر نہیں، وہ مناسب نہیں سمجھتی۔ اس لیے وہ یہاں سے چلا جائے۔ لیکن عبداللہ کے سامنے تو اس کی قوت گویائی ویسے ہی سلب ہو جاتی تھی۔ وہ نیچے پہنچ چکی تھی، جیسے ہی اس نے صحن میں قدم رکھا اس کی روح فنا ہو گئی۔

سامنے ہی آپا صالحہ غضب ناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، ان کی نگاہوں میں شک، افسوس اور غصے کے رنگ اتنی شدت سے ابھرے کہ عدینہ کو لگا جیسے زمین نے مضبوطی سے اس کے پیروں کو جکڑ لیا ہو۔ آپا آگے بڑھیں۔ انہوں نے جھانک کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ سب سے اونچی سیڑھی پر کھڑا عبداللہ ان کی نگاہوں کی پستیوں میں ایک لمحے میں آن گرا تھا۔ انہیں اپنا فیصلہ بالکل ٹھیک محسوس ہوا۔

"میں نے تمہاری ایسی تربیت تو نہیں کی تھی..." وہ مشتعل انداز سے آگے بڑھیں اور پوری قوت سے ایک تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ عدینہ کو ایسے لگا جیسے پورے گھر کی چھت اس کے سر پر آن گری ہو۔ عبداللہ واپس پلٹ گیا تھا۔

"آپا..." اس نے سخت صدمے سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ ان کو بتانا چاہتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں، انہیں غلط فہمی ہوئی ہے، لیکن اس سے پہلے ہی آپا سخت الفاظ میں شروع ہو چکی تھیں۔

"کسی نامحرم سے تنہائی میں ملنے کا مطلب سمجھتی ہو؟ ہزاروں سال جہنم میں جلو گی۔" وہ بولیں نہیں بلکہ پھنکاری تھیں۔

"میں نے تمہارا نام عدینہ یعنی جنت میں رہنے والی رکھا تھا، لیکن تم وہ بدقسمت لڑکی ہو جسے جہنم پکڑ پکڑ کر

اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ تم سے زیادہ بدنصیب لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" وہ اپنے اندر موجود سارا زہر اگل کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ عدینہ پر تو قیامت سے پہلے قیامت ٹوٹ گئی۔

"اپنی ذلت اور کردار کے بارے میں گواہی دینا جتنا مشکل کام ہے اس سے زیادہ اذیت ناک کسی اپنے کی آنکھوں میں اپنے لیے شک اور بدگمانی کے رنگ دیکھنا ہے۔ انسان ایک لمحے میں جیتے جی مرجاتا ہے اور مرا ہوا انسان کہاں اپنے حق میں گواہی دینے کے قابل رہتا ہے۔" اس حقیقت کا ادراک آج عدینہ کو مکمل کر ہوا۔ وہ بھی زندہ تھی لیکن مرچکی تھی۔

اس کی پاکیزہ محبت نے اسے اس کی ماں کی نظروں میں رسوا کردیا تھا۔

اس کے اپنے زندگی گزارنے کے اصولوں نے عبداللہ کو بدگمان کردیا تھا۔

وہ بھیگی نگاہوں سے آپا کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔ آسمان پر موجود تنہا چاند اسے مزید ذلت سے بچانے کے لیے کہیں چھپ گیا تھا۔ عدینہ کا بھی دل چاہا کہ وہ بھی کسی بادل کو اوڑھ لے اور دور کہیں جاکر پہاڑوں پر برس جائے۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو پہلے سوال کو اچھی طرح پڑھنا' سمجھنا اور پھر حل کرنا۔" اوریدا کا میتھ کا پیپر تھا اور صبح سے اس کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آج خلاف توقع ارصم اسے اسکول چھوڑنے جارہا تھا۔ وہ بدحواس انداز سے اپنے نوٹس کھولے فارمولے رٹنے میں مصروف تھی۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں اوریدا۔" ارصم نے نرمی سے اسے ٹوکا۔

"پلیز ارصم' مجھ سے بات مت کرو' مجھے سب کچھ بھول جائے گا۔" وہ حد درجہ روہانسی تھی۔

"ریلیکس یار' تم ابھی سے اتنی کنفیوز ہو رہی ہو' پیپر کے دوران کیا کرو گی؟" ارصم اس کے لیے پریشان ہوا۔

"وہی ہوگا جو فزکس کے پیپر میں ہوا تھا۔" اس نے منہ بنا کر یاد دلایا۔ فزکس کے پیپر میں وہ اچھا خاصا ایک نیومیریکل اپنی بدحواسی میں غلط کرآئی تھی۔ اور یہ غم ابھی تازہ تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا ان شاء اللہ' لیکن پلیز تم ریلیکس رہنا۔" ارصم نے مسلسل اسے سمجھانے کا فریضہ جاری رکھا۔

"مجھے لگتا ہے ناinth کی طرح میرا اس دفعہ بھی بی گریڈ ہی آئے گا۔" وہ مایوس انداز سے ارصم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اگر اب بی گریڈ آیا تو تمہاری اور میری دوستی ختم' میں کسی نالائق لڑکی کو اپنا دوست نہیں بنا سکتا۔" ارصم نے خاصے غلط موقعے پر دھمکی دی تھی' اوریدا نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ارصم کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"تم سیریس ہو۔۔۔؟" وہ بمشکل پوری قوت لگا کر پھنسی پھنسی آواز میں بولی' ارصم کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اوریدا کا چہرہ دھواں دھواں سا تھا۔

"مذاق کر رہا ہوں یار۔۔۔" اس کی وضاحت سے پہلے ہی وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے بری طرح رونے لگی۔

"مائی گاڈ اوریدا! پاگل ہوگئی ہو کیا۔۔۔؟" وہ گھبرا گیا۔ پیپر سے آدھا گھنٹے پہلے اس کا رونا' پیپر پر کس طرح سے اثر انداز ہوگا' وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

"مجھے پتا ہے۔ تم مذاق نہیں کر رہے ہو۔" اس نے بازو کی پشت سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"میں ایسا کرسکتا ہوں بھلا؟" وہ اب نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہا تھا۔ اوریدا نے بے یقینی سے اس کا پرخلوص چہرہ دیکھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

"زندگی میں سب سے مشکل کام اس شخص کی آنکھوں میں اپنے لیے بے اعتباری دیکھنا ہے' جس کے متعلق آپ ساری دنیا کے سامنے دھڑلے سے دعوا کرتے ہوں کہ وہ آپ کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔" ارصم کی بات پر وہ الجھی۔ خاموش رہی۔

"وہ شخص جس کو آپ ہمیشہ ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتے ہوں اس کی آنکھوں میں آنسو آپ کے لیے کس قدر اذیت کا باعث بنتے ہیں' اگر اسے پتا چل جائے تو شاید اس کی آنکھیں رونا ہی بھول جائیں۔۔۔" وہ اب دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے ہوئے افسردہ انداز سے بول رہا تھا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔" اوریدا کی سمجھ میں بات آگئی تھی۔

"بیسٹ آف لک۔۔۔" اس نے اسکول کے گیٹ کے پاس اپنی گاڑی روکی۔

"تھینکس۔۔۔" اوریدا زبردستی مسکرائی اور گاڑی سے اتر گئی۔ ارصم نے دیکھا' وہ ایک دفعہ پھر نوٹس کھولے فارمولے رٹنے میں مصروف تھی۔ اس کی تمام تر توجہ ہاتھ میں پکڑے کاغذوں کی طرف تھی' تب ہی چلتے چلتے وہ ایک لڑکی سے ٹکرائی۔ ارصم اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے مسکرایا' اسے علم تھا کہ وہ ان پیپرز کو ایگزیمنیشن ہال میں بھی لے جائے گی اور پھر نگران کے ڈانٹنے کے بعد ہی رکھے گی۔

"ارصم! تم کہاں ہو۔۔۔؟" تین گھنٹے کے بعد اس کی بجھے بجھے سے انداز سے کال آئی' ارصم کو افسوس کا احساس ہوا۔

"گیٹ پر۔"

"اوکے آئی ایم کمنگ۔۔۔" پانچ منٹ کے بعد وہ تھکے تھکے سے انداز سے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی گاڑی کی طرف آرہی تھی۔ ارصم کو بغیر بتائے ہی پتا چل گیا۔ اس کے میتھ کے پیپر کا بھی وہی حال ہوا ہے' جو اس سے پہلے فزکس کے ساتھ ہو چکا ہے۔

"تم کب پہنچے۔۔۔؟" وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی لاپروائی سے بولی۔

"میں گھر واپس گیا ہی کب تھا۔۔۔" ارصم کے جواب پر وہ بری طرح چونکی۔ "تم تین گھنٹے سے کیسے باہر روڈ پر کھڑے تھے؟" حیرانی سے اس کی آواز بلند ہوئی۔

"جب اس طرح رو کر جاؤ گی تو کس کا دل چاہے گا واپس جانے کو۔۔۔" وہ ہنسا اوریدا شرمندگی سے سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔ "اتنی دیر کیا کرتے رہے؟"

"تمہارے پیپر ٹھیک ہونے کی دعائیں کرتا رہا۔۔۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز سے کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ لوگوں کو کسی کی بھی دعائیں نہیں لگتیں۔۔۔" وہ خاصی دل گرفتہ تھی۔

"کیا پیپر اچھا نہیں ہوا۔۔۔؟" ارصم نے ایک سگنل پر گاڑی روک کر اس کا چہرہ دیکھا' جو ضبط کی کوشش میں سرخ ہو رہا تھا۔

"دو سوال غلط ہو گئے۔۔۔" اس نے سر جھکا کر اعتراف جرم کیا۔ ارصم کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی' اوریدا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا تو خیال تھا' کم از کم پانچ یا چھ تو تم ضرور غلط کر کے آؤ گی' لیکن تمہاری ایوریج تو نارمل ہے۔" اس نے وضاحت دی۔

"اچھے خاصے آسان سوال تھے' میں نے جلدی میں فارمولا ہی غلط لگا دیا۔" وہ خفت زدہ انداز میں گویا ہوئی۔

"چلو کوئی بات نہیں' اب کیمسٹری کی تیاری اچھی کرنا۔۔۔" ارصم نے اسے حوصلہ دیا۔

"کچھ کھاؤ گی؟" ارصم نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی آہستہ کی۔

"نہیں نہیں۔۔۔ بڑی اماں پریشان ہو رہی ہوں گی' انہیں صبح ایک وظیفہ بتا کر آئی تھی کامیابی کے لیے۔۔۔" اس کے معصوم انداز پر ارصم نے اپنے حلق سے برآمد ہونے والے قہقہے کو بمشکل روکا۔

"کیا بات ہے تمہاری بھی اوریدا! ایسا لگ رہا ہے' تمہارے ایگزام نہیں' پورے گھر کے ہو رہے ہیں۔"

"میں کیا کروں' پاکستان کا امتحانی سسٹم ہی ایسا ہے۔ بس رٹے لگاتے جاؤ۔ پھر بھی کچھ پتا نہیں ہوتا' کس وقت کیا ہو جائے۔" اسے یہاں کے تعلیمی نظام سے بہت شکایتیں تھیں۔ وہ اب گاڑی میں انگلش میوزک لگا کر خاموشی سے سن رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد ارصم کی گاڑی نیلی کوٹھی میں داخل ہوئی اور ساتھ ہی

اوریدا کی آنکھیں پٹ پٹ کر کے کھل گئیں۔ سامنے ہی آنٹی بینش اپنی گاڑی کے انتظار میں ٹہل رہی تھیں۔

اوریدا نے خوف زدہ نگاہوں سے ارصم کی طرف دیکھا' جو بڑے پرسکون انداز سے ان کی ہنڈا سوک پورچ میں کھڑی کر رہا تھا۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟ تمہیں کچھ احساس ہے' مجھے اپنے کلینک جانا تھا۔" وہ بات ارصم سے کر رہی تھیں اور کھا جانے والی نگاہوں سے اوریدا کو دیکھ رہی تھیں۔

"تو کیا ہوا؟ آپ آغا جی کی گاڑی لے جاتیں۔۔۔؟" ارصم نے آنکھ کے اشارے سے اوریدا کو اندر جانے کو کہا تو وہ فوراً" اپنی چیزیں سمیٹ کر باہر نکل آئی' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سلیمانی ٹوپی اوڑھ لے تاکہ آنٹی بینش کو نظر ہی نہ آئے۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے' میں اپنی گاڑی کے علاوہ کسی اور کی چیز استعمال نہیں کرتی۔" وہ چڑ کر بولیں۔

"اوریدا کا پیپر تھا' بڑی اماں نے کہا تھا مجھے اسے لانے کو۔" اس نے سنجیدہ انداز سے وضاحت دی۔

"لیکن تم پچھلے تین گھنٹے سے غائب ہو گھر سے۔۔۔" ان کا موڈ ابھی تک بھی مکمل خراب تھا۔

"بڑی تھنک یہ لیں اپنی چابی۔۔۔" اس نے صلح جو انداز سے گاڑی کی چابی ان کی طرف بڑھائی' جو انہوں نے ناراضی سے انداز میں باقاعدہ چھینی تھی۔

"جتنی مرضی کوششیں کرلو' رزلٹ پھر بھی پچھلے سال جیسا ہی آئے گا۔"

وہ اوریدا کے پاس سے گزرتے ہوئے طنزیہ انداز سے بولیں اور غصے سے گاڑی کا دروازہ زور سے بند کیا۔ اوریدا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کا چہرہ شرمندگی کے گہرے احساس سے سرخ ہوا اور وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی' پھر ساری دوپہر وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی' بڑی اماں کو بھی خود اس کے پیپر کا پوچھنے کے لیے چل کر کمرے میں آنا پڑا۔ آنٹی بینش کا طنزیہ لہجہ اور استہزائیہ نگاہیں اسے بار بار

تنگ کر رہی تھیں' تنگ آکر اس نے انگلینڈ میں اپنے پاپا کو کال ملالی۔

"تمہیں علیحدہ گاڑی کیوں چاہیے اوریدا! جب پہلے سے تین تین گاڑیاں گھر میں موجود ہیں۔" تیمور اپنی بیٹی کی اچانک فرمائش پر حیران ہوئے۔

"ان میں سے ایک بیا آنٹی کی' ایک بڑے ابا کی اور ایک آغا جی کی ہے۔" اس نے باقاعدہ انگلیوں پر گن کر بتایا۔

"پاپا ان میں سے میری کوئی بھی نہیں ہے۔۔۔" اس دفعہ اس کے لہجے میں کچھ تھا' جو ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر موجود تیمور کے دل کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ وہ بری طرح چونکے۔

"اوریدا! تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔۔۔؟" انہوں نے محتاط انداز سے اپنی لاڈلی بیٹی سے پوچھا۔

"جی پاپا۔۔۔" اوریدا کا دل گرفتہ انداز انہیں بہت کچھ سمجھا گیا۔

"کس نے۔۔۔؟"

"بیا آنٹی نے۔۔۔" اوریدا کے منہ سے نکلے ان تین الفاظ نے تیمور کے آج کے دن کا سارا سکون درہم برہم کر دیا۔ انہوں نے مزید ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔

وہ اب اس سے ادھر ادھر کی دوسری باتیں کر رہے تھے' لیکن دماغ میں اوریدا کی بات نے ایک حشر سا برپا کر دیا تھا۔ رات سے پہلے پہلے تیمور کے بہترین دوست شہریار علی' ان کی بیٹی کے لیے زیرو میٹر "وٹز" گاڑی نیلی کوٹھی میں پہنچ گئے تھے۔ گاڑی پہنچتے ہی گھر بھر میں حیرانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"گھر میں تین تین گاڑیاں کھڑی تھیں' تم نے اوریدا کے لیے اور کیوں بھجوائی۔۔۔؟" بڑی اماں سیل فون کان کے ساتھ لگائے ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں' دوسری طرف تیمور تھے' جو اس وقت بڑی اماں کے سوال و جواب کے سیشن کی زد میں تھے۔

بڑے ابا کے ساتھ ساتھ ارصم نے بھی چونک کر اوریدا کی طرف دیکھا' جو بوکھلا کر چاولوں کی پلیٹ پر جھک گئی۔ بڑے ابا اگلے ہی لمحے بڑے سکون سے کھانا

کھانے لگے۔ لیکن ارصم ٹھیک ٹھاک قسم کا بے چین ہو چکا تھا۔ وہ آج اتفاق سے ان کی طرف کھانے پر موجود تھا۔

"کیا احساس محرومی ہو رہا تھا تمہاری بیٹی کو...؟" بڑی اماں کے انداز سے باقاعدہ ناراضی جھلکی۔ ارصم نے پھر نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

. ا. . ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔ انہیں ٹھیک ٹھاک قسم کا غصہ آ رہا تھا۔ دوسری جانب تیمور نے کچھ کہا تھا، جسے سنتے ہی بڑی اماں کے ہونٹوں کو چپ لگ گئی۔ وہ اب خاموشی سے تیمور کی باتیں سن رہی تھیں۔

اوریدا کا سارا دھیان بڑی اماں کی گفتگو کی طرف تھا، لیکن ان کی ہوں، ہاں سے وہ دوسری جانب ہونے والی بات چیت کا اندازہ لگانے میں ناکام ہوئی تو سکون سے بیٹھ کر کھانے لگی... بڑی اماں نے مزید کوئی بھی بحث کیے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ وہ اب سنجیدہ انداز سے اپنی پلیٹ میں کھانا نکال رہی تھیں۔ اوریدا نے کن انکھیوں سے ان کے چہرے کو پڑھنے کی ناکام کوشش کی۔ اسی دوران بڑے ابا نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اس ساری گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لیا تھا، ویسے بھی اوریدا کا اس گھر میں ہونا یا نہ ہونا ان کے لیے برابر تھا۔

"میرے کمرے میں گرین ٹی بھجوا دیجیے گا..." بڑے ابا نے بڑی اماں سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے ڈائننگ روم سے نکلتے ہی بڑی اماں نے ناراض نگاہوں سے اوریدا کو دیکھا، وہ گڑبڑا گئی۔ بڑی اماں نے بھی ہاتھ میں پکڑی روٹی جھنجلا کر پلیٹ میں رکھی اور خفا خفا سے انداز سے کھانا کھائے بغیر چلی گئیں۔ اب وہ ارصم کی گہری نظروں کے حصار میں تھی۔ آج تو امتحان پر امتحان ہو رہے تھے۔

"تم نے ماما کی گاڑی والی بات کو مائنڈ کیا تھا...؟" وہ اب سنجیدگی سے اس کا بوکھلایا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"نہیں تو..." وہ صاف مکر گئی اور ارصم کے سامنے اس طرح مکرنا اسے اتنا مہنگا پڑے گا، اسے اس چیز کا پہلے سے اندازہ ہوتا تو کبھی جھوٹ نہ بولتی۔

"ایک بات یاد رکھنا اوریدا! مجھے زندگی میں ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے جھوٹ۔" ہلکی سی برہمی اس کے لہجے سے چھلکی "تم ساری دنیا کے سامنے جھوٹ بول سکتی ہو، لیکن میرے سامنے نہیں..." وہ ڈائننگ روم سے نکلتے نکلتے اس کا سارا سکون غارت کر گیا۔

شام تک وہ بے چینی سے اس کے نمبر پر کئی دفعہ کال کرتی رہی۔ لیکن نمبر مسلسل بند جا رہا تھا۔ تنگ آ کر وہ لان کی طرف نکل گئی، ارصم سامنے ہی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اوریدا کے بیٹھنے پر بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"مجھے بیا آنٹی کی وہ بات واقعی اچھی نہیں لگی تھی..." اس نے ہلکا سا جھجک کر وضاحت دی۔ ارصم کی ناراضی کے ڈر سے اس نے اعتراف کیا۔

"لیکن انہوں نے تمہیں نہیں، مجھے کہا تھا..." ارصم نے گردن موڑے بغیر اسے یاد دلایا۔

"میری وجہ سے ہی کہا تھا..." اوریدا نے احتجاجی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور تم نے انکل تیمور کو شکایت لگا کر گاڑی منگوالی..." ارصم کے لہجے میں ہلکی سی خفگی جھلکی۔

"میں نے شکایت نہیں لگائی تھی، بس یہی کہا تھا کہ مجھے گاڑی کی ضرورت ہے۔" اس نے فوراً وضاحت دی۔

"چلانی آتی ہے تمہیں...؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں..." اس کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تو ارصم نے پہلی دفعہ گردن موڑ کر اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔

"جلد ہی سیکھ لوں گی۔" اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

"کیمسٹری کے پیپر کی کیسی تیاری ہے؟" وہ اب نارمل انداز سے پوچھ رہا تھا۔

"ایک لفظ بھی پڑھا نہیں جا رہا..." اس نے بے

چارگی سے کہا تو ارحم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، جو خاصی افسردہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ آہستگی سے بولی۔ "تم جو خفا تھے مجھ سے......"

"میں ساری دنیا سے خفا ہو سکتا ہوں اور یدا، لیکن تم سے نہیں۔" وہ کھل کر مسکرایا تو اور یدا کی جان میں جان آئی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ہی پرسکون ہوئے۔ سارے دن کی ذہنی مشقت کے بعد اب جا کر وہ پرسکون ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اب ہلکے پھلکے انداز سے اس کے ساتھ گپ شپ لگا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا ہے......؟" موتا اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی تھی، جب کہ عدینہ کے لبوں پر لگتا تھا۔ کسی نے خاموشی کی پکی مہر لگا دی ہو، وہ آج صبح سے اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ طبیعت میں عجیب سی پژمردگی کا رنگ غالب تھا۔

"عبداللہ بھائی کی امی آئی تھیں آپا سے ملنے......" موتا نے اسے اطلاع دی، لیکن وہ خاموشی سے اپنے ہاتھ کے ناخنوں پر لگا عرق دیکھتی رہی، یہ عرق اکثر عدینہ بڑے اہتمام سے موتا سے ملوائی تھی، کیونکہ نیل پالش لگانے کی اجازت آپا نے اسے کبھی نہیں دی تھی۔

"لیکن آپ اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلیں، بجھ کر وہ بے مل کر چلی گئیں۔" موتا کی اس بات پر بھی اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"آپ کو منگنی ٹوٹنے کا غم ہو رہا ہے ناں......؟" موتا نے ہمدردی سے اس کے متورم چہرے کو دیکھا وہ شاید ساری رات روتی رہی تھی۔

"نہیں......" اس کے سپاٹ لہجے نے موتا کو حیران کیا۔

"کیوں......؟"

"مجھے منگنی ٹوٹنے کا غم نہیں، بلکہ اس اعتبار کے ٹوٹنے کا غم ہے، جو آپا کو مجھ پر تھا۔" اس نے بہت دیر بعد ایک طویل تبصرہ بولا۔

"کیسا اعتبار؟" وہ پریشان ہوئی۔

"وہ اعتبار جو کبھی انہیں مجھ پر تھا ہی نہیں۔" اس کی استہزائیہ مسکراہٹ پر موتا مزید الجھ گئی۔ وہ خاموشی سے عدینہ کا غم میں ڈوبا چہرہ دیکھنے لگی۔ اسی وقت دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر آپا صالحہ کی گیارہ بارہ سالہ شاگرد ضوبیہ اندر داخل ہوئی، اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔

"کیا بات ہے ضوبیہ؟ کیا کام ہے؟" موتا نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا اس وقت اسے ضوبیہ کی آمد سخت ناگوار گزری تھی۔

"عدینہ باجی...... وہ......" ضوبیہ اٹکی۔ وہ ہراساں نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

"آپا صالحہ سے آج کوئی سفارش نہیں کریں گی عدینہ باجی، سمجھیں۔" مدرسے کی بچیاں اکثر عدینہ یا موتا سے سفارش کر کے آپا سے چھٹی لے لیا کرتی تھیں، اس وقت بھی وہ یہی سمجھی تھیں کہ ضوبیہ ایسے ہی کسی کام کے سلسلے میں آئی ہے۔

"ایسی بات نہیں ہے، مجھے تو......" ضوبیہ شش و پنج کا شکار ہوئی۔

"کیا یہ 'وہ' لگا رکھی ہے، صاف صاف بات کرو۔" موتا کا مدرسے کی بچیوں پر خاصا رعب تھا۔ وہ آپا کا رائٹ ہینڈ کہلاتی تھی۔

"مجھے تو عبداللہ بھائی نے بھیجا ہے کہ عدینہ باجی کا موبائل نمبر لکھوا کر لاؤ۔" ضوبیہ کی بات پر وہ دونوں ہی حیران ہوئیں۔

"ان سے کہہ دو، میں اپنا نمبر آپا کی اجازت کے بغیر کسی کو نہیں دیتی۔" عدینہ کے دو ٹوک انداز پر موتا نے احتجاجی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دے دیں، کیا حرج ہے۔" موتا ہلکا سا منمنائی۔

"ہرگز نہیں۔" عدینہ کے سخت لہجے پر وہ بچی گھبرا کر کمرے سے نکل گئی۔

"ایک دفعہ بات کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں......" موتا کو اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔

"انسان کو کوئی بھی غلط کام کرنے سے پہلے یہی سوچنا

ہے کہ وہ پہلی اور آخری دفعہ کر رہا ہے' لیکن بات ساری ہی "پہلے" قدم کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد شیطان آپ کے پیروں کے ساتھ پہیے باندھ دیتا ہے' انسان خود ساختہ فرضی دلیلوں سے اپنے ضمیر کو مطمئن کرتا ہوا برائی کے راستے کی طرف بھاگنے لگتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان غلط کاموں پر بھی خود کو دھٹائی سے حق بجانب سمجھنے لگتا ہے۔"

وہ سنجیدہ انداز سے مزید گویا ہوئی۔ "میں اپنی پہلے قدم کی جھجک کو ختم کرنا نہیں چاہتی۔"

"عبداللہ بھائی بہت اچھے ہیں عدینہ۔" موتا نے جھنجلا کر کہا۔

"میں نے کب کہا وہ برے ہیں' بری چیز تو وہ نامحرم رشتوں کے درمیان موجود تنہائی اور شیطانی حربے ہوتے ہیں۔ جن سے پناہ مانگنی چاہیے۔" عدینہ نے اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں' وہ ویک اینڈ پر گھر آئی تھی اور کل اسے نکلنا تھا۔ اسی وقت ضوبیہ ہانپتی کانپتی واپس آئی اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک چیٹ چھپا رکھی تھی' جو اس نے آتے ہی عدینہ کے بیڈ پر رکھ دی۔

"یہ کیا ہے؟" عدینہ سمجھ تو گئی تھی' لیکن بچی کو سخت نگاہوں سے دیکھا۔

"عبداللہ بھائی نے دیا ہے۔" وہ بچی گھبرا کر شرمندگی سے گویا ہوئی۔

"آئندہ مت لے کر آنا' اچھی بچیاں ایسے کام نہیں کرتیں' چلو بھاگ جاؤ یہاں سے۔" عدینہ نے جلدی سے چیٹ اٹھائی۔

"عدینہ! تمہیں رات کم از کم میری بات تو سننی چاہیے تھی۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا یا خود پر؟ خیر میں پرسوں تبلیغی دورے پر ملائشیا جا رہا ہوں' اور جانے سے پہلے کچھ چیزیں کلیئر کرنا چاہتا ہوں' پلیز مجھ سے ایک دفعہ تو بات کر لو۔"

عدینہ نے اس چیٹ کو بہت سنجیدگی سے پڑھا۔ اس کے انداز میں اب بے چینی سی جھلک رہی تھی۔ وہ دوبارہ سے سفید کاغذ پر تحریر عبداللہ کی موتیوں جیسی خوب صورت تحریر کو دیکھنے لگی' اس کے بعد کچھ سوچ کر اس نے وہ چیٹ اپنی فزیالوجی کی کتاب میں رکھ دی۔

"عبداللہ بھائی نے کیا لکھا ہے؟" موتا کے بے تاب انداز پر وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

"کچھ نہیں' وہی بات کرنے کا مطالبہ' جو میں پورا نہیں کر سکتی۔" وہ افسردہ سے انداز سے کھڑی ہوئی' موتا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں آپا سے بات کرنے جا رہی ہوں۔ تم بے بے کو ایک کپ چائے کا بنا کر دے آؤ۔" وہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جو سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا میں موجود نمی سے اس نے اندازہ لگایا۔ دور کہیں پہاڑوں پر بارش ہو رہی تھی۔

"مجھے آپا کو اپنی صفائی دینی چاہیے۔" اس نے آپا صالحہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ آپا نے سلام پھیر کر بے زاری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک اس سے خفا تھیں۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے آپا۔" وہ جھجک کر مزید بولی۔ "ویسا کچھ نہیں تھا' جو رات آپ سمجھی تھیں۔"

"لیکن مجھے تمہاری وضاحتوں کی ضرورت نہیں ہے عدینہ' میں سب کچھ جانتی ہوں' جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔" انہوں نے ناراضی سے کہہ کر ایک دفعہ پھر نیت باندھ لی۔ عدینہ کچھ لمحے تو انہیں دیکھتی رہی اور پھر افسردہ سے انداز سے بے بے کے کمرے کی طرف بڑھ آئی۔ دل میں گھٹن کا احساس ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔

وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی' سامنے بے بے اور موتا کوئی مارننگ شو نشر مکرر دیکھنے میں مگن تھیں۔

عدینہ بھی خاموشی سے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

بے بے ٹی وی کی خاصی شوقین تھیں۔ جبکہ آپا صالحہ اور عدینہ کو ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔ ہاں' کبھی کبھار آپا صالحہ اپنی ساس کے ساتھ بیٹھ کر کوئی اسلامی مذاکرہ یا

قرآن و حدیث کے متعلق دینی پروگرام ضرور دیکھ لیتی تھیں۔ ٹی وی کے معاملے میں دونوں ساس بہو کی پسند خاصی مختلف تھی۔

☆ ☆ ☆

"بہت اذیت میں ہوں، آپ سوچ بھی نہیں سکتے کس قیامت سے گزر رہی ہوں میں۔" مارننگ شو کے اس خصوصی پروگرام میں فون کرنے والی خاتون کی آواز شدتِ غم کی زیادتی سے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ مشہور و معروف چینل کے لائیو پروگرام کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ میزبان آج ذرا بہتر حلیے میں تھی۔ سفید رنگ کا نیٹ کا دوپٹہ بمشکل سر پہ ٹکائے، وہ گاہے بگاہے اپنے دائیں جانب تین سیٹوں پر موجود ایک مفتی صاحب اور دو مختلف مکتبۂ فکر کے عالم دین پر سرسری سی نظر ڈال لیتی تھی۔ وقفے وقفے سے ہاتھ میں موجود چٹ سے بھی استفادہ کیا جا رہا تھا۔

"دیکھیں بی بی، جب تک آپ اپنا مسئلہ مکمل کر نہیں بتائیں گی ہم کیسے مشورہ دیں گے آپ کو۔" مارننگ شو میں بیٹھے مفتی صاحب نے الجھن بھرے انداز سے اپنی میزبان کو دیکھا جو خود بھی لائیو کالر کی بے ربط گفتگو کی وجہ سے بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی ....

"میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں جو میرے کرب کو، میرے دکھ کو بیان کر سکیں۔" وہی خاتون بمشکل بولیں۔

"دیکھیں مس نگہت صاحبہ آپ مفتی صاحب کو اپنا مسئلہ بتائیں، ہمارے پاس وقت کی قلت ہے اور ہمیں ابھی بریک پر بھی جانا ہے۔" مارننگ شو کی میزبان کے لہجے کی سنجیدگی نے شاید دوسری طرف موجود کالر کو سنگینی کا احساس دلا دیا تھا، اسی وجہ سے وہ اب بولنے پر آمادہ تھی۔

"مفتی صاحب میں دو دن پہلے ہی سعودیہ سے لوٹی ہوں، عمرہ کرنے گئی تھی۔" فون کال پر موجود خاتون کے لہجے میں افسردگی کا عنصر غالب آیا۔

"ماشاء اللہ یہ تو بہت سعادت کی بات ہے...." مفتی صاحب نے لقمہ دیا۔

"لیکن.... اب میں سوچتی ہوں کہ کاش میں نہ جاتی۔" خاتون کی اگلی بات نے مارننگ شو میں موجود تمام لوگوں کو تعجب میں مبتلا کیا۔

"خدانخواستہ ایسا کیا مسئلہ ہو گیا میری بہن....." ایک عالم دین ذرا محتاط انداز سے بولے۔

"مجھ جیسی بدقسمت گناہ گار عورت پوری دنیا میں نہیں ہو گی، جسے اللہ نے اپنے گھر بلا کر دھتکار دیا۔" اس عورت کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش شامل ہوئی۔

"ایسا کیا ہوا وہاں....؟" مفتی صاحب کی پیشانی پر موجود بل گہرے ہوئے۔

"آپ کو شاید یقین نہ آئے مولانا صاحب...." اس عورت کی بات پر میزبان خاتون نے کوفت سے پہلو بدلا۔

"آپ کچھ بتائیں گی تو پتا چلے گا ناں...." میزبان نے قدرے تیز اور جھنجھلائے ہوئے انداز سے کہا۔

"ہاں ہاں میری بہن، آپ مکمل کر بتائیں...." عالم دین صاحب نے ذرا نرمی سے انہیں بولنے پر اکسایا۔

"ایسا ہے مفتی صاحب جب میں حرم میں پہنچی۔" وہ شرمندگی سے اٹکیں۔

"ہاں ہاں پھر....؟" میزبان کی بے تابی عروج پر تھی۔

"تو مجھے حرم کے صحن میں خانہ کعبہ ہی نظر نہیں آیا...." وہ عورت پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ سارا مارننگ شو میں موجود تمام لوگوں کا دماغ بھک کر کے اڑ گیا۔ وہ بے یقینی انداز سے اس فون کال کو سن رہے تھے۔

"کیا مطلب....؟" مارننگ شو کی میزبان کو بریک پر جانا بھول گیا۔

"میں سات دن تک حرم کے صحن میں گھومتی رہی، ایک ایک شخص سے پوچھتی تھی کعبہ کدھر ہے، لیکن جو بھی مجھے اشارے سے بتاتا تو مجھے وہاں خالی جگہ کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا، آپ سوچ نہیں سکتے میں

کتنی اذیت میں ہوں۔۔۔" وہ اب بلند آواز میں رو رہی تھی۔ اس کی دردناک آواز میں کچھ تھا جو وہاں موجود سننے والوں کو دہلا رہا تھا۔

"استغفار۔۔۔ استغفار۔۔۔" مفتی صاحب کے ساتھ بیٹھے ایک عالم دین صاحب بے ساختہ گویا ہوئے۔

"توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔" مارننگ شو میں بیٹھیں کچھ خواتین نے خوفزدہ انداز سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"آپ سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا میری بہن۔ جو اللہ نے آپ کو اپنے گھر کے دیدار کی سعادت ہی نصیب نہیں کی۔" عالم دین صاحب نے فوراً" ہی خاتون کو گناہ گار ہونے کی سند ہاتھ میں تھمادی۔۔۔

"ایک ایسا گناہ جو میں یہاں سب کے سامنے نہیں بتا سکتی، مجھے سمجھ نہیں آ رہی میں کیا کروں؟" عورت کی کال ڈراپ ہو گئی۔ ساتھ ہی عدینہ نے بیزاری سے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کا بٹن آف کر دیا۔

"پتہ" مفتی صاحب کا جواب تو سننے دیتیں۔۔۔" بے بے تڑپ کر بولیں۔

"عدینہ باجی چلائیں نال ٹی وی۔" مونا نے بھی بے چینی سے پہلو بدلا، وہ دونوں اس وقت بے جی کے کمرے میں موجود تھیں۔

"ڈرامے بازی ہے ساری ان مارننگ شو والوں کی۔" عدینہ نے بیزاری سے اپنی اناٹومی کی کتاب کھولی۔

"تو اب ایسا جھوٹ تو نہیں بول سکتے چینل والے۔۔۔" مونا کو یقین ہی نہیں آیا۔

"آج کل ہر کوئی دین کا تڑکہ لگا کر اپنی ہنڈیا بیچ رہا ہے۔ ہم فطری طور پر ایک ڈرپوک قوم ہیں، مذہب کے ڈراوے میں آ کر اکثر وہ کام بھی کر جاتے ہیں، جو کوئی ہم سے کلاشنکوف سے بھی نہیں کروا سکتا۔" عدینہ کا جذباتی پن فوراً" ہی باہر نکل آیا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔۔۔" مونا ابھی بھی متفق نہیں ہوئی۔

"تم تاریخ اٹھا کر دیکھ لو، مذہب کو جتنا نقصان ان جنونیوں نے پہنچایا ہے، کسی عام بندے نے نہیں پہنچایا ہو گا۔"

"لیکن یہ عورت کم از کم جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔" بے بے کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"ایک سو ایک فیصد جھوٹی اور جعلی کال تھی، ورنہ یہ کیسے ممکن ہے، کسی کو سامنے موجود مجسم چیز نظر نہ آئے۔" عدینہ کی بات نے بے بے اور مونا دونوں کو شش و پنج میں مبتلا کر دیا، عقل چھلانگ لگا کر دل کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اور اب پوری ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔

"ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو بھلا ایسے کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔۔۔" مونا بھی کچھ مطمئن ہوئی۔

"یہ عورت جھوٹ نہیں بول رہی۔۔۔" آپا صالحہ جو کمرے کے دروازے میں کھڑی تھیں، سپاٹ لہجے میں بولیں، وہ تینوں چونک گئیں۔ پتا نہیں وہ کب سے وہاں کھڑی تھیں، انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ عدینہ نے گھبرا کر اناٹومی کی کتاب پر سر جھکا لیا۔

"وہ کیسے آپا۔۔۔؟" مونا بے تابی سے بولی۔

"جب کوئی شخص نفس کو اپنا معبود بنا کر شریعت کی حدود و قیود سے بے نیاز ہو جائے، سرکشی پر اتر آئے تو اللہ اس سے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتیں چھین لیتا ہے، جب دلوں پر مہر لگ جائے تو انسان کی آنکھیں وہی دیکھتی ہیں، جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ وہی سنتی ہیں، جو وہ سننا چاہتا ہے۔"

صالحہ بیگم کی آنکھوں سے بے آواز آنسو ایک لڑی کی صورت میں بہہ نکلے۔ اس سمے وہ لواسی کا ایک ایسا صحرا لگ رہی تھیں، جس کے دامن سے انسان کو سوائے پیاس اور تھکن کے کچھ نہیں ملتا۔ عدینہ اور مونا دونوں کو دھچکا لگا۔ آپا کمرے سے جا چکی تھیں۔ وہ دونوں بھی آہستگی سے باہر نکل آئیں۔ آپا صالحہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عدینہ کو اپنی ناراضی بھی وقتی طور پر بھول گئی۔

"آخر ایسی کیا بات تھی جو آپا صالحہ کو رلا گئی۔۔۔؟" عدینہ پریشان ہو رہی تھی۔ جب کہ مونا کا ذہن ابھی تک اس مارننگ شو کی خاتون کی بات میں الجھا ہوا تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے، وہ عورت ٹھیک کہہ رہی

تھی؟" مونا فکر مندی سے بولی۔

"ویسے تو اللہ بہتر جانتا ہے' لیکن میرے خیال میں اس خاتون کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہوا ہوگا۔۔۔" عدینہ نے مونا کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" مونا نے بے تابی سے پوچھا۔

"چونکہ وہ عورت گناہ کے گہرے احساس سے مغلوب ہو کر وہاں گئی تھی' اس لیے ہو سکتا ہے' اسے ایسا محسوس ہوا ہو۔" عدینہ نے سنجیدگی سے جواب دیا' اس کا دماغ ابھی تک آپا صالحہ کے آنسوؤں میں الجھا ہوا تھا۔

"پتا نہیں کیوں' مجھے لگتا ہے' آپا ٹھیک کہہ رہی تھیں۔۔۔" مونا نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔۔۔" عدینہ نے۔۔۔ لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ وہ دونوں چلتے چلتے جامن کے درخت کے نیچے آن کھڑی ہوئیں۔

"آپ سے ایک بات پوچھوں عدینہ باجی۔۔۔؟" مونا نے موضوع گفتگو بدلا۔

"ہاں' پوچھو۔" عدینہ نے مسکرا کر اپنی چھوٹی سی دوست کو دیکھا' جس سے اسے سگی بہنوں کی طرح محبت تھی۔

"آپ واقعی عبداللہ سے بات نہیں کریں گی۔۔۔" مونا نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" عدینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب ہے' آپ کو ان سے محبت تھی ہی نہیں۔۔۔" اس نے منہ بنایا۔

"مجھے اب بھی اس سے محبت ہے' لیکن میں ایسی محبت کو نہیں مانتی' جسے ہر لمحہ اپنے ہونے کے لیے ثبوت کی ضرورت ہو۔" عدینہ نے لاپروائی سے کہا۔

"بہت ظالم ہیں آپ۔۔۔" مونا کو اس کا فیصلہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"اپنے مذہب اور معاشرے کی اخلاقی اقدار کا خیال رکھنے کے لیے اپنے نفس پر ظلم کرنا پڑتا ہے کیونکہ نفس کا گھوڑا تو بے لگام ہوتا ہے۔ جہاں چاہے دوڑا کر لے جائے۔ وہ تو حدود و قیود سے ماورا ہوتا ہے۔"

عدینہ اور مونا چلتے چلتے بے بے کے تندور کے پاس چلی آئیں۔ جو کہ بالکل ٹھنڈا پڑا تھا کیونکہ دونوں سے بے بے نے اس میں آگ نہیں سلگائی تھی۔ تندور کے پاس کافی سارا سوکھا بالن اور ردی۔۔۔ کاغذوں کا ڈھیر تھا۔ جو شاید آپا نے اسٹور روم سے نکلوائے تھے۔

عدینہ کی نظر اچانک چارلس ڈکنز کی کتاب Great Expectations پر پڑی' وہ چونک گئی۔ کتاب خاصی بوسیدہ حالت میں تھی۔ اس کے کافی صفحات کو دیمک کھا گئی تھی۔ وہ سخت حیرانگی سے اس کتاب کو کھول کر دیکھ رہی تھی' اچانک اس کے اندر سے ایک بہت پرانی بلیک اینڈ وائٹ پاسپورٹ سائز کی تصویر نکل کر زمین پر جا گری۔ جسے مونا نے فوراً" اٹھا لیا۔

"ارے یہ کس کا فوٹو ہے؟" مونا نے الجھن بھرے انداز سے تصویر کو دیکھا۔ سیاہ پینٹ کوٹ میں فرنچ کٹ داڑھی کے ساتھ وہ شخص اپنے دور کا خاصا ہینڈسم اور فیشن ایبل مرد لگ رہا تھا۔ عدینہ نے اسے پہچاننے کی کوشش کی' لیکن ناکام ہو گئی۔

"یہ کتاب کہاں سے آئی گھر میں؟" عدینہ نے حیرانگی سے مونا سے دریافت کیا۔

"میں نے اسٹور کی پڑچھتی سے یہ سارا گند اتارا تھا۔" مونا نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "لیکن یہ بندہ ہے کون؟ آپا سے پوچھوں؟"

"خبردار۔۔۔ آپا کا پتا ہے ناں۔" عدینہ نے اسے ڈرا کر تصویر پکڑی اور اپنے کمرے میں لے آئی۔ کافی دیر تک وہ بغور اس تصویر کا جائزہ لیتی رہی اور پھر تنگ آ کر اپنی ڈائری میں رکھ دی۔ وہ اسے پہچاننے سے قاصر تھی۔

"ہو سکتا ہے' اباجی کے کسی کزن کی ہو۔" اس نے خود کو مطمئن کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن کے پردے پر عبداللہ کی وہ خفا خفا سی آنکھیں ابھریں اور اسے ایک دفعہ پھر بے چین کر گئیں۔ وہ ایک دفعہ پھر عبداللہ کو سوچنے لگی۔

"کیا سوچتا ہوگا وہ' میں نے اس کے ساتھ رابطہ

کیوں نہیں کیا۔" کوئی ہزارویں دفعہ اس نے یہ جملہ سوچا۔ ایک دفعہ پھر اس کا سارا سکون غارت ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"تیمور اپنی چیپ حرکتوں سے کبھی باز نہیں آ سکتا۔" ڈاکٹر بینش کافی کے دو کپ لیے آغاجی کے اسٹڈی روم میں داخل ہوتے ہوئے غصے سے بولیں۔ اکثر شام کو دونوں باپ بیٹی ڈسکشن کرتے ہوئے کافی اکٹھے پیا کرتے تھے۔

"اب کیا کیا اس نے...؟" آغاجی نے گود میں رکھی میڈیکل کی بھاری کتاب بند کی اور اپنی اکلوتی بیٹی کا چہرہ غور سے دیکھا' جس پر تیمور کے نام پر دنیا جہان کی بیزاری اور کوفت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر رقص دکھائی دے رہا تھا۔

"اپنی چھٹانک بھر کی بیٹی کو نئی گاڑی لے کر دے دی اس نے۔" انہوں نے کمرے کی کھڑکیوں سے پردے ہٹاتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"تو کیا ہوا؟ اس کی بیٹی ہے اوریدا' وہ لے کر دے سکتا ہے۔" آغاجی نے لاپروائی سے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے سمجھایا۔

"آپ کو اصل بات کا علم نہیں ہے آغاجی۔" وہ جھنجھلا کر پلٹیں۔

"اچھا تو جو اصل بات ہے وہ تم بتا دو مجھے۔" ان کے اطمینان میں ذرہ بھر جو فرق آیا ہو۔ ڈاکٹر بینش ان کو سارا واقعہ سنا گئیں۔ جسے آغاجی نے بہت اطمینان اور سکون سے سن کر سنجیدگی سے کہا۔ "بہت غلط کیا تم نے ارسم کے ساتھ...؟"

"ارسم کے ساتھ...؟" وہ چونکیں۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں' انہوں نے اوریدا کی طبیعت صاف کی ہے۔

"تمہیں اندازہ ہے' تمہاری اس حرکت سے تمہارا بیٹا کتنا ہرٹ ہوا ہو گا؟"

"ارسم ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو سیریس نہیں لیتا۔" انہوں نے آغاجی سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

"چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے رشتوں میں ایسے بدگمانی کے سوراخ کر دیتی ہیں کہ انسان ساری عمر ان سوراخوں میں وضاحتوں کی اینٹیں لگا کر بھی اپنے خوب صورت رشتے کو نہیں بچا سکتا۔" آغاجی نے اپنے مخصوص اور دوٹوک انداز میں کہا وہ الجھ سی گئیں۔

"دیکھ لینا ارسم! اب تمہاری گاڑی کو بھی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔" انہوں نے مزید اپنی بیٹی کا سکون غارت کیا۔

"ایسا نہیں ہے آغاجی' وہ جانتا ہے مجھے وقتی طور پر غصہ آتا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے' آزما کر دیکھ لینا۔" ڈاکٹر بینش کو آزمانے کے لیے زیادہ دیر انتظار کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

اسی رات جب وہ ان کے اسٹڈی روم کے کونے میں رکھی میز پر ایک مریض کی فائل کھولے کیس کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ارسم بے تکلفی سے دروازہ کھول کر آغاجی کے پاس چلا آیا۔ جو اپنے کمپیوٹر ٹیبل کے سامنے بیٹھے تھے۔

"آغاجی آپ کی گاڑی کی چابی کہاں ہے' مجھے ذرا مارکیٹ تک جانا ہے۔" ارسم کی آواز پر ڈاکٹر بینش نے مڑ کر دیکھا۔ ارسم ان کی موجودگی سے بے خبر تھا' ورنہ اس طرح بلند آواز میں آغاجی کو مخاطب نہ کرتا۔

"میری گاڑی لے جاؤ' اس کی چابی پڑی ہے لاؤنج میں۔" انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' جو اب قدرے سنجیدہ سا لگ رہا تھا۔

"تھینک یو ماما' لیکن مجھے اس وقت آغاجی کی ہی گاڑی چاہیے۔" اس کا انداز ڈاکٹر بینش کو سلگا سا گیا۔

"میرے بیڈ روم کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہیں چابیاں' وہاں سے لے لو۔" آغاجی نے ممکنہ بحث سے بچنے کے لیے ارسم کو منظر سے غائب کیا۔

"تھینک یو آغاجی۔" وہ فوراً" اسٹڈی روم سے نکل آیا۔

"آپ نے اس کے اسٹائل دیکھے ہیں۔" ڈاکٹر بینش تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور شکایتی نظروں سے اپنے باپ کو دیکھا۔

"میں نے کہا تھا ناں۔ وہ تمہاری گاڑی اب استعمال نہیں کرے گا۔" آغا جی نے انہیں یاد دلایا۔ وہ جھنجلا سی اٹھیں۔

"اب یہ اتنی سی عمر میں اپنی اماں کو اناد کھائے گا۔ دماغ خراب کر دیا ہے اس لڑکی نے اس کا۔"

"اس میں اوریدا کا کوئی قصور نہیں' اس کا مزاج شروع سے ہی ایسا ہے' یاد نہیں ایک دفعہ تم نے اسے اپنا سیل فون اٹھانے سے منع کیا تھا' دوبارہ جو کبھی اس نے ہاتھ لگایا ہو اسے۔۔۔"

آغا جی نے انہیں یاد دلایا لیکن ڈاکٹر بینش کو سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ وہ اپنے پوائنٹ سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ کیس کو بھول کر ارصم کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش میں مگن ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"اوریدا ہزار دفعہ سمجھایا ہے کلچ سے آہستہ آہستہ پاؤں ہٹایا کرو' تم ایک دم اٹھا لیتی ہو' اس لیے گاڑی بار بار بند ہوتی ہے۔" اوریدا کے ایگزام ختم ہو چکے تھے اور وہ اس وقت ارصم کے ساتھ ایک خالی پلاٹ میں گاڑی چلانا سیکھ رہی تھی۔

"کیا مصیبت ہے بابا کو آٹومیٹک گاڑی لے کر دینی چاہیے تھی۔" وہ کلچ' بریک اور گیئر کے چکر میں الجھی ہوئی بیزاری سے ناک چڑھا کر بولی۔

"اتنا آسان کام تو ہے ڈرائیونگ کرنا۔۔۔" ارصم نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر گیئر کی پریکٹس کروانی شروع کی۔

"یہ میرا گیئر نہیں لگتا مجھ سے۔۔۔" وہ تپ کر نیچے اتر آئی۔

"تم ہر کام سیکھنے سے پہلے اتنا شور کیوں مچاتی ہو اوریدا؟ میں چلا گیا تو کوئی بھی اتنی محنت سے نہیں سکھائے گا تمہیں۔" ارصم ٹشو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"تم کہاں جاؤ گے۔۔۔؟" وہ بوکھلا سی گئی۔

"ماما سوچ رہی ہیں مجھے میڈیکل کے لیے کنگ ایڈورڈ لاہور میں بھیجیں گی۔" ارصم نے اس کی سماعتوں میں ایک بم ہی تو پھوڑا تھا۔ اوریدا کے حواس بالکل ہی ساتھ چھوڑ گئے' وہ کئی لمحے تو بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی اور ایک دم ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بھئی تمہیں سکھا کر جاؤں گا ڈرائیونگ' ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔" ارصم غلط سمجھا تھا۔

"میں اس لیے نہیں رو رہی ہوں۔۔۔" اس نے بازو کی پشت سے آنکھوں کو رگڑا۔

"تو۔۔۔؟" وہ حیران ہوا۔

"تم یہاں اسلام آباد' پنڈی سے بھی تو کر سکتے ہو میڈیکل۔" اس کی بات پر وہ ایک دم ہنس پڑا۔

"مائی گاڈ۔ تم کتنی بے وقوف ہو اوریدا۔۔۔ میں تو سمجھا۔" اس نے مسکرا کر بات ادھوری چھوڑی۔۔۔

"تم ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے ہو۔" اس کے غلط الزام پر وہ ہنکا سا کڑبڑایا۔

"لیکن اس میں رونے کی کیا بات ہے؟" وہ سنبھل کر گویا ہوا۔

"تمہیں معلوم ہے' پورے پاکستان میں تمہارے علاوہ کوئی اور میرا دوست نہیں ہے۔" اس کا جتاتا ہوا انداز ارصم کو مسکرانے پر مجبور کر گیا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تم اپنی کلاس میں اچھی اچھی لڑکیوں سے فرینڈشپ کر لو۔" اس نے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مفت مشورہ دیا۔

"لڑکیاں کبھی بھی اچھی دوست نہیں ہوتیں۔" اوریدا کے اپنے نظریات تھے۔

"اور پاکستان میں لڑکوں سے دوستی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔۔۔" ارصم نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"تمہارا رزلٹ آ رہا ہے کل۔" ارصم کی اطلاع پر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"پھر ایف ایس سی میں ایڈمیشن لو گی ناں.....؟" ارصم نے اسے چھیڑا۔

"نفرت ہے مجھے میڈیکل سے....." وہ چڑ کر بولی۔

"اوں ہوں..... ایسے نہیں کہتے' بلکہ اچھی بات ہے ناں' تم بھی میرٹ بنا کر اسی کالج میں آجانا' جہاں میں تمہارا سینئر ہوں گا۔" ارصم کے مشورے پر وہ بے ساختہ خوش ہوئی' لیکن اگلے ہی لمحے اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"میرا تو مر کر بھی میرٹ نہیں بنے گا۔" وہ اپنے بارے میں کافی خود آگاہ تھی۔ ارصم نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ دونوں لمبی واک کر کے گھر پہنچے تو ارصم اپنے پورشن کی طرف بڑھ گیا' جبکہ وہ اپنے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ بڑی اماں کے ساتھ بڑے ابا کو وہاں بیٹھے دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اسے دیکھتے ہی بڑی اماں کو اچانک یاد آیا۔

"تمہاری رات طبیعت خراب تھی کیا؟" بڑی اماں نے جانچتی نگاہوں سے اپنی پوتی کو دیکھا' جو کہیں سے بھی بیمار نہیں لگ رہی تھی۔

"نہیں....." اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"پھر سات سمندر پار بیٹھے تمہارے باپ کو کیا کوئی خواب آیا تھا.....؟" بڑی اماں نے ناراض نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا تو اوریدا کو ایک دم ہی یاد آ گیا۔

"وہ....." اس نے لمبا سا "وہ" لوا کیا تو بڑی اماں کو ایک لمحے میں احساس ہو گیا کہ یہ آگ واقعی ان کی اسی پوتی کی لگائی ہوئی ہے۔ وہ تپ سی گئیں۔

"وہ تو رات ہلکا سا زکام تھا مجھے' جب پاپا سے بات کر رہی تھی میں....." اس نے شرمندگی سے وضاحت کی۔

"ہزار دفعہ سمجھایا ہے ایسی باتیں مت بتایا کرو اسے' تمہیں تو ہلکا سا زکام تھا' اسے پریشانی سے وہاں بیٹھ کر بخار ہونے لگتا ہے۔" بڑی اماں نے بیزاری سے سر جھٹکا تو اوریدا ٹھیک ٹھاک شرمندہ ہو گئی۔

"اب کو تم بدھو بن کر کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں' وہ کچن میں رکھا میٹھی سوئیوں کا باؤل ارصم کو دے کر آؤ۔" وہ جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"بڑے ابا' پاپا سے کیوں خفا ہیں اتنا....." بڑا سا لان عبور کرتے ہوئے وہ یہی بات سوچتی ہوئی ارصم کے پورشن کی طرف بڑھی جیسے ہی اس نے لاؤنج کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا' آنٹی بینش کی تیز اور تلخ آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"آغا جی' تیمور کی بیٹی مر مر کر بی گریڈ بھی لے لے تو بڑی بات ہے۔ آپ میڈیکل میں جانے کی بات کر رہے ہیں۔" آنٹی بینش کا سلگتا لہجہ اوریدا نے بغور سنا تھا۔ وہ ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔

"مجھے تو لگتا ہے اس دفعہ کہیں ایک آدھ کمپارٹ ہی نہ آجائے اس کی۔" وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

"اب اتنی بھی نالائق نہیں ہے وہ۔" آغا جی ہمیشہ غیر جانبدار ہو کر بات کرتے تھے۔

"آپ کو نہیں پتا' شکل تو باپ کی لے لی ذہانت میں پوری ماں پر ہے۔ اسی کی طرح ڈفر اور نالائق۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔ ان کی ہنسی کی آواز نے اوریدا کو شرمندگی کے عمیق گڑھے میں اوندھے منہ گرایا تھا۔ وہ اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ سن ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ وہ کچھ دیر تو لان چیئر پر بیٹھی رہی اور پھر کچھ سوچ کر اس کے قدم سرونٹ کوارٹرز کی طرف اٹھ گئے۔ وہ آنٹی بینش کی کڑوی باتیں سن کر میٹھی سوئیاں اندر لے جانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

اس لیے چوکیدار کے خاندان پر یہ عنایت کر کے خود آ کر اپنے بیڈ روم میں بیٹھ گئی۔ وہ اب دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اللہ کرے بڑی اماں ارصم سے سوئیوں کا نہ پوچھیں' ورنہ اس کی شامت یقینی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اوہ نو..... مجھے یقین نہیں آ رہا....." شانزے ہیئر ڈرائر سے اپنے بال خشک کرتے ہوئے پُرجوش انداز سے بولی۔

"اس میں یقین نہ کرنے والی کیا بات ہے۔" رباب

سے سجادی۔ پے شانزے کا خوش و خرم چہرہ دیکھا تو اسے
احساس ہوا۔ خوشی کے رنگ خام سے چہرے کو بھی کتنا
خوب صورت بنا دیتے ہیں' یہ تو شانزے کا حسین چہرہ
تھا جو اس وقت لشکارے مار رہا تھا۔

"جب ارسل صاحب نے مجھے کال کی اور بسنت
کے ایڈ کا بتایا تو سچ پوچھو میں کئی لمحے تک بول ہی نہیں
سکی۔" وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو چکی تھی۔ آج اسے
سی کے ریفرنس سے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کی
طرف سے کال آئی تھی اور پچھلے دو گھنٹوں سے اس کی
تیاریاں جاری تھیں۔

"اچھا اچھا زیادہ خوش نہیں ہوتے' کبھی کبھار
انسان کو اپنی ہی نظر لگ جاتی ہے۔" رباب نے اسے
ٹوکا۔

"تم دیکھنا رباب' اس ایڈ کے بعد میرے پاس کام کا
ڈھیر لگ جائے گا۔" وہ اپنی ہی دھن میں مستقبل کے
خوشنما خواب دن میں دیکھ رہی تھی۔

"ان شاء اللہ۔" رباب نے خلوص دل سے کہا۔

"وہ فیشن شو والے دن بھی مجھے کسی ماڈل گرل کی ہی
بری نظر لگی ہو گی' ورنہ میں تو اس سے بھی بڑی ہیل
پہن کر بڑے آرام سے چل لیتی ہوں۔" شانزے نے
بڑی مہارت سے بلش آن لگاتے ہوئے رباب کی بات
کو آگے بڑھایا۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں چاروں قل پڑھ کر اپنے اوپر
پھونک مار لیا کرو۔" رباب کے پاس ہر چیز کا روحانی
علاج موجود تھا۔

"سچ پوچھو یار' چار قل میں سے صرف تین آتے
ہیں مجھے۔" وہ ہلکی سی شرمندگی سے مسکارے کا
ڈھکن کھول رہی تھی۔

"کسی دن ٹائم نکال کر یاد کر لو نا۔" رباب نے
اس کی پھیلائی ہوئی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

"یار بہت مشکل ہیں' تم ہی پڑھ کر پھونک دیا کرو
نا' آخر روم میٹ ہو تم میری۔" شانزے کا موڈ آج
خاصا خوشگوار تھا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔" رباب نے گیلا تولیہ واش
روم کے اسٹینڈ پر رکھا۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں۔" شانزے کی تسلی
نہیں ہو پا رہی تھی' سفید نیٹ کی میکسی میں وہ ہلکے
میک اپ کے ساتھ خاصی دلکش لگ رہی تھی۔

"ماشاء اللہ۔ ایسا لگتا ہے چاند زمین پر اتر آیا
ہو۔" رباب نے کھلے دل سے اسے سراہا۔ وہ مسکرا کر
اپنے ہائی ہیل سینڈل پہننے لگی' نازک پٹیوں والے
سفید سینڈلز میں اس کے خوب صورت پیروں پر نظر
نہیں ٹھہر رہی تھی۔ اس نے بلڈ ریڈ کلر کی نیل پالش
اپنے لمبے لمبے ناخنوں پر لگا رکھی تھی۔

"دعا کرنا۔" اس نے اپنا سفید موتیوں والا کلچ
اٹھاتے ہوئے رباب سے درخواست کی۔

"دھیان سے جانا۔" رباب نے فکر مند انداز میں
اسے نصیحت کی۔

"تم کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہو؟" وہ جاتے جاتے
پلٹی اور خوشگوار انداز سے مسکرائی۔

"میرا خیال ہے گیٹ کیپر سے کہہ کر ٹیکسی گیٹ پر
منگوا لو۔" رباب اس کے لیے ایسی ہی کیئرنگ تھی۔
اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر فکر مند ہونے والی۔

"ارے رہنے دو یار' خواہ مخواہ سات آٹھ سو مانگ
لے گا' میں مین روڈ سے لے لوں گی۔" اس نے
لاپروائی سے کہتے ہوئے ایک دفعہ پھر دیوار پر فکس
بڑے سارے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہ اب
کھل کر کسی فاتح کی طرح مسکرا رہی تھی۔

شانزے جیسے ہی اپنے روم سے نکلی' کوریڈور سے
گزرتی لڑکیوں نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ لڑکیوں کی
توصیفی نگاہیں اس کے لیے نئی نہیں تھیں۔ وہ اس
وقت خود کو خاصا انرجیٹک محسوس کر رہی تھی۔

"کس کے دل پر بجلیاں گراتے جا رہی ہو۔۔؟"
سوشیالوجی کی اقصیٰ نے اسے شرارت سے چھیڑا۔
ویسے بھی اس کے تعلقات شانزے کے ساتھ بہتر
تھے۔ ورنہ کسی اور کو ایسا بے تکلفانہ رویہ کرنے کی
اجازت کم از کم شانزے نہیں دے سکتی تھی۔

"ابھی تو ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی والوں نے بلایا'

ہے مجھے۔" اس نے بڑی ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکا دیا۔

"یار جس ایڈ میں اتنی آفت ماڈل ہوگی' وہ چیز تو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔" قصیٰ کے توصیفی جملے نے اس کا سیروں خون بڑھا دیا۔

گیٹ تک اس نے بہت سے کمنٹس اپنا حق سمجھ کر وصول کیے تھے۔ وہ اب ہوسٹل سے نکل کر مین روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ روڈ پر خاصا رش تھا۔ وہ بڑے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی۔

اچانک دو منچلے لڑکے بائیک پر ون ویلنگ کرتے ہوئے ایک گلی سے نمودار ہوئے۔ شانزے ڈر کر ہلکا سا پیچھے ہٹی۔ وہ دونوں اب گول گول دائروں کی صورت میں شانزے کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ شانزے اس وقت کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح ان دونوں شرارتی لڑکوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو اس کے ڈرنے پر خوش ہو رہے تھے۔ شانزے کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

اچانک سائیڈ گلی سے ایک گاڑی بڑی تیزی سے برآمد ہوئی اور ایک موٹر سائیکل والا اس کی زد میں آیا۔ وہ موٹر سائیکل سمیت اچھل کر سڑک پر دوسری جانب گرا۔

اور اس کی موٹر سائیکل بے قابو ہو کر سڑک پر موجود شانزے سے ٹکرائی اور اسے لگا جیسے کسی نے گرم گرم سا رخ اس کے جسم میں گھسا دی ہو۔ وہ پشت کے بل زمین پر گری۔ اس کا ماتھا پھٹ چکا تھا اور ماتھے سے نکلنے والا خون سڑک پر پھیلتا جا رہا تھا۔ شانزے کو ایک دفعہ پھر بازی اپنے ہاتھ سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"کہا تھا ناں محنت کر لو اب رونے کا کیا فائدہ...؟"

ارصم نے جیسے ہی ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھا' حسب توقع سامنے وہی منظر تھا' جس کی امید لے کر وہ اپنے پورشن سے نکلا تھا۔ اوریدا کا میٹرک کا رزلٹ آچکا تھا۔

وہ صوفے پر دونوں پاؤں اوپر رکھے دھواں دھار انداز میں رونے میں مصروف تھی۔ ارصم کو دیکھتے ہی آنسوؤں میں ایکدم ہی روانی آگئی۔

"لو آگیا تمہارا ہمدرد۔" بڑی اماں نے ارصم کو دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

"تم ہی سمجھاؤ اسے' میرا تو بول بول کر منہ دکھنے لگا ہے۔" بڑی اماں اس کے مسلسل رونے پر خاصی کوفت کا شکار تھیں۔

"اوریدا کیا پرابلم ہے' پاس تو ہو گئی ہو...؟" وہ اس کے پاس بیٹھ کر ہمدردی سے گویا ہوا۔

"ہونہہ سی گریڈ میں..." وہ روتے روتے تلخ انداز میں بولی۔

"تو محنت کرنی تھی ناں..." بڑی اماں بھی زخموں پر نمک چھڑکنے میں ماہر تھیں۔

"کیا محنت کرتی...؟" وہ جھنجلا کر کھڑی ہوئی۔ "ماما کی ڈیتھ کے بعد میں نے نائنتھ کے پیپرز بغیر تیاری کے دیے تھے۔"

"تو اب تو پورا سال تھا ناں تمہارے پاس اس سال محنت کر لیتیں..." بڑی اماں نے منہ بنا کر پاس رکھا باداموں کا جار کھولا اور دو تین بادام منہ میں ڈالے۔ اس وقت ان کا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔

"آپ سب لوگوں کی بددعاؤں سے ہی میرا سی گریڈ آیا ہے۔" وہ ہمیشہ کی طرح بغیر سوچے سمجھے بولی تو بڑی اماں کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

اسی وقت بڑے ابا' اپنی بھتیجی بینش کے ساتھ ہاسپٹل سے گھر پہنچے' وہ دونوں لاؤنج میں داخل ہو رہے تھے۔ ارصم نے انہیں دیکھ لیا تھا جبکہ اوریدا اور بڑی اماں کی ان کی جانب پشت تھی اس لیے انہیں ان کی آمد کا احساس نہیں ہوا۔

"اچھا...؟ کس نے دی تمہیں ایسی بددعا؟" بڑی اماں نے محض مزا لینے کے لیے پوچھا۔

"آنٹی بیا اور بڑے ابا نے..." اس نے ترنخ کر جواب دیا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے بڑے ابا اور ڈاکٹر

بینش کو جھٹکا ہی تو لگا تھا۔

"وہ لوگ ہی چاہتے تھے میں فیل ہو جاؤں۔"

اوریدا کی بات پر بڑے ابا ہلکا سا کھنکھارے' اوریدا نے جیسے ہی مڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل پتھر کی ہو گئی تھی۔ بینش آنٹی نے کھا جانے والی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اوریدا کا چہرہ فق ہو گیا۔ بڑے ابا ایک سرد سی نگاہ اس پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"اسلام علیکم۔" ڈاکٹر بینش کی آواز پر بڑی اماں بھی گڑبڑا سی گئیں۔ وہ خفا نگاہوں سے اوریدا کو گھور رہی تھیں' جو حواس باختہ سے انداز سے کھڑی تھی۔

"اوریدا! تم جاؤ اندر۔" بڑی اماں نے سب سے پہلے مجرم کو منظر عام سے ہٹانے کی کوشش کی۔

"تائی اماں' اپنی پوتی کو بتا دیجئے گا میرے پاس بد دعاؤں کا اتنا فالتو اسٹاک نہیں ہے' جو میں ایروں غیروں پر لٹاتی پھروں۔" ڈاکٹر بینش ٹھیک ٹھاک برا مان چکی تھیں اور اس کا اظہار ان کے سرد لہجے سے ہو رہا تھا۔

"ارے' یہ تو بچی ہے' اسے کیا پتا۔" بڑی اماں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ہونہہ بچی۔" وہ استہزائیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بڑے ابا کی اسٹڈی کی طرف بڑھ گئیں۔

"ارصم اب کیا ہو گا۔؟" وہ خوف زدہ لہجے میں اس سے کوئی پانچویں بار پوچھ چکی تھی۔ وہ دونوں اس وقت لان کی طرف نکل آئے تھے اور یونہی چہل قدمی کر رہے تھے۔ اوریدا کو اپنا رزلٹ بھول کر اب نئی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔

"کچھ بھی نہیں ہو گا' ڈونٹ وری۔" ارصم ہر قسم کے حالات میں پر سکون رہتا تھا۔

"آنٹی بینش تو سخت ناراض ہو چکی ہیں مجھ سے۔"

"وہ تم سے خوش ہی کب تھیں۔" ارصم نے اس کا مذاق اڑایا تو وہ فوراً ہی مشتعل ہو گئی۔ "ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔"

"انکل تیمور کو بتایا تم نے اپنے رزلٹ کا۔؟"

ارصم نے اس کا دھیان بٹانے کو خاصا غلط سوال پوچھ لیا تھا۔ اوریدا کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"مجھے لگتا ہے' تم نے اپنی آنکھوں کے پیچھے کوئی ٹیوب ویل لگا رکھا ہے' جو ہر وقت چلتا رہتا ہے۔" وہ ہلکا سا چڑ کر بولا۔

"وہ تمہیں اتنی باتیں سننی پڑیں تو پھر پتا چلے ناں۔" وہ جتنی جلدی رونا شروع کرتی تھی اتنی ہی جلدی چپ بھی کر جاتی تھی۔ "پاپا نے ٹھیک ٹھاک سنائی ہیں مجھے۔ بہت زیادہ ہرٹ ہوئے ہیں وہ میرے سی گریڈ سے۔"

"چلو ایف ایس سی میں ان کے گلے دور کر دینا۔" ارصم نے ہلکے پھلکے انداز سے کہا' وہ دونوں گیٹ کھول کر باہر نکل آئے۔ اب لمبی سڑک پر واک کرنے لگے۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔

"مجھے ایف ایس سی نہیں کرنی۔ میں فائن آرٹس پڑھوں گی اب۔" وہ ارادہ کر چکی تھی' ارصم ایک لمحے کو چپ ہوا اور پھر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"میرے کہنے پر بھی نہیں کرو گی۔؟" ارصم کی بات پر اس کے قدم سست ہوئے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے چونک کر ارصم کی طرف دیکھا۔ شاہ بلوط کے درختوں پر اترتی شام بڑے دل سے مسکرائی۔ وہ اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے بڑے مزے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اوریدا کا دل عجیب سی لے میں دھڑکا۔

"چلو ٹھیک ہے اگر فائن آرٹس میں کرنا چاہتی ہو تو اسی میں کر لو۔" وہ زیادہ دیر تک کسی کو اپنے لیے امتحان میں نہیں ڈال سکتا تھا' یہ تو اس کے سامنے اوریدا تھی جس کی پڑھائی سے دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اگر تیمور کا ڈر اور ارصم کی محنت نہ ہوتی تو شاید وہ اپنی ماں کی اچانک وفات کے بعد کبھی بھی نہیں پڑھ سکتی تھی۔

"نہیں۔ میں سوچوں گی۔" ارصم کو وہ کبھی بھی دو ٹوک انداز میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔

"میرا خیال ہے گھر چلنا چاہیے' کافی دیر ہو گئی۔" وہ چلتے چلتے کافی دور نکل آئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اگلا پورا ہفتہ وہ آنٹی بینش اور بڑے ابا سے دانستہ چھپتی رہی، لیکن دس دن کے بعد آنٹی بینا سے اس کا سامنا ہو ہی گیا۔ ناشتے کی میز پر وہ بڑی اماں اور بڑے ابا کے ساتھ موجود تھی، جب آنٹی بینش بڑے پرجوش انداز میں ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں۔

"بڑے ابا، مبارک ہو، ارحم نے ایف ایس سی میں ٹاپ کیا ہے۔" آنٹی بینش نے یہ اطلاع تو سب کو دی تھی، لیکن ان کا جتاتا ہوا لہجہ اور طنزیہ نگاہوں سے اوریدا کو دیکھنا بڑی اماں نے بطور خاص نوٹ کیا۔

"ماشاء اللہ بہت بہت مبارک ہو، ارحم مجھے کبھی بھی مایوس نہیں کرتا، بہت جینیس ہے وہ۔" اوریدا نے پہلی دفعہ بڑے ابا کو اتنا خوش دیکھا تھا۔

"ظاہر ہے بڑے ابا! بیٹا کس کا ہے۔" آنٹی بینش کے لہجے میں چھپی خود پرستی اوریدا کے لیے نئی تھی۔

"تو پھر کب کر رہی ہو سیلیبریشن۔۔۔؟" بڑے ابا، آنٹی بینش کے ساتھ باتیں کرتے کرتے ڈائننگ روم سے نکل گئے۔

"یہ تو پہلے ہی کسی کو جینے نہیں دیتی تھیں اب تو:" بوا رحمت چائے کا فلاسک لاتے ہوئے بیزاری سے بڑبڑائیں۔

"اپنی اپنی قسمت کی بات ہے بوا، ورنہ ٹاپ تو میری طیبہ نے بھی کیا تھا۔" بڑی اماں نے رنجیدہ سے انداز سے آہ بھری۔ "تب بھی جلال صاحب اتنا خوش نہیں ہوئے تھے جتنا بینش کی اولاد کے لیے ہو رہے ہیں۔"

"ساری زندگی بھتیجی سے فرصت ملتی تو کسی اور کی طرف دیکھتے۔" بوا رحمت سارے خاندانی رازوں سے واقف تھیں۔

"پاپا، ارحم نے بورڈ میں ٹاپ کیا ہے۔" اس نے جھٹ سے باپ کو فون ملایا اور بڑے پرجوش انداز سے اطلاع دی۔

"کاش کہ ایسی کوئی نیوز تم مجھے اپنے حوالے سے دیتیں تو مجھے بھی خوش ہونے کا موقع ملتا۔" دوسری جانب تیمور نے خاصا جل کر کہا۔ اوریدا پر حیرت ٹوٹ پڑی۔

"تمہارے اس "سی" گریڈ نے مجھے بڑے ابا کے سامنے جتنا "ڈی" گریڈ کیا ہے تم اس ذلت کا احساس نہیں کر سکتیں۔ بہت مایوس کیا ہے تم نے مجھے اوریدا۔" وہ فون بند کر چکے تھے۔ ارحم کے اچھے رزلٹ نے ان کے سارے زخم ہرے کر دیے تھے، ان کی بہت خواہش تھی کہ اوریدا ان کی طرح آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہوتی، لیکن اوریدا نے ان کے بیٹے ماہیر کے مقابلے میں ہمیشہ انہیں مایوس ہی کیا تھا۔

"میرے اتنے اچھے رزلٹ کی لگتا ہے تمہیں بالکل خوشی نہیں ہوئی۔" وہ اس شام ارحم کے ساتھ مثالی ریسٹورنٹ میں تھی۔ ارحم اسے بڑی اماں سے اجازت لے کر اسپیشل ڈنر کروانے لایا تھا۔ وہ کچھ چپ چپ سی تھی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

"پھر ایسے منہ بنا کر کیوں بیٹھی ہو۔۔۔؟" ارحم نے دونوں کہنیاں میز پر رکھ کر اس کی طرف غور سے دیکھا، وہ کچھ پزل ہوئی۔

"ایسے ہی پاپا کی باتیں بار بار ذہن میں آ رہی تھیں۔" اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ "ایک بات پوچھوں ارحم۔۔۔؟"

"ہاں ضرور۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے اوریدا کو دیکھا جس کے چہرے پر افسردگی صاف جھلک رہی تھی۔

"ارحم! کیا کبھی میری بھی پوزیشن آ سکتی ہے۔" وہ خفت زدہ انداز سے اٹک اٹک کر بولی۔

"ہاں کیوں نہیں، اگر تم محنت کرو تو۔" وہ اسے کبھی بھی مایوس نہیں کرتا تھا۔

"ہائے ارحم۔۔۔ ہاؤ آر یو۔" شوخ و چنچل سی دو لڑکیاں اچانک ہی کسی ٹیبل سے اٹھ کر ان کے پاس پہنچیں۔ ارحم انہیں دیکھ کر کھل کر مسکرایا۔

"ہائے زرش، کیسی ہو؟ میٹ مائی کزن اوریدا۔" شاکنگ پنک جینز پر بے بی پنک ٹاپ میں ملبوس اس باربی ڈول ٹائپ لڑکی نے بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ

اوریدا کی طرف بڑھایا۔ اس کے چہرے پر موجود دوستانہ مسکراہٹ کم از کم اوریدا کو اچھی نہیں لگی تھی۔

"اوریدا! یہ زرش آفاق ہے' اس نے بورڈ میں سیکنڈ پوزیشن لی ہے۔" ارصم کے پرجوش انداز پر وہ زبردستی مسکرائی۔

"بہت تیز ہو تم ارصم! ہر دفعہ مجھے زخم لگا جاتے ہو' اب میڈیکل میں دیکھوں گی' کیسے مجھ سے آگے بڑھتے ہو۔" وہ بے تکلفی سے ارصم سے مخاطب ہوئی۔

"تم ایک دفعہ کہہ کر تو دیکھو' میں خود ہی رضاکارانہ طور پر اپنی پوزیشن سے دست بردار ہو جاؤں گا۔" ارصم کے شوخ لہجے پر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اس کی ہنسی کی پھوار اوریدا کے دل پر کسی گرم پانی کے آبشار کی طرح برسی اور پورا دل ہی جلا گئی۔

"کہاں ایڈمیشن لے رہے ہو۔۔۔؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"تم کہاں لوگی۔۔۔" وہ بھی مکمل طور پر زرش کی طرف متوجہ تھا۔

"تمہیں بتا تو ہے اسکول' کالج ہر جگہ ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں' اب پھر ہمیشہ کی طرح جہاں تم' وہاں ہم۔" وہ خاصے پُراعتماد انداز سے گویا ہوئی۔

"اس کا مطلب ہے اگلے پانچ سال پھر تم سے جان نہیں چھوٹنے گی۔" ان دونوں کی چھیڑ چھاڑ اوریدا کے لیے خاصی بے چینی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ بیزاری سے سامنے پہاڑوں پر اترتی شام کو دیکھنے لگی' جو اس سے پہلے اسے اتنی بری کبھی نہیں لگی تھی۔

"ماشاء اللہ بہت برلینٹ اسٹوڈنٹ تھی یہ۔" اس کے جانے کے بعد ارصم نے توصیفی لہجے میں تبصرہ کیا جو کم از کم اوریدا کو زہر لگا تھا۔

"لگ تو نہیں رہا۔" اوریدا نے برا سامنہ بنایا۔

"ارے نہیں نہیں۔۔۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے' بہت اچھی اسٹوڈنٹ اور بہت زبردست ڈیبیٹر رہی ہے زرش۔" ارصم لاپروائی سے فرائیڈ رائس اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے اسے یقین دلا رہا تھا۔

"تمہاری فرینڈ ہے کیا؟" اوریدا کا انداز خاصا عجیب تھا۔

"ہاں یہی سمجھ لو۔" وہ رشین سلاد اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اس کی ساری بھوک اڑا چکا تھا۔

"کلوز فرینڈ۔۔۔؟" اس کے سوال پر وہ پہلی دفعہ چونکا اور حیرانگی سے اپنی کزن کا بے زار سا چہرہ دیکھا' اسے پہلی دفعہ کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔

"اوریدا! یہ پاکستان ہے' یہاں گرل فرینڈز نہیں ہوتیں۔۔۔" وہ سنبھل کر بولا۔ "تم کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اوریدا کے سپاٹ لہجے نے اسے حیران کم اور پریشان زیادہ کیا۔

"کوئی بات بری لگی ہے تمہیں؟" وہ ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں رکھ کر اب پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں تو سمجھتی تھی' میں ہی تمہاری فرینڈ ہوں۔" اس نے شکایتی نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے ارصم کو دیکھا۔

"تم میری فرینڈ اور کزن بھی تو ہو۔" وہ محتاط انداز سے گویا ہوا۔ سامنے بیٹھی لڑکی کی حساسیت اسے اکثر امتحان میں ڈال دیتی۔

"تم اس کے والے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن مت لینا۔" اس کی عجیب و غریب فرمائش پر وہ بوکھلا گیا۔ اس نے ابھی تک کھانا بھی پلیٹ میں نہیں نکالا تھا اور روٹھے روٹھے انداز سے بیٹھی تھی۔

"اوریدا! کوئی پرابلم ہے تمہارے ساتھ؟" وہ اب سنجیدگی سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی' مجھے اچھی نہیں لگی یہ لڑکی۔" اوریدا نے خود کو سنبھالتے ہوئے دانستہ لاپروا انداز اپنایا۔

"وہ بہت اچھی لڑکی ہے اوریدا! تم غلط سمجھ رہی ہو۔" وہ ہلکا سا جھنجلایا' اوریدا ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں پٹخ کر غصے سے کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران ہوا۔

"مجھے گھر جانا ہے۔" اس کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب ہو چکا تھا۔ ارصم کو اس کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ میز پر سارا کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ اور یدا نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ ارصم کو خاصا دکھ ہوا۔ وہ خاموشی سے پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ بہت اچھے ڈنر کا اختتام خاصے برے طریقے سے ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے عدینہ؟" سائرہ نے اس دن ہوسٹل آتے ہی اس سے پوچھا۔

"کیوں کیا ہوا؟" گھر جانے کے لیے پیکنگ کرتے ہوئے وہ چونکی اور اپنی روم میٹ کو دیکھا' جو اپنا سفید اوور آل تہہ کر کے ہینگر میں لٹکا رہی تھی۔

"تمہاری آج کی پریزنٹیشن بھی سو سو تھی اور کل اناٹومی کے ٹیسٹ میں بھی تم نے نمبر اچھے نہیں لیے۔ پروفیسر رضی سخت حیران ہو رہے تھے' انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا یہ تمہارا ٹیسٹ ہے۔" سائرہ اس کے پاس آ کر ہمدردی سے بولی۔

"پتا نہیں کیوں' آج کل اسٹڈی میں دل نہیں لگ رہا میرا۔" اس نے صاف گوئی سے کہا اور اپنے بیگ کی زپ بند کی۔ ویک اینڈ کی وجہ سے وہ گھر جا رہی تھی۔

"گھر میں کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟" سائرہ پریشان ہوئی۔

"شاید ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔" وہ خود بری طرح الجھی ہوئی اب اپنا عبایا پہن رہی تھی۔

"ڈونٹ وری' اللہ بہتر کرے گا۔" سائرہ نے اسے دلاسا دیا' اسے معلوم تھا' عدینہ اپنے دل کی بات بہت کم شیئر کرتی ہے' اس لیے اس نے اصرار نہیں کیا۔

اس دن وہ ویک اینڈ پر گھر آئی تو پورے ماحول میں عجیب سی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ گھر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنا بڑا بیگ گھسیٹتی ہوئی صحن میں داخل ہوئی۔ ہر طرف جامن اور کیکر کے درختوں کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ مونا نے آج شاید مدرسے کی بچیوں سے صفائی نہیں کروائی تھی۔ سامنے برآمدے میں بڑی بڑی چقیں ڈلی ہوئی تھیں جو آپا صالحہ نے خصوصی طور پر ملتان سے منگوائی تھیں۔ وہ جیسے ہی برآمدے میں داخل ہوئی' سامنے بے بے کے ساتھ عبداللہ کی بوڑھی والدہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی اور بوکھلا کر سلام کیا۔

"کیسی ہے دھی رانی۔" عبداللہ کی والدہ نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار دیا۔ انہیں عدینہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔

"ٹھیک ہوں خالہ جی.... آپ کیسی ہیں۔" اس نے بھی سنجیدگی سے ان کا حال پوچھا اور وہیں جم کر بیٹھ گئی۔ شاید اس دشمن جان کی کوئی اطلاع مل جائے۔

"عبداللہ کب آئے گا واپس؟" بے بے نے عدینہ کے دل کی بات پوچھ ہی لی تھی۔

"آج تو ان کا گروپ چین جا رہا ہے' وہاں سے ہو کر پھر آئیں گے وہ لوگ۔" اس خبر نے عدینہ کو اداس کیا۔ پچھلے دس دن سے وہ سخت اذیت میں تھی' آپا کے ساتھ اس کی بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

"صالحہ کو ناراض کر کے گیا ہے وہ۔" بے بے نے شکوہ کیا تو اس کی والدہ ایکدم شرمندہ ہو گئیں۔

"کہہ رہا تھا آتے ہی آپ کے پیروں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگے گا۔" عبداللہ کی والدہ نے عدینہ کے ہاتھ میں امید کی ڈور تھمائی' وہ افسردہ سے انداز سے اٹھ کر اندر چلی آئی۔

"مشرقی لڑکیوں کی محبتوں کے رنگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اپنے معاشرے کی اخلاقی اقدار و روایات کی بھاری چادر اوڑھے وہ محبت جیسا مشکل کام مشکل سے سہی' لیکن کرتی ضرور ہیں۔" وہ بیڈ پر لیٹے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"آپ کو پتا ہے آپا عبداللہ بھائی سے کیوں خفا تھیں؟" مونا کھانے کی ٹرے لیے اندر چلی آئی' عدینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"انہوں نے عبداللہ بھائی سے کہا تھا کہ آپ سے فوراً شادی کر لیں۔" مونا کی بات پر وہ حیران ہوئی' لیکن چپ رہی۔

"جبکہ ان کا کہنا تھا کہ وہ آپ کو میڈیکل کی تعلیم

کے دوران ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے۔ بس آپا ناراض ہو گئیں۔" مونا نے وہ گتھی آج سلجھا ہی دی۔

"آپ کا مطالبہ بھی تو نامناسب تھا بھلا میں اسٹڈی کے ساتھ کیسے مینج کر سکتی تھی؟" عدینہ کو ایک دم ہی آپا پر غصہ آیا۔

"لیکن عبداللہ بھائی کو بھی تو صاف انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔" مونا نے آپا کی طرف داری کی۔

"اس نے انکار نہیں کیا ہو گا بلکہ کچھ ٹائم مانگا ہو گا۔" عدینہ عبداللہ کے مزاج کو سمجھنے کا ایسے ہی تو دعوا نہیں کرتی تھی۔

"ہاں انہوں نے کہا تھا تبلیغی دورے سے آ کر بات کریں گے۔" مونا پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

"اور آپا کی انا نے اس بات کی اجازت نہیں دی ہو گی' ڈکٹیٹر تو وہ ہمیشہ سے رہی ہیں' ناممکن کسی کے منہ سے اپنی بات سے انکار سن سکتی ہیں' اس لیے فوراً" رشتہ ہی ختم کر دیا ہو گا۔" اس کا لہجہ تلخ ہوا۔

"وہ ساری دنیا کو اپنی اکلوتی اولاد ہی سمجھ لیتی ہیں' جیسے مجھ پر تمام عمر حکمرانی کی' اسی طرح سب پر کرنا چاہتی ہیں۔" عدینہ نے ناراض سے تڑ سے کہا تو مونا جھنجھلا سی گئی۔

"میں نے اس لیے تو نہیں بتایا تھا کہ آپ کھانا ہی ادھورا چھوڑ دیں۔"

"پتا نہیں کیوں آج دل بہت عجیب سا ہے۔ نہ کچھ کھانے کو' نہ کرنے کو اور نہ ہی بولنے کو دل کر رہا ہے۔" عدینہ خاموشی سے لیٹ گئی۔

"عبداللہ بھائی کی وجہ سے پریشان ہو۔" مونا نے خاصا درست اندازہ لگایا تھا۔

"ہوں ..." عدینہ نے بھی اعتراف کرنے میں عافیت جانی۔

"پریشان مت ہو' اللہ بہتر کرے گا۔" مونا نے خلوص دل سے دلاسا دیا۔

"ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔" عدینہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے؟" مونا حیران ہوئی۔

"ہمیں جن سے محبت ہو ان سے رابطے کے لیے کسی جدید ٹیکنالوجی کی ضرورت نہیں ہوتی' محبت میں سچائی اور خلوص ہو تو دل کا دل سے رابطہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ ایک دل کی پریشانی' دوسرے دل تک نہ پہنچے تو سمجھو محبت میں کھوٹ نہ سہی' لیکن کچھ نہ کچھ کمی ضرور ہے۔" عدینہ آنکھیں بند کیے بڑے افسردہ سے انداز سے بول رہی تھی۔

اس وقت دھڑام سے دروازہ کھلا۔ حواس باختہ انداز سے بے بے اندر داخل ہوئیں۔ ان کا بوڑھا وجود کانپ رہا تھا۔ وہ ہراساں نگاہوں سے عدینہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے بے بسی انہونی کا احساس ہوا۔

"بے بے کیا ہوا...؟" عدینہ بوکھلا کر ان کے پاس پہنچی۔

"عبداللہ مر گیا عدینہ۔" بے بے نے اس کی سماعتوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا۔

"اس کا جہاز کہیں گر گیا۔" بے بے کی بات پر عدینہ اور مونا دونوں کو لگا کہ پورا آسمان ہی ان کے سر پر آن گرا ہے۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے بے بے کو دیکھتی رہ گئیں' جنہوں نے کمرے میں صور ہی تو پھونک دیا تھا۔ اس وقت ہر چیز روئی کے گالوں کی طرح فضاؤں میں گھومتی نظر آ رہی تھی۔ عدینہ کے لیے آج کا دن قیامت ہی کا تو دن تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

راشدہ رفعت

ہے زندگی کتنی حسین

یہ شہر کا مشہور اور منگا ترین اسپتال تھا۔ اس اسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ کے وی آئی پی روم میں اس وقت وہ مریض زیر علاج تھا جو دو روز قبل اسی اسپتال میں دوسرے مریضوں کا علاج کیا کرتا تھا۔

مریض کا نام ڈاکٹر مصطفیٰ حیات تھا' دو روز قبل وہ معمول کے مطابق اپنے مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے جب بے تحاشا گھبراہٹ کے ساتھ سینے میں بائیں جانب درد اٹھا۔ وہ ڈاکٹر تھے۔ سمجھ گئے دل دغا دینے کی تیاری پکڑ رہا ہے' انہوں نے ساتھی ڈاکٹرز کو اپنی کیفیت سے مطلع کیا تھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل انہیں آخری خیال اپنے بیوی بچوں کا آیا تھا اور جو نام انہوں نے آخری بار پکارا' وہ ان کی شریک حیات عفیفہ کا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شکر کا شکر ہے مما' پاپا کی حالت اب خطرے سے باہر ہے آپ پلیز گھر جا کر تھوڑا سا آرام کرلیں۔ اثابیہ نے ماں کے ہاتھ تھام کر انہیں لجاجت سے مخاطب

مکمل ناول

کیا۔

"جب تک مصطفیٰ کو پوری طرح ہوش نہیں آتا' میں کہیں نہیں جارہی۔" عفیفہ کا لہجہ نقاہت بھرا تھا لیکن انداز اٹل تھا۔

"پاپا کو ہوش آگیا ہے مما! اب صرف دوائیوں کے زیر اثر غنودگی میں ہیں۔" اس نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

"میں نے کہانا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم بھائیوں کے پاس گھر چلی جاؤ۔ دونوں پریشان ہورہے ہوں گے۔" عفیفہ نے بیٹی کو نرمی سے مخاطب کیا۔

"صغریٰ بی ہیں ان کے پاس۔ رات کو بھی وہیں رکی تھیں۔" اس نے ملازمہ کی بابت بتایا تھا۔ عفیفہ نے ہنکارا بھرا تھا۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں بے نام سی خاموشی چھاگئی تھی۔

"میں خالد انکل سے مل کر آتی ہوں۔ پاپا کی صحت کی کنڈیشن وہی صحیح طور پر بتاسکتے ہیں۔" وہ دھیرے سے کہتی ڈاکٹرز سے ملنے چلی گئی تھی۔ عفیفہ کی نگاہوں نے پھر سے مصطفیٰ کے چہرے کا طواف شروع کردیا تھا۔

اتنے میں ہی مصطفیٰ ذرا سا کسمسائے تھے۔ عفیفہ لپک کران کے پاس پہنچی تھیں۔ مصطفیٰ نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر پاس کھڑی بیوی کو دیکھا۔ پھر دوبارہ آنکھیں موندلیں۔

"پلیز مصطفیٰ! جلدی سے ٹھیک ہوجائیں۔" عفیفہ نے ان کے ہاتھ تھام کر جیسے التجا سی کی جبکہ آنکھوں سے آنسو گرنا شروع ہوگئے تھے۔

"میں اب ٹھیک ہوں عفی۔" وہ آنکھیں کھولتے ہوئے نقاہت زدہ لہجے میں بولے تھے۔ عفیفہ نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ برسوں ہوئے وہ اپنے لیے یہ طرز تخاطب بھول چکی تھیں۔

"انابیہ کہاں ہے؟" مصطفیٰ کو سب سے پہلے بیٹی کا ہی خیال آیا تھا۔ "یہیں اسپتال میں ہی ہے' ڈاکٹر خالد سے ملنے گئی ہے' بلکہ میں بلواتی ہوں خالد بھائی کو تاکہ اگر آپ کا چیک اپ کرلیں۔"

"میں بھی ڈاکٹر ہوں عفی۔ کہہ رہا ہوں نا' اب حالت سنبھلی ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔

"آپ نے ہم سب کی جان نکال لی تھی مصطفیٰ' عفیفہ سسک پڑی تھیں۔ مصطفیٰ خاموش نگاہوں سے بیوی کو تکتے رہے۔

"پاپا جان اور مرتضیٰ بھائی کو اطلاع کردی تھی نا؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ عفیفہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا گویا کہہ رہی ہوں کہ یہ حق آپ نے مجھے دیا ہی کب۔ مصطفیٰ ان کی خاموش زخمی نگاہوں کی تاب نہ لاپائے تھے۔

"میں تم سب کا مجرم ہوں عفی۔" "تم سے معافی مانگنے بنا میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ آئی ایم سوری عفی۔"

"پلیز مصطفیٰ! آگے ایک لفظ نہیں' میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ آپ میرے لیے کیا ہیں۔" انہوں نے بے ساختہ شوہر کے ہاتھ لبوں سے لگالیے تھے اتنے میں ہی انابیہ دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ اگر مصطفیٰ نے اب بھی آنکھیں موندرکھی ہوتیں تو یہ منظر قابل فہم تھا' وہ باپ کے لیے ماں کی دیوانگی کے بہت سے مناظر پچھلے دو دنوں سے متواتر دیکھ رہی تھی لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مصطفیٰ مکمل ہوش وحواس میں تھے اور محبت بھری نگاہوں سے بیوی کو تک رہے تھے۔

"پاپا۔" انابیہ لپک کران کے قریب آئی۔ وہ جیسے اب تک اس کی آمد سے لاعلم تھے' پکارے جانے پر یکدم چونکے۔ عفیفہ نے بھی خجل سا ہو کران کے ہاتھ چھوڑے تھے۔

"پاپا کی جان۔" مصطفیٰ نے بانہیں بیٹی کے لیے وا کردیں۔ وہ ان کے سینے سے جاچمٹی تھی۔

"آپ نے ہم سب کی جان نکال دی تھی پاپا۔" ان کی بیٹی روتے ہوئے ماں والا فقرہ ہی دوہرا رہی تھی۔ مصطفیٰ بے ساختہ مسکرائے تھے پھر بیٹی کی پیشانی چوم لی۔

"پاپا نے ساری زندگی ہر کسی کو پریشان ہی کیا ہے بیٹا۔ شاید قدرت نے ایک مہلت دے دی کہ جانے

سے پہلے اپنی غلطیوں کی تصحیح کرلوں۔" وہ دھیرے سے بولے پھر عفیفہ کی سمت دیکھا۔

"مرتضیٰ بھائی کو اطلاع کردو عفی۔ اگر پہلے اطلاع کردیتیں تو یہ کڑا وقت تمہیں اکیلے نہ گزارنا پڑتا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ تم میری حکم عدولی کرسکتی تھیں۔ عفیفہ کچھ نہ بولی تھیں بس ذرا سا مسکرا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

"سلمان اور سنعان گھر پر ہیں؟" وہ اب بیٹوں کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

"جی پاپا! بہت مشکل سے انہیں گھر روکا ہے" آنے کی ضد کررہے تھے۔" جواب انابیہ نے دیا تھا۔ تب ہی ڈاکٹر خالد اور ڈاکٹر اکبر اندر آئے تھے۔

"مریض بن کر بیڈ پر لیٹے آپ بالکل اچھے نہیں لگ رہے ڈاکٹر صاحب جلدی سے صحت پکڑیں اور بستر کی جان چھوڑیں۔" ڈاکٹر اکبر نے بشاشت سے انہیں مخاطب کیا۔ مصطفیٰ مسکرائے تھے۔ انابیہ دل کی تسلی کے لیے باپ کی صحت یابی کے متعلق دونوں ڈاکٹرز سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھنے لگی جبکہ عفیفہ

اپنا سیل فون ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ انہیں نہ صرف گھر پر موجود بیٹوں کو باپ کی خیریت بتانا تھی بلکہ کہیں اور بھی فون کرنا تھا۔ اس دعا کے ساتھ انہوں نے نمبر ملایا تھا کہ کہیں اتنے برسوں میں لینڈ لائن کنکشن منقطع نہ ہوگیا ہو۔ نمبر ان کے دل پر نقش تھا۔ تیئس برس بعد بھی انہیں نمبر یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور نہ دینا پڑا تھا۔ میکانکی طریقے سے ان کی انگلیوں نے نمبر پریس کیا تھا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ عفیفہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

تیسری بیل پر فون اٹھالیا گیا تھا۔ عفیفہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں سلام کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں غلطی پر تھا بابا جان! اس کا ادراک مجھے برسوں پہلے ہوگیا تھا' لیکن میری انا مجھے خود سے بھی یہ اعتراف کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ میں جھک نہ سکا اور آخرکار ٹوٹ گیا۔ میری غلطیوں کو معاف کرکے مجھے پھر سے اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔" وہ اونچا لمبا وجود ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں جتنے بھی نفوس موجود تھے' سب کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"غلطی صرف تجھ سے نہیں ہوئی مصطفیٰ! قصوروار تو میں بھی ہوں۔ یہ اونچی ناک اور بے پناہ انا تجھے مجھ سے ہی تو وراثت میں ملی ہے۔ بابا جان نے بیٹے کو خود سے چمٹا لیا تھا۔ آنسوؤں سے ان کی ریش تر ہوچکی تھی۔

"جب زندگی مجھ سے روٹھنے لگی تب اندازہ ہوا کہ میں نے تو اپنی زندگی کا قیمتی وقت فضول کی ہٹ دھرمی کی نذر کردیا۔ گزرا وقت لوٹ نہیں سکتا بابا لیکن میں اپنی زندگی کا باقی وقت آپ سب کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

"تو نے خود پر اور مجھ پر جو ظلم کیا سو کیا مصطفیٰ! لیکن میری بیٹی کو تو بغیر کسی قصور کے سب سے جدا کردیا۔"

قصور وار میں اور تم تھے، سزا اس کو بھگتنا پڑی۔" بابا جان نے اپنا دوسرا بازو وا کر کے عفیفہ کو اپنے ساتھ لگایا تھا۔ وہ جان سے پیارے تایا کا لمس پا کر بھر سے سسکنے لگی تھیں۔

"جو ہوا سو ہوا۔ سب کچھ بھول جائیں۔ آج خوشی کا دن ہے۔ یوں رونے دھونے اور منہ بسورنے کا نہیں۔ پلیز گرینڈ پا، زیادہ جذباتی ہو کر اپنی طبیعت تو خراب کریں گے سو کریں گے چاچو کے لیے بھی زیادہ ایموشنل ہونا ٹھیک نہیں۔" شہریار نے دادا کو مخاطب کیا۔ ساتھ بیٹھے مرتضیٰ نے بھی بیٹے کی بات کی تائید کی۔ مصطفیٰ نے محبت سے بھتیجے کو دیکھا جب انہوں نے حویلی اور حویلی والوں سے قطع تعلق کیا تو وہ فقط ساڑھے پانچ برس کا تھا اور اب وہ بھرپور خوبرو جوان تھا۔

"آپ دونوں نے گرینڈ پا سے بہت لاڈ اٹھوا لیے اب جگہ خالی کریں۔ گرینڈ پا نے اپنی پوتی اور پوتوں کو بھی پیار کرنا ہے۔" شہریار نے مسکرا کر عفیفہ اور مصطفیٰ کو مخاطب کیا۔

"آئیں اناہیہ صاحبہ اور سلمان، منعان آؤ نا یار۔ یوں دور کھڑے کیا شرما رہے ہو۔ اس نے اب تینوں کزنز کو مخاطب کیا۔"

"میں مل چکی ہوں دادا جان سے۔" اناہیہ ذرا جھجکی تھی۔

"او میرا بچہ۔ ابھی تو دادا کا تمہاری صورت دیکھ کر ہی دل نہیں بھرا ہے۔" حیات احمد نے پیار سے پوتی کو مخاطب کیا۔

"بالکل ہماری عفی کا عکس ہے نا بابا۔" مرتضیٰ باپ سے مخاطب تھے۔

"اور ہم دونوں پاپا میں ملتے ہیں۔" منعان جھٹ بولا تھا۔ ڈرائنگ روم میں سب کا زوردار قہقہہ گونجا۔ منعان بھی جھینپ کر ہنس پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹرز نے ابھی مصطفیٰ کو مسلسل بیڈ ریسٹ کی تاکید کی تھی لیکن مصطفیٰ حویلی جانے پر بضد تھے۔

"ڈاکٹرز کے مطابق ابھی تمہارے لیے سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے مصطفیٰ، مرتضیٰ نے بھائی کو سمجھانا چاہا۔

"میں خود ایک ڈاکٹر ہوں مرتضیٰ بھائی! مجھے علم ہے کہ کیا چیز میرے لیے ٹھیک ہے اور کیا نہیں۔ مصطفیٰ مسکرائے تھے۔

"کون کہتا ہے تم بدل گئے۔ تم تو ابھی بھی اتنے ہی ضدی ہو۔" مرتضیٰ نے چھوٹے بھائی کو مصنوعی خفگی سے دیکھا تھا۔

"آپ جانتے ہیں مرتضیٰ بھائی! میں اب بونس پر جی رہا ہوں۔ جانے کب مہلت ختم ہو جائے، میں چاہتا ہوں اس سے پہلے۔"

"اچھا بس اب زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ عفیفہ سے کہو، سامان باندھے۔ ہم آج شام کو ہی گاؤں کے لیے نکلتے ہیں۔" مرتضیٰ نے سرعت سے بھائی کی بات کاٹی تھی۔ مصطفیٰ نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☼ ☼ ☼

واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ شہریار ان کی کار ڈرائیو کر رہا تھا ان کا یہ بھتیجا کافی بذلہ سنج تھا اس نے سفر کے آغاز میں کچھ چٹکلے چھوڑے تھے لیکن مصطفیٰ اور عفیفہ دونوں ہی کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ شہریار ان کی ذہنی کیفیت سمجھ گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے چچا، چچی کو مخاطب نہ کیا تھا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے منعان سے ہلکی پھلکی گپ شپ لگاتا رہا۔ اناہیہ اور سلمان دوسری گاڑی میں دادا اور بابا کے ہمراہ تھے۔

"آپ نے اپنی میڈیسن تو رکھ لی نا مصطفیٰ۔" عفیفہ کو اچانک خیال آیا تو شوہر کو مخاطب کیا۔ انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ عفیفہ مطمئن ہو گئی تھی۔ مصطفیٰ نے ایک نگاہ شریک حیات پر ڈالی۔ ان کی محبت کرنے والی، پاک باز اور وفا شعار بیوی ان کے لیے قدرت کا عظیم تحفہ تھی۔ انہیں قدرت کی اس

عنایت کا نہ تو کوئی اور اک ہوا نہ ہی انہوں نے اس نعمت کی قدر کی۔ جس محبت کے نہ ملنے کا وہ تمام عمر غم مناتے رہے، دل کی سرزمین پر اس قربت کے نقش تو مدہم ہو کر جانے کب کے مٹ چکے تھے۔ اب وہاں صرف اور صرف عفیفہ کا راج تھا لیکن ان کی ضد اور انا نے انہیں کبھی خود سے بھی یہ اعتراف نہ کرنے دیا تھا۔

عفیفہ جو ہمیشہ ان کے لیے عفی تھی۔ ان کے مرحوم چچا چچی کی اکلوتی بیٹی اور ان کی بچپن کی دوست۔ عفیفہ کے والدین کا ایک ٹریفک ایکسیڈنٹ میں اس وقت انتقال ہوا تھا جب وہ محض تین برس کی تھی۔ ماں باپ سے اس کا تعارف تصویروں کے ذریعے ضرور تھا لیکن حقیقت میں تایا، تائی ہی اس کے لیے اس کے ماں باپ تھے۔

تایا کے بچوں میں سب سے بڑے مرتضیٰ تھے۔ وہ عفیفہ سے ویسا ہی پیار کرتے جیسے اپنی چھوٹی بہن ناعمہ سے لیکن مرتضیٰ بھائی کا چھوٹے بہن بھائیوں پر بڑے بھائیوں والا رعب بھی تھا۔

ناعمہ اور عفیفہ دونوں ہی ان سے ڈرتی تھیں اور پھر مصطفیٰ تھا جو عمر میں عفیفہ سے تین برس بڑا تھا۔ ناعمہ، عفیفہ سے ڈیڑھ برس چھوٹی تھی۔ عمروں کے اس تفاوت کے باوجود مصطفیٰ، عفیفہ اور ناعمہ تینوں گہری دوستی کے بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ تینوں ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے۔ مصطفیٰ کی شوخیاں اور شرارتیں اب بھی برقرار تھیں وہ اب بھی عفیفہ اور ناعمہ سے پہلے کی طرح چھیڑ چھاڑ کرتا تھا لیکن پہلے کے برعکس عفیفہ اسے دوبدو جواب نہ دیتی تھی بلکہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ ذہین، فطین مصطفیٰ کو علم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی بچپن کی دوست عفی اب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے اس لیے کتراتی ہے کہ کہیں مصطفیٰ ان آنکھوں میں اپنی محبت کا عکس نہ پالے۔ مشرقی لڑکی کی شرم و حیا نے اسے محبوب کو حال دل سنانے کی اجازت ہی نہ دی اور محبوب کسی اور کی زلف کا اسیر ہو گیا۔

مصطفیٰ میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھا جب اسے اپنے دوست کی بہن حوریہ سے طوفانی قسم کی محبت ہو گئی تھی۔ اس محبت کا ہمراز اس نے سب سے پہلے عفیفہ کو ہی بنایا تھا۔ عفیفہ دل کی ٹیسوں کو دل میں دبا کر کسی اور کے لیے مصطفیٰ کی بے تابیوں کے قصے سنتی رہتی۔ مصطفیٰ شہر میں میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ اس کا دوست عدنان ڈے اسکالر تھا مصطفیٰ جب ہاسٹل کے بدمزہ کھانے کھا کر اوب جاتا تو عدنان اسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جاتا۔ اس کی فیملی خاصی ماڈرن اور روشن خیال تھی۔ عدنان کی بہنیں بھی مصطفیٰ کے ساتھ بے تکلفانہ ماحول میں گپ شپ لگاتی تھیں۔ سیاست، تاریخ، ادب، موسیقی غرض کون سا ایسا موضوع گفتگو تھا جو ڈسکس نہ ہوتا۔ عدنان سے چھوٹی حوریہ جو خود خاصی انٹلکچوئل پرسنلٹی کی مالک تھی کب اور کیسے مصطفیٰ کے دل میں اترتی چلی گئی مصطفیٰ کو اندازہ تک نہ ہوا۔

اس محبت کا ادراک تب ہوا جب عدنان نے بتایا کہ گھر میں حوریہ کا ایک پرپوزل ڈسکس ہو رہا ہے۔ یہ بات سن کر مصطفیٰ کے دل کی دنیا زیروزبر ہو گئی تھی اس نے کسی مناسب موقع کے انتظار میں مزید دیر کرنا مناسب نہ جانا اور سیدھے بھاؤ حوریہ سے حال دل کہہ ڈالا۔ حوریہ تو شاید پہلے ہی اس خوبرو شخص کے آگے دل ہار چکی تھی اس نے مصطفیٰ کو یقین دلایا کہ محبت کے اس سفر میں وہ تنہا نہیں ہے مزید یہ کہ مصطفیٰ تسلی رکھے، حوریہ کے گھر والے اس کی مرضی کے بغیر اس کا رشتہ کہیں طے نہیں کر سکتے، مصطفیٰ یکسوئی سے اپنی تعلیم مکمل کرے تاکہ حوریہ کے گھر والوں کے آگے اس کے لیے دست سوال بلند کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

حوریہ کے اس اعتراف اور اظہار کے بعد مصطفیٰ گویا ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ محبت کی رہگزر پر وہ تنہا نہیں ہے، یہ احساس ہی کتنا خوش کن تھا۔ گھر میں عفیفہ کے سوا اس نے کسی سے بھی حال دل ڈسکس

نہ کیا تھا، ہاں حوریہ کے گھر والوں کو کسی حد تک اندازہ ہوگیا تھا کہ حوریہ اور مصطفیٰ ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ عدنان نے خود مصطفیٰ سے یہ معاملہ ڈسکس کیا تھا۔

"حوریہ ہم سب کی بہت لاڈلی ہے مصطفیٰ اور ہم سب تم دونوں کی چاہت سے بھی آگاہ ہیں۔ میں اس معاملے میں روایتی غیرت مند بھائی والا رول پلے نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے دوست ہو اور مجھے بہت عزیز بھی ہو۔ تمہاری شرافت و نجابت پر بھی مجھے کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں لیکن۔" عدنان نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی۔

"لیکن کیا عادی۔" مصطفیٰ نے بے چین ہو کر اس کی بات مکمل کروانا چاہی۔

"لیکن تمہارے اور ہمارے فیملی بیک گراؤنڈ میں بہت فرق ہے مصطفیٰ! تم لوگ خالص زمین دارانہ پس منظر رکھتے ہو۔ تمہاری ساری فیملی بھی گاؤں میں رہتی ہے۔ تم۔" "اگر حوریہ کو گاؤں میں رہائش رکھنے پر اعتراض ہوگا تو ہم شادی کے بعد شہر میں ہی رہ لیں گے۔" مصطفیٰ نے عدنان کی بات کاٹتے ہوئے اسے جھٹ یقین دہانی کروائی تھی۔ عدنان اس کی جلد بازی پر ہولے سے ہنس پڑا۔

"میرا کہنے کا یہ مقصد نہیں تھا مصطفیٰ۔ دراصل مجھے اور میری فیملی کو یہ خدشہ ستا رہا ہے کہ کہیں تمہاری فیملی اس بات کو پسند نہ کرے کیونکہ عموماً" گاؤں میں بسنے والے چاہے جتنا مرضی پڑھ لکھ جائیں بچوں کی شادیوں کے وقت ذات' برادری کو ترجیح دیتے ہیں اور ہماری تمہاری کاسٹ بالکل مختلف ہے مصطفیٰ۔" عدنان آخر دل کا خدشہ زبان پر لے ہی آیا تھا۔ مصطفیٰ جو یہ سوچ رہا تھا کہ جانے عدنان کیا کہنے والا ہے' عدنان کی بات سن کر اس کی کب سے رکی سانس بحال ہوئی۔ وہ کھل کر ہنس پڑا تھا۔

"تمہارا قصور نہیں ہے عادی۔ ہم زمینداروں کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ ہم بعض معاملوں میں بہت تنگ نظر ہوتے ہیں فلموں' ڈراموں اور حتیٰ کہ ملکی ادب میں بھی ہمیں بہت دقیانوسی سوچ کا حامل دکھایا جاتا ہے۔ لوگ یہ ہی دیکھ' پڑھ کر ہمارے بارے میں رائے قائم کر لیتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا عادی کہ یہ منظر کشی سو فیصد غلط ہے لیکن یہ سو فیصد صحیح بھی نہیں ہے' میں کم از کم اپنے خاندان کے حوالے سے مکمل گارنٹی دینے کو تیار ہوں میرے بابا تو ذات' برادری کو قطعی اہمیت نہیں دیتے۔

مرتضیٰ بھائی کی شادی بابا جان نے اپنے دوست کی بیٹی سے کی۔ علیم الدین صاحب ہمارے گاؤں کے اسکول سے ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے ہیں' انہوں نے ساری عمر گاؤں کے بچوں' بچیوں میں علم کی شمع روشن کی' وہ میرے بابا کے گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ قطعی مختلف برادری سے تعلق رکھنے کے باوجود بابا جان نے مرتضیٰ بھائی کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگا۔ لوگوں کو اس فیصلے پر تعجب بھی ہوا لیکن الحمدللہ بابا کا انتخاب بالکل درست ثابت ہوا مرتضیٰ بھائی اور میمونہ بھابھی بہت خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔" عدنان کی تسلی کے لیے مصطفیٰ نے تفصیلی جواب دیا تھا۔ اس وضاحت کے بعد عدنان بھی مطمئن ہو گیا تھا۔

"ایک بات اور عادی' اگر ذات' برادری یا اسی طرح کا کوئی اور ایشو اٹھتا تب بھی میں ہرگز اپنی چاہت سے دستبردار نہ ہوتا۔ میں نے حوریہ سے محبت کی ہے اور میں پورے عزت و احترام سے اسے اپنی زندگی کا حصہ بناؤں گا۔" مرتضیٰ نے دوست کو بھرپور یقین دلایا تھا۔

"مجھے تم پر یقین ہے مصطفیٰ۔ بس حوریہ ہم سب کو بہت پیاری ہے یوں سمجھو کہ گھر بھر کی جان ہے اس میں۔ اس لیے اوور کانشیئس ہو رہے تھے کہ کبھی اسے کوئی جذباتی دھچکا نہ پہنچے۔ میری بہن بہت حساس ہے مصطفیٰ۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔" عدنان ذرا جذباتی ہوا تھا۔

"کہنے کی ضرورت نہیں۔" مصطفیٰ دھیرے سے مسکرا کر بولا۔

اور پھر حوریہ کے گھر جانے اور اس سے ملنے میں جو تھوڑی بہت جھجک پیش آتی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا۔

عدنان کے شہرا سے عدنان کا دوست نہیں بلکہ مستقبل کے دل زدہ الاپرو لوگوں ملتا تھا۔ حوریہ کے ساتھ بیٹھ کر اس نے مستقبل کے کتنے سنہری سپنے بن لیے تھے اور عفیفہ کے مشورے پر اب وہ اپنی ماں جی کو محبت کے راز میں شریک کرنا چاہتا تھا' لیکن اس سے پہلے وہ ماں کو کچھ بتا پاتا اچانک حرکت قلب بند ہونے سے ماں جی راہی عدم سدھار گئیں۔ یہ مصطفیٰ کے لیے بہت بڑا جذباتی دھچکا تھا۔

وہ ماں کا لاڈلا ترین بچہ تھا۔ ان کی موت کو وہ کسی طور قبول نہ کر پا رہا تھا ایسے میں عفیفہ نے اس کی بہت ہمت بندھائی حالانکہ وہ خود ماں جیسی تائی کے بچھڑنے کا غم نہ بھلا پا رہی تھی لیکن گھر والوں کو سنبھالنے سمیٹنے کے لیے اسے اپنا غم پس پشت ڈالنا پڑا تھا۔ تایا جان' مرتضیٰ بھائی' ناعمہ اور سب سے بڑھ کر مصطفیٰ' اس نے سب کی دل جوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ مصطفیٰ ماں کی باتیں' ان کی یادیں دہرانے پر آتا تو گھنٹوں بولتا رہتا۔ ان دنوں اسے حوریہ کی یاد بھی نہ ستاتی تھی۔ حوریہ نے اس کی ماں کے انتقال پر اس سے بھرپور تعزیت کی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت سمجھتے ہوئے وہ اسے تسلی' دلاسا دینے کی حتی المقدور کوشش بھی کرتی' لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ مصطفیٰ کی ماں سے اس کی کوئی جذباتی وابستگی نہ تھی' وہ مصطفیٰ کو تسلی دیتی تو وہ ایک رسمی تسلی ہوتی۔ ان دنوں اسے صرف عفیفہ کے وجود سے ہی جذباتی ڈھارس ملتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ غم زدہ دل کو قرار آ ہی گیا۔ اب اس کی ہاؤس جاب شروع ہو چکی تھی۔ انتہائی ٹف شیڈول کے باوجود وہ حوریہ سے ملنے کا وقت نکال لیتا تھا۔ حوریہ کی خواہش تھی کہ اب مصطفیٰ کے گھر والے اس کا باقاعدہ رشتہ مانگ لیں۔ مصطفیٰ گاؤں گیا تو یہ سوچ کر گیا کہ بابا جان سے اس موضوع پر بات کرے گا۔ اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ بابا جان بھی کچھ سوچے بیٹھے ہیں اور شدت سے اس کی آمد کے منتظر ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد بابا جان نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔

"تمہاری بھابھی ناعمہ کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ پیش کر رہی ہیں' تمہاری کیا رائے ہے اس بارے میں۔؟"

"ثاقب اچھا لڑکا ہے بابا جان! لیکن اس طرح تو وٹہ سٹہ نہیں ہو جائے گا۔"

"میں بھی یہ ہی سوچ کر متذبذب تھا لیکن میمونہ بہت سلجھی ہوئی بچی ہے اتنے برس ہو گئے ہیں مرتضیٰ کی شادی کو' کبھی بھی بچیوں کے ساتھ میمونہ کی نند بھاوج والی چپقلش نہیں ہوئی' پھر ثاقب ہماری نظروں کے سامنے پلا بڑھا ہے' ہیرا بچہ ہے۔ اس کا باپ علیم الدین تو ہے ہی میرا جگری یار۔ جب میں نے مرتضیٰ کے لیے میمونہ کا ہاتھ مانگا تھا تو اس نے سوچنے کے لیے پانچ سیکنڈ کی بھی مہلت نہ لی تھی اور اب جب وہ لوگ اپنے بیٹے کے لیے ہماری بیٹی کے طلب گار ہوئے ہیں تو ہم چند بے بنیاد خدشات کا شکار ہو رہے ہیں۔ متذبذب ہیں۔ علیم الدین نے تو کہہ دیا ہے کہ ہمارا جو بھی جواب ہوگا' وہ اسے خوش دلی سے تسلیم کرے گا۔ میرا دل تو اس رشتے پر راضی ہے بیٹا۔ مرتضیٰ بھی راضی ہے بس مجھے تمہاری رائے کا انتظار ہے تاکہ ان لوگوں کو حتمی جواب دے دوں۔" بابا جان نے طویل تمہید باندھی تھی۔

"ٹھیک ہے بابا پھر آپ علیم انکل کو ہاں کر دیں۔ ثاقب واقعی ہر لحاظ سے ہماری ناعمہ کے قابل ہے۔ اللہ کا نام لے کر بات پکی کر دیں۔" مصطفیٰ نے بھی مثبت عندیہ دے دیا۔

"بس پھر ٹھیک ہے علیم الدین کو ہاں کہہ دیتا ہوں۔ وہ تو جلد شادی کے خواہش مند ہیں مگر انہیں چند ماہ انتظار کرنا ہوگا۔ تمہاری ہاؤس جاب مکمل ہو جائے تو تمہارے ولیمے والے دن ناعمہ کو رخصت کر دیں گے۔ الحمدللہ میں اپنی تینوں ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ جب سے تمہاری ماں کا اچانک بلاوا آیا ہے یار۔ میں اپنی زندگی کے حوالے سے بہت خائف رہنے لگا ہوں۔ دن رات اللہ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ

مرا۔ تم میں اپنی دونوں بچیوں کو اپنی زندگی میں ہی گھر بار کا کر دوں۔

بابا جان بول رہے تھے اور مصطفیٰ ناسمجھی سے انہیں تک رہا تھا۔ ان کی اس بات کا جو مفہوم نکلتا تھا' مصطفیٰ کا ذہن اسے تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔

"ویسے بھی یہ اللہ کا کتنا کرم ہے نا مصطفیٰ۔ ایک بیٹی رخصت ہو کر سسرال چلی جائے گی تو دوسری بیٹی رخصتی کے بعد بھی سدا ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ تمہاری بہشتی ماں کہتی تھی کہ عفیفہ۔"

"میں عفی سے شادی نہیں کر سکتا بابا جان۔" مصطفیٰ نے یک لخت ان کی بات کاٹی تھی۔ بابا جان یہ بات سننے کی ہرگز توقع نہ کر رہے تھے۔ چند لمحوں سے یہ وہ کچھ نہ بول سکے۔

"میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں بابا جان! اور آج میں آپ سے اسی موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا۔ میرے دوست مدثر کو تو آپ جانتے ہیں نا۔ ایک بار وہ میرے ساتھ گاؤں بھی آیا تھا۔ حوریہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں بابا جان! وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے بابا جان۔" مصطفیٰ نے لجاجت سے باپ کو مخاطب کیا۔

"یہ وہ لڑکی عفیفہ سے بھی اچھی ہے؟" انہوں نے سرد سے لہجے میں استفسار کیا۔

"عفیفہ کے ساتھ اس کا کیا موازنہ؟" مصطفیٰ قدرے جھنجلا کر بولا۔

"ہاں عفیفہ کے ساتھ کسی ایسی ویسی لڑکی کا موازنہ یا مقابلہ کیا بھی نہیں جا سکتا۔" انہوں نے ہنکارا بھر کر کہا تھا۔

"ایسی ویسی سے آپ کی کیا مراد ہے۔" مصطفیٰ چیخ کر بولا۔

"میں فضول کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا مصطفیٰ۔ تمہاری شادی عفیفہ سے ہی ہوگی۔ یہ تمہاری مرحومہ ماں کی بھی خواہش تھی اور میرا بھی یہی فیصلہ ہے۔" انہوں نے بیٹے کو بے لچک انداز میں مخاطب کیا۔

"میں نے عفی کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا بابا جان۔ وہ صرف میری کزن ہے اور بہت اچھی دوست۔"

"میں نے اور تمہاری مرحومہ ماں نے تمہارے بچپن میں ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ عفیفہ ہی تمہاری دلہن بنے گی لیکن اس بات کا اعلان کرنے کا وہ مناسب وقت نہ تھا۔ عفیفہ اسی گھر میں پل بڑھ کر بڑی ہوئی ہے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ تم دونوں کے بیچ کسی قسم کی جھجک پیدا ہو لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ ہم غلطی پر تھے۔ اگر تمہیں پہلے علم ہوتا کہ عفیفہ نے تمہاری شریک حیات بننا ہے تو تم کسی اور لڑکی کی جانب متوجہ ہی نہ ہوتے لیکن خیر جو ہوا سو ہوا۔ ابھی بھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔ جس وقتی پسندیدگی کو تم محبت کا نام دے رہے ہو' اس سے جلد از جلد پیچھا چھڑوا لو۔ تمہاری شادی عفیفہ سے ہی ہوگی یہ میرا اٹل فیصلہ ہے اور میں دوبارہ اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہوں گا۔"

کس بے نیازی سے بابا جان نے حکم صادر کیا تھا۔ مصطفیٰ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ وہ سیدھا عفیفہ کے پاس گیا تھا۔

"تم جانتی ہو عفی! بابا جان تمہارے اور میرے متعلق کیا سوچے بیٹھے ہیں۔ میں حوریہ کے سوا کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ حوریہ کے لیے میری چاہت اور دیوانگی سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ پلیز' تم بابا جان سے بات کرو۔ انہیں سمجھاؤ۔ تم تو ان کی بہت لاڈلی ہو' وہ تمہاری کوئی بات نہیں ٹالتے۔" مصطفیٰ کا لہجہ منت بھرا تھا۔ عفیفہ اسے خالی خالی نگاہوں سے تکے گئی تھی۔

"بتاؤ عفی! تم بات کرو گی نا بابا جان سے؟" وہ اس کا شانہ جھنجوڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"تم فکر مت کرو مصطفیٰ! میں بات کروں گی بابا جان سے۔" عفیفہ نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

مصطفیٰ مطمئن ہو کر ریسٹ گیا تھا۔ یہ اس کی بھول

تھی کہ عفیفہ حیات احمد کا فیصلہ بدلوانے کی قدرت رکھتی ہے، وہ اگلی بار گاؤں آیا تو سب سے پہلے عفیفہ سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تھا۔ کچھ پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔

"بابا جان میری بھی کوئی بات سننے پر تیار نہیں مصطفیٰ۔" عفیفہ نے اسے بے بسی سے آگاہ کیا تھا۔ وہ مرتضیٰ کے پاس جا پہنچا۔

"میں آپ کو بتا رہا ہوں بھائی! حوریہ کے سوا میں کسی سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر بابا جان اس سے شادی پر راضی نہیں تو آپ کو میرے لیے اسٹینڈ لینا ہوگا۔ حوریہ کے گھر آپ اور بھابھی میرا رشتہ لے کر جائیں گے، میں جلد از جلد اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" کسی انہونی کے خوف سے مصطفیٰ واقعی جلد از جلد حوریہ کو اپنے نکاح میں لانا چاہتا تھا۔ مرتضیٰ نے بھی پہلے تو اسے عفیفہ کے لیے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پھر آخر ہار مان لی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے یار! میں بابا جان کو سمجھانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔

حیات احمد سے یہ بات کرنے کی دیر تھی۔ وہ بری طرح آگ بگولہ ہو گئے۔

"بجائے اس کے کہ تم بھائی کو سمجھاؤ۔ اس کی وکالت کرنے میرے پاس پہنچ گئے۔ میں کسی ایسی لڑکی کو کیسے بہو بنا سکتا ہوں، جس نے ایک غیر لڑکے کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھائیں۔ اس کے عشق میں مبتلا ہو کر یہ باپ سے بات کرنے کی تمیز بھول گیا ہے۔ مجھے دھمکی دے رہا ہے کہ اگر اس لڑکی کے گھر ہم رشتہ لے کر نہیں گئے تو یہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔"

"اگر آپ حوریہ کے گھر میرا رشتہ لے کر نہیں گئے تو میں مرتضیٰ بھائی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" مصطفیٰ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخاطب ہوا۔

"اگر مرتضیٰ نے یہ کیا تو میں تمہارے ساتھ اسے بھی عاق کر دوں گا۔" انہوں نے سرد لہجے میں باور کروایا۔ مصطفیٰ نے مدد طلب نگاہوں سے بھائی کو دیکھا۔

"عفی بہت اچھی لڑکی ہے مصطفیٰ! بابا جان کی بات مان لو یار۔" مرتضیٰ کی بات سن کر مصطفیٰ کے چہرے پر استہزائیہ تاثرات ابھر آئے تھے۔ مرتضیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ سمجھانا چاہا تھا مگر مصطفیٰ نے سرد مہری سے بھائی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"شادی تو میں حوریہ سے ہی کروں گا، چاہے آپ لوگوں کی رضامندی شامل ہو یا نہ ہو۔"

مصطفیٰ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کرنے کی ٹھان چکا ہے۔ ناعمہ انتہائی متوحش ہو کر بھائی کے پاس آئی تھی۔

"یہ گھر میں کیا ہو رہا ہے بھائی۔ آپ نے عفی سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ آخر کیوں بھائی۔ عفی سے زیادہ آپ کو دنیا میں کوئی دوسرا نہیں چاہ سکتا۔ بابا کی بات مان لیں۔ عفی کے لیے ہاں کر دیں۔" ناعمہ نے لجاجت بھرے لہجے میں بھائی کو مخاطب کیا۔

"عفی مجھے چاہتی ہے؟" مصطفیٰ نے حیران ہو کر خود کلامی کی۔

"وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے بھائی! ایک آپ ہی اس کی چاہت سے واقف نہیں۔ آپ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کیسے جگمگانے لگتی ہیں۔ کاش آپ بھی ان آنکھوں میں جھانک کر تو دیکھتے۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ بابا جان عفی کے نام کی رٹ کیوں لگائے بیٹھے ہیں۔ اسے کوئی بھی اچھا لڑکا مل سکتا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ بابا حوریہ سے میری شادی کیوں نہیں ہونے دے رہے۔ انہیں بیٹے سے زیادہ بھتیجی عزیز ہے، وہ اسے اس کی چاہت دلوانے کے درپے ہیں چاہے اس کے لیے انہیں میرے خواب اجاڑنے پڑیں اور میں اتنا احمق کہ عفیفہ کو اپنا بہترین دوست جان کر اس سے اپنی ہر بات شیئر کرتا رہا اور بابا سے اپنی بات منوانے کے لیے بھی سب سے پہلے عفی سے ہی مدد مانگی۔ اس روئے زمین پر مجھ سے بڑا کھامڑ اور کون ہوگا بھلا۔" وہ استہزائیہ

انداز میں ناعمہ سے بولا۔

"ایسے تو مت کہیں بھائی!" مصطفیٰ کی اس درجہ بدگمانی پر ناعمہ کو رونا آنے لگا تھا۔

"جا کر کہہ دو عفیفہ سے 'میں کوئی کھلونا نہیں ہوں کہ اس کی خوشی کی خاطر اس کی زندگی میں شامل کر دیا جاؤں۔ بابا جان کو بھتیجی یا بیٹے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔" مصطفیٰ تن فن کرتا چلا گیا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ بابا جان کو منانے کے لیے اب اپنی توانائیاں خرچ نہیں کرے گا۔ اس بار شہر جائے گا تو تب تک پلٹ کر واپس نہ آئے گا جب تک بابا جان اس کی ضد کے آگے گھٹنے نہ ٹیک دیں۔

اس پلان پر عمل درآمد کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ اگلے روز جمعہ تھا وہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے حویلی سے باہر نکلا تو چولہوں پر دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی انوکھا منظر نہیں تھا۔ بابا جان باقاعدگی سے صدقہ خیرات کرتے تھے لیکن اس کے لیے عموماً جمعرات کا دن مخصوص ہوتا تھا پھر بھی اس نے کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد مسجد کے پیش امام نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا تھا کہ کچھ دیر بعد ملک حیات احمد کی حویلی میں ان کے بیٹے اور بھتیجی کا نکاح پڑھایا جائے گا اور اس خوشی کے موقع پر سب گاؤں والوں کے لیے دعوت عام ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے سرکردہ لوگ حویلی میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ مصطفیٰ اپنے کمرے میں بیٹھا بے بسی سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ باہر لوگوں کا جم غفیر اکٹھا تھا۔ مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مرتضیٰ بھائی اور میمونہ بھابھی بپھرے ہوئے مصطفیٰ کو رام کرنے کی کوشش میں مصروف تھے جب بابا جان کمرے میں داخل ہوئے۔

"اگر آج میری عزت پاؤں تلے روند کر تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو لیکن یاد رکھنا پھر جیتے جی میری شکل نہ دیکھ پاؤ گے۔ مجھ سے یا حویلی کے کسی بھی بندے سے تمہارا کوئی تعلق' واسطہ نہ ہوگا۔ میں اخبارات میں اعلان لاتعلقی کے اشتہار چھپوا دوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ کوئی معزز گھرانہ تمہیں اپنی بیٹی کا رشتہ کیسے دے سکے گا۔" وہ بیٹے کو چیلنج کر رہے تھے۔ مصطفیٰ نے لہو رنگ آنکھیں اٹھا کر باپ کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے' آپ نکاح خواں کو بلائیں۔ میں نکاح کے لیے تیار ہوں۔" بابا جان کے لبوں پر مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کی پلاننگ کامیاب ہوئی تھی۔

مصطفیٰ کو بات ماننے ہی بنی تھی چند لمحوں کے اندر اندر نکاح پڑھا دیا گیا تھا۔ لوگ دولہا سے گلے ملتے ہوئے اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ مصطفیٰ میکانکی انداز میں ساری کارروائی نمٹاتا رہا اور جب کھانا تناول کر کے مہمان رخصت ہو گئے تو مصطفیٰ نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور عفیفہ کے کمرے میں جا کر اسے کلائی سے گھسیٹتا ہوا صحن میں لے آیا۔

"کہاں لے کر جا رہے ہو تم عفیفہ کو۔" بابا جان اس کے انداز پر غضب ناک ہوئے۔

"میں اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں بابا جان۔ اس حویلی اور اس کے مکینوں سے اب میرا یا میری بیوی کا کوئی تعلق نہیں' آپ بیٹے کو عاق کرنے کی دھمکی دے رہے تھے نا۔ آپ نے بیٹے کے ساتھ ساتھ جان سے پیاری بھتیجی کو بھی ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے' آپ یہ سوچ کر خوش نہ ہوں کہ آپ بازی جیت چکے ہیں۔ آپ بہت بڑی مات سے دوچار ہوئے ہیں بابا جان۔" وہ زہر خند لہجے میں باپ سے مخاطب ہوا۔

"عفیفہ کہیں نہیں جائے گی۔" وہ دھاڑے تھے۔

"بھلے سے نہ جائے۔ مجھے طلاق کے تین حرف کہنے میں تین سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے۔" وہ پرسکون لہجے میں گویا ہوا۔

عفیفہ نے زخمی نگاہوں سے مصطفیٰ کو دیکھا۔ وہ تو اپنی محبت سے کب کی دستبردار ہو چکی تھی۔ اس نے ہمیشہ دل سے مصطفیٰ کی خوشیوں کی دعا کی تھی اور اب جب غیر متوقع طور پر وہ اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی تو کس سنگ دلی سے وہ اسے چھوڑنے کی بات کر رہا تھا۔ بے قصور ہوتے ہوئے باپ' بیٹے کی اناؤں کی جنگ میں اس کا وجود پس رہا تھا۔

مصطفیٰ کی دھمکی کے بعد حیات احمد کچھ نہ بول پائے تھے۔ مصطفیٰ فاتحانہ نگاہوں سے انہیں دیکھتا عفیفہ کو لے کر چلا گیا تھا۔ اس نے باپ کی بازی ان پر الٹ دی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ خود بڑی شکست سے دوچار ہوا تھا۔ وہ عفیفہ کو دیکھتا تو اس کا خون کھولنے لگتا۔

وہ اپنی ساری فرسٹریشن اس پر ہی نکالتا تھا۔ شہر میں فوری طور پر اس نے ایک دوست کا اپارٹمنٹ کرائے پر لیا تھا۔ اس کی شادی کی خبر چھپی نہ رہ پائی تھی۔ حوریہ کا ردعمل فطری تھا' وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی۔ نندتان نے بھی اسے سخت سست سنائی تھیں۔ اس کے ماضی میں کیے گئے بلند و بانگ دعووں کو یاد کرواتے ہوئے طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ مرد ہی کیا جو عہد وفا نہ کر سکے۔ جب مصطفیٰ اس کی بہن کے خوابوں کو تعبیر نہ دے سکتا تھا تو اس نے ان پلکوں پر خوش رنگ خواب سجائے ہی کیوں تھے۔

نندتان کی سب باتیں سچی تھیں۔ مصطفیٰ شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔ یہ غم و غصہ عفیفہ کی ذات پر ہی نکلتا تھا۔

ایک دن روتے ہوئے عفیفہ نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر حوریہ سے شادی کر لے۔ مصطفیٰ نے جواب میں اسے زوردار تھپڑ رسید کیا تھا۔ اس نے عفیفہ کو یہ نہ بتایا کہ وہ حوریہ سے زبردستی کی ایک ملاقات میں اسے یہ تجویز پیش کر کے اس کے نرم و نازک ہاتھوں سے خود بھی تھپڑ کھا چکا ہے۔ محبت میں ناکامی سے زیادہ شدید بے بسی کا احساس مصطفیٰ کو مشتعل کر دیتا تھا۔

مرتضیٰ بھائی اس کے دوستوں سے اس کی رہائش گاہ کا اتا پتا لے کر اس سے ملنے پہنچے تھے۔ وہ چھوٹے بھائی کو پیار محبت سے منانا چاہتے تھے۔ مصطفیٰ اس وقت گھر پر نہ تھا اور اتنے دنوں بعد کسی اپنے کو دیکھ کر عفیفہ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ مصطفیٰ گھر پہنچا تو وہ مرتضیٰ بھائی کے سامنے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"میں کہہ کر آیا تھا کہ حویلی اور اس کے مکینوں سے میرا یا میری بیوی کا کوئی تعلق نہیں پھر آپ کیوں آئے ہیں یہاں؟" سخت اجنبی لہجے میں وہ بھائی سے مخاطب تھا۔

"تم غم و غصہ کرنے میں حق بجانب ہو مصطفیٰ! لیکن اس سب میں عفی کا کیا قصور ہے بھلا۔" عفیفہ کا ہچکیوں سے لرزتا وجود دیکھ کر مرتضیٰ سخت مضطرب ہو رہے تھے۔

"میں نے بھی تو بے قصور سزا بھگتی ہے اور بابا جان کی بھتیجی کو میرے ساتھ گزارے گئے ہر پل کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ جا کر بتا دیں انہیں کہ میں نے ان کی لاڈلی کو کس حال میں رکھا ہے اور اگر آئندہ مجھے پتا چلا کہ حویلی والوں میں سے کسی نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے تو پھر میں واقعی اسے فارغ کرنے میں دو سیکنڈ بھی نہ لگاؤں گا۔" وہ سفاکی سے مخاطب ہوا۔

"اللہ کا واسطہ ہے مرتضیٰ بھائی! آئندہ مصطفیٰ کی مرضی کے بغیر مجھ سے ملنے نہ آیئے گا' اب یہ میری زندگی کا سوال نہیں۔ میری زندگی کے ساتھ ایک اور زندگی جڑ چکی ہے۔"

عفیفہ نے نگاہیں جھکا کر بھرائی ہوئی آواز میں مرتضیٰ کو مخاطب کیا۔ مرتضیٰ اٹھ گئے تھے۔ عفیفہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور مصطفیٰ کے چہرے پر ایک شاکی نگاہ ڈال کر پلٹ گئے۔

انابیہ کی پیدائش کے بعد مصطفیٰ کے رویے میں اتنی تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اب وہ حلق پھاڑ کر عفیفہ پر نہ چلاتا تھا۔ اس نے عفیفہ کے ساتھ سرد مہری اور لاتعلقی بھرا رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اولاد سے محبت فطری ہے سو وہ خود کو انابیہ سے محبت کرنے سے نہ روک پایا تھا۔ وہ اس کی لاڈلی بیٹی تھی۔

انابیہ سے دو برس چھوٹا سلمان تھا اور سلمان سے تین برس چھوٹا سمعان۔

گھر میں ہر طرح کی مالی آسودگی تھی لیکن بچے ایک غیر فطری ماحول میں پرورش پا رہے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو انتہائی ضرورت کے وقت

مخاطب کرتے تھے۔ سلمان اور سنعان کم عمر تھے اور لڑکے ہونے کی وجہ سے قدرے لاپرواہ بھی لیکن انابیہ ماں اور باپ کے بیچ فاصلوں کو شدت سے محسوس کرتی تھی' ان کا گھرانہ عجیب طرح کا گھرانہ تھا۔ اس کی سہیلیوں کے برعکس ان کے کوئی دودھیالی یا ننھیالی رشتہ دار موجود نہ تھے۔ وہ ذہن میں کلبلاتے سوال ماں سے پوچھتی تو ماں کے چہرے پر بڑی بے بس سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ ماں کی پتلیوں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر انابیہ چپ رہ جاتی اور باپ تو یہ سوال سن کر ہی ٹال جاتا تھا۔ بچی کا دھیان ہٹانے کے لیے اس کے پاس بہتیری ترکیبیں تھیں' وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی ذہین بیٹی باپ کو مشکل سے دوچار دیکھ کر خود ہی اپنے سوال سے دستبردار ہو جاتی ہے۔

ماں اور باپ کا کوئی آگا' پیچھا نہ ہونے سے انابیہ کے ذہن نے ایک فرضی نتیجہ اخذ کرلیا تھا۔ دونوں نے گھر والوں کی مرضی کے بغیر لومیرج کی ہوگی' لیکن اگر ایسا ہی تھا تو وہ "لو" کہاں اڑنچھو ہوگیا' انابیہ کا ذہن اس نکتے پر آکر الجھ جاتا تھا۔ پھر اتفاق سے عفیفہ کی ڈائری تک اس کی رسائی ہوگئی۔ ذہن میں کلبلاتے سارے سوالوں کا جواب مل گیا تھا' اس روز اسے اپنی ماں پر جی بھر کر ترس آیا تھا۔ اس کی ماں نے ساری عمر اس کے باپ سے محبت کے سوا کچھ نہ کیا تھا۔

اس نے پورے خلوص سے مصطفیٰ اور اس کی من چاہی لڑکی کے ملن کی بھی کوشش کی تھی' لیکن مصطفیٰ نے اس کے ہر عمل کو بدگمانی کی عینک چڑھا کر دیکھا تھا۔ اک عمر ہوگئی تھی اسے مصطفیٰ کی لاتعلقی سہتے سہتے۔ زبان پر اف کا ایک لفظ لائے بغیر وہ مردوں سے بدتر زندگی جیتی چلی آرہی تھی۔ اس کے اپنے اس سے چھوٹ چکے تھے اور جو سب سے بڑھ کر "اپنا" تھا' وہ اجنبیت اور لاتعلقی کا لبادہ اوڑھے رکھتا تھا۔ انابیہ نے ماں کی ڈائری چپکے سے باپ کی رائٹنگ ٹیبل پر دھری کتابوں میں رکھ دی تھی۔ اگر اس کے باپ کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز موجود تھی تو یہ سب پڑھ کر اس کے دل نے پسیجنا ہی تھا۔

انابیہ کا انتظار انتظار ہی رہا۔ مصطفیٰ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی' وہ باپ کے تصور ہی پر اس سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی۔ مصطفیٰ بیٹی کی خفگی سے لاعلم نہیں تھا۔ اس کی بھولی بیٹی یہ سمجھ رہی تھی کہ ڈائری کے چند ورق پڑھنے سے ان کی زندگی کے تمام مسئلے حل ہو جائیں گے' وہ اسے کیسے بتاتا کہ وہ اس کی ماں کی زندگی کے ہر ورق سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔ بدگمانی کی دھند تو چند دن میں ہی چھٹ گئی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ جو ہوا اس میں عفیفہ کا کوئی قصور نہیں' لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر اس کا احساس شکست تازہ ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ناروا سلوک اپنانے پر ضمیر ملامت کرتا تو وہ ضمیر کو شٹ اپ کال کرنے کے ساتھ عفیفہ سے اپنا رویہ مزید کھردرا کرلیتا۔

دل و دماغ کی یہ جنگ برسوں سے اس کے اندر جاری تھی۔ اس کا غم و غصہ اب ندامت اور شرمندگی میں ڈھل چکا تھا ہاں لیکن اب بھی اسے عفیفہ پر شدید ترین غصہ آتا تھا۔ وہ اس کی زیادتیوں کو چپ چاپ برداشت کیوں کر رہی تھی۔ اس کی مسلسل چپ' اطاعت اور فرمانبرداری نے مصطفیٰ کی زندگی کو بھی بے کیف بنا رکھا تھا۔ وہ اب اس کے ساتھ نارمل زندگی جینا چاہتا تھا' مگر انا آڑے آجاتی تھی پھر اسے مزید پچھتاووں میں مبتلا کرنے کے لیے سرراہ حوریہ ٹکرا گئی' برسوں پہلے ان لوگوں کی فیملی امریکا شفٹ ہوگئی تھی۔ مصطفیٰ کا ان سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ اتنے سالوں بعد وہ حوریہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا' وہ اب بھی اتنی ہی خوب صورت اور نرم و نازک تھی۔ حیران تو وہ بھی ہوئی تھی مصطفیٰ کو دیکھ کر۔

"یہ تم نے کیا حال بنا لیا ہے مصطفیٰ! کتنے بوڑھے لگنے لگے ہو۔" اس نے بہت اپنائیت اور بے تکلفی سے استفسار کیا تھا۔

"تم سے بچھڑنے کے آفٹر ایفکٹس ہیں یہ۔" وہ کہے بنا نہ رہ پایا تھا۔ حوریہ جواباً کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"مذاق کی عادت نہیں تھی تمہاری۔"

"یہ مذاق نہیں ہے حوریہ۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں گویا ہوا حوریہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"تمہاری بیوی؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"یوں سمجھو۔ ایک چھت تلے دو اجنبی رہتے ہیں۔ میں اسے کبھی وہ حیثیت اور مقام نہ دے سکا جو تمہیں دینا چاہتا تھا۔" وہ شاید حوریہ کو یہ باور کروانا چاہ رہا تھا کہ ماضی میں وہ اس کے ساتھ کتنا مخلص تھا اور جس بے وفائی کا طعنہ مار کر حوریہ اس سے قطع تعلق کر گئی تھی وہ الزام سچا نہ تھا۔

"دیکھو مصطفیٰ! تمہارا اپنی بیوی کے ساتھ جو بھی ایشو ہے بیچ میں مجھے مت گھسیٹو۔" اس نے مصطفیٰ کو سنجیدگی سے ٹوکا تھا۔

"میں نے تمہیں صرف حقیقت بتائی ہے۔" وہ بے بنا رو دیا۔

"میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ہم دونوں کے بیچ کوئی ہیر رانجھا والی محبت نہیں تھی مصطفیٰ۔ وقتی اٹریکشن تھی، پسندیدگی تھی اور شاید کسی حد تک انڈر اسٹینڈنگ بھی ہم دونوں کی بنا کسی رکاوٹ کے شادی ہو جاتی تو شاید ہم آج بہت کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہوتے اور وقت گزرنے کے ساتھ ہماری محبت مزید مستحکم ہو جاتی، لیکن پھر وہی بات مصطفیٰ کہ ہماری محبت کوئی آفاقی یا لازوال ٹائپ کی محبت نہ تھی۔ یہ محبت وصل کی محتاج تھی۔ جب ایک دوسرے کو نہ مل سکے اور ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل ہوئے تو آہستہ آہستہ محبت کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا۔ ہاں میں مانتی ہوں کہ شروع شروع میں تم سے بچھڑ کر میں بہت ڈپریس رہتی تھی مجھے لگتا تھا کہ یہ اینڈ آف لائف ہے، لیکن پھر فراز میری زندگی میں آ گیا۔ اس نے نہ صرف مجھ سے محبت کی بلکہ پورے عزت و احترام سے مجھے اپنی زندگی کا حصہ بنایا۔ یقین کرو میں اس کے ساتھ اتنی خوش گوار زندگی بسر کر رہی ہوں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر مجھے کبھی تمہارا خیال آتا بھی ہے تو ذہن میں پہلی سوچ یہی پیدا ہوتی ہے کہ اللہ نے تمہیں میرے مقدر کا حصہ اسی لیے نہ بنایا تھا کہ مجھے فراز کا ساتھ نصیب ہونا تھا اور پھر میں بے ساختہ اللہ کا شکر بجا لاتی ہوں۔ اس کی مصلحتیں سمجھنا ہم انسانوں کے بس کی بات نہیں۔"

حوریہ اس کے وجود کو پچھتاووں کی بھٹی میں جھونک کر چلتی بنی تھی۔ اللہ کی جس مصلحت کو حوریہ اپنی خوش نصیبی گردان رہی تھی وہ نعم والد اسے کیوں نصیب نہ ہو سکا۔ اللہ نے اسے بھی ایک نیک، باحیا، پاک باز اور خوب صورت بیوی کا ساتھ دیا تھا۔ خوب صورت اور سلجھے ہوئے بچے جن کی تربیت کا کریڈٹ یقیناً ان کی ماں کو جاتا تھا۔ مالی آسودگی، رزق کی فراوانی، معاشرے میں قابل عزت مقام، شکر کرنے کا کوئی ایک پہلو تھا؟ پھر اتنے برسوں سے اپنے خونی رشتہ داروں سے خود کو قطع تعلق کیا ہوا تھا۔ بیوی کو بھی اس کے اپنوں سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ بابا جان نے زور زبردستی سے اس کی زندگی کا فیصلہ کر ہی دیا تھا تو ایک حد تک ناراضی دکھا کر اسے اپنی ہٹ دھری کا خاتمہ کر دینا چاہیے تھا۔ ناعمہ کی شادی کے موقع پر وہ بڑے ہونے کے باوجود جھک گئے تھے اس کی منت کی تھی کہ وہ خود ساختہ ناراضی ختم کرکے بہن کی ڈولی کو کندھا دینے آ جائے۔ اس نے بنا جواب دیے فون کاٹ دیا تھا۔ انہوں نے دوبارہ کال کی۔ اس بار فون عفیفہ نے اٹھایا تھا۔

"اگر تمہیں شادی میں جانے کا زیادہ شوق ہو رہا ہے تو اپنے بابا جان سے ہو کہ تمہیں آکر لے جائیں، لیکن پھر میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔" وہ اتنا تیز بولا تھا کہ فون کے دوسری طرف اس کی آواز سن لی گئی اور پھر دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا۔ اس روز کے بعد حویلی والوں کی طرف سے کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔ وہ اتنا کٹھور کہ پلٹ کر کبھی ماں باپ، بھائی کی خبر نہ لی۔ لیکن اس کے اپنوں کو اطلاع ملنے کی دیر تھی۔ وہ ایک کال پر دوڑے آئے تھے۔ وہ ماضی کی غلطیوں کی معافی مانگنا چاہ رہا تھا

اور وہ لوگ اسے ماضی دوہرانے کی اجازت ہی نہ دے رہے تھے۔ اب واپسی کا سفر تھا اور گاڑی کی آرام دہ سیٹ سے پشت لگائے وہ مسلسل ماضی میں ہی گم تھا۔ جب حویلی کے پھاٹک کے آگے گاڑی جا رکی تو جیسے ماضی کے خیالات کی رو بھی منقطع ہوگئی' تکلیف دہ ماضی بیت چکا تھا۔ خوش گوار حال منتظر تھا۔

☼ ☼ ☼

حویلی آنے سے پہلے اناbیہ' سلمان اور سنعان جو تھوڑی بہت جھجک محسوس کر رہے تھے اب اس کا یکسر خاتمہ ہو چکا تھا۔ دادا' نایا' نانی اور پھوپھو ان کے واری صدقے جا رہے تھے۔ انہیں چمٹا چمٹا کر پیار کر رہے تھے' لیکن دل کی پیاس بجھنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

"چلو بھئی کزن! تمہاری تو بچپن کی خواہش پوری ہوگئی اللہ تعالیٰ نے تمہیں بیٹھے بٹھائے' تمہاری ہم عمر بہن عطا کر دی۔ اب مجھے اپنی سہیلی کے رتبے سے ہٹا کر اس سے پکی دوستی گانٹھ لو۔" شہریار سے چھوٹے شہرام نے علیزہ کو مخاطب کیا۔

شہریار اور شہرام مرتضیٰ کے بیٹے تھے جبکہ ناعمہ کے تین بچے تھے' سب سے بڑی علیزہ پھر موحد اور محب۔ علیزہ ہمیشہ خاندان میں کسی لڑکی کے نہ ہونے کی وجہ سے اللہ سے شکوے کے موڈ میں رہتی تھی اور اس بات پر ناعمہ سے ڈانٹ بھی کھاتی تھی۔ شہرام سے اس کی بہت دوستی تھی اور شہرام نے رضاکارانہ طور پر اسے بطور سہیلی اپنی خدمات پیش کر رکھی تھیں۔ اب بھی وہ ہنستے ہوئے اسی حوالے سے علیزہ کو چھیڑ رہا تھا۔

"بالکل بالکل اب مجھے چھ فٹ کے "سہیلے" نما سہیلی کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے میری حقیقی ہم جولی مل گئی ہے۔" علیزہ مزے سے بولی تھی۔

"پھوپھو! آپ کی لاڈلی سے زیادہ طوطا چشم بندہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" اس نے ناعمہ سے شکوہ کیا۔

"نہیں' بندہ نہیں بندی ہوں جناب اللہ کی نیک بندی۔"

علیزہ ترنت بولی تھی۔ اناbیہ مسکراتے ہوئے ان کی نوک جھونک سن رہی تھی۔ زندگی کے ان رنگوں سے اس کی قطعی آشنائی نہ تھی' لیکن یہ سب اسے بہت دلچسپ اور اچھوتا لگ رہا تھا زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے ماں باپ کے چہروں پر اتنا سکون اور طمانیت محسوس کی تھی۔ ناعمہ پھوپھو اپنا گھر بار چھوڑ کر دو دن سے حویلی میں ہی مقیم تھیں۔ علیزہ کی اناbیہ سے واقعی بہت اچھی دوستی ہو چکی تھی۔ سلمان اور سنعان بھی ہر وقت موحد' محب کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہتے' شفیق اور پرخلوص سی میمونہ تائی بھی اناbیہ کو بہت اچھی لگی تھیں۔ اتنے برسوں بعد بھی انہیں کھانے پینے میں مصطفیٰ اور عفیفہ کی پسند ناپسند بخوبی یاد تھی۔ مصطفیٰ کے لیے پرہیزی کھانا بنانا مجبوری تھی' لیکن وہ عفیفہ اور بچوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھیں پھر بھی ان کا دل مطمئن نہ ہوتا۔

"کوفتوں کے لیے اتنا بہترین قیمہ منگوایا تھا میں نے اور تم نے منع کر دیا۔" میمونہ کو بھرے دستر خوان پر کوفتوں کی کمی کھلی تھی۔

"اس ہرے مسالے کے چکن' گاجر میٹھی اور فروٹ ٹرائفل کے بعد کوفتوں کی گنجائش کہاں بچتی تھی بھابھی!" عفیفہ مسکرائی تھیں۔

"دراصل چچی جان! آپ شادی کے بعد پہلی بار میکے آئی ہیں نا اسی لیے امی اتنا اہتمام کر رہی ہیں۔" شہرام نے مسکرا کر عفیفہ کو مخاطب کیا۔ اناbیہ کو اتنی زور سے ہنسی آئی تھی کہ اسے اچھو لگ گیا۔

"شہرام! یار کھانے کے ٹائم تو پھلجھڑیاں چھوڑنے سے گریز کیا کرو۔" شہریار نے پانی کا گلاس بھر کر اناbیہ کو دیا' ساتھ ہی شہرام کو ٹوکا تھا۔ وہ سوری بھائی کہہ کر خاموش ہو گیا۔ شہرام' اناbیہ کے عین سامنے بیٹھا تھا۔ اناbیہ نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں اب بھی شرارت مچل رہی تھی اور یقیناً کوئی اور ہنستا مسکراتا جملہ اس کے ہونٹوں پر بھی مچل

رہا ہوگا' لیکن وہ خلاف توقع خاموش ہی رہا۔

تایا کے بچوں میں اتابیہ کا پہلا تعارف شہریار سے ہوا تھا۔ مصطفیٰ کی طبیعت خرابی کا سن کر باپ اور دادا کے ساتھ وہ بھی شہر پہنچا تھا۔ اتابیہ کے دل میں ہمیشہ سے ہی یہ ارمان رہا تھا کہ کاش اس کا کوئی بڑا بھائی ہوتا۔ اس نے شہریار کو فوراً" بڑے بھائی کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ وہ بھی اس کا چھوٹی بہنوں کی طرح ہی خیال رکھ رہا تھا۔

حویلی پہنچ کر اندازہ ہوا کہ جس قدر شہریار بھائی کا چھوٹا بھائی تو ان سے بھی زیادہ جھنوڑ' چلبلا اور شوخ مزاج ہے۔ شہریار بھائی حویلی میں تایا جان کے قائم مقام کی حیثیت رکھتے تھے۔ زمینوں کا سارا انتظام و انصرام انہوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شہرام بڑے بھائی کا خاصا لحاظ اور ادب کرتا تھا۔ بلکہ شہرام ہی کیا شہریار کے سامنے تو علیزہ بھی بہت ادب اور تمیز سے رہتی تھی۔ مزے سے بھرپور چند دن گاؤں میں گزار کر وہ واپس آگئے تھے' لیکن اس بار دادا جان بھی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ اتابیہ کی فرمائش تھی جس کو حیات احمد رد نہ کر سکے۔ شہرام نے البتہ خوب شور مچایا۔

"یہ فاؤل ہے اتابیہ بی بی! حویلی کی سب چیزوں پر آپ نے پکا قبضہ جما لیا۔ میری اکلوتی سہیلی مجھ سے چھین لی' اب یہ ہروقت آپ سے رازونیاز میں مشغول رہتی ہے۔ میرے بڑے بھائی' جو ہروقت میرے کان کھینچنے کے درپے ہوتے ہیں۔ آپ کے اصلی وڈے بھائی بن گئے ہیں۔ امی' ابو وہ چوبیس گھنٹے آپ کے واری صدقے جاتے رہتے ہیں۔ باقی بچ گئے تھے دادا' انہیں آپ ساتھ لیے جا رہی ہیں۔" شہرام خاصی سنجیدگی سے اس سے لڑنے آیا تھا۔ اتابیہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ فوری طور پر شہرام کے شکووں کا اسے کوئی جواب نہ سوجھا تھا۔

"شہرام کے بچے' پریشان کر کے رکھ دیا نا میری بہن کو۔" علیزہ نے اتابیہ کی بوکھلائی شکل دیکھ کر شہرام کو ٹوکا۔

"ممو جی' یعنی کہ یہاں بھی بہناپا گانٹھ لیا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ ابھی آپ دونوں صرف پکی سہیلیاں ہی بنی ہیں۔ میرے خیال میں اس حویلی میں صرف میں ہی ہوں جو ابھی تک آپ کی نظر عنایت سے بچا ہوا ہوں' لیکن میں آپ کو بتا دوں' آپ کو بہن بنانے کا میرا قطعاً" کوئی ارادہ نہیں۔" وہ اس پر نگاہیں جماتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے بولا تھا' لیکن آنکھوں میں شرارت موجود تھی۔

"پندرہ بیس دن تک دادا جان واپس آجائیں گے۔"

اتابیہ بوکھلا کر فقط اتنا ہی کہہ پائی تھی۔ شہرام کو ہنسی روکنا دوبھر ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک عمر اپنوں سے دور رہنے کے بعد اب الگ ہونے کا کسی کا دل ہی نہ کرتا۔ مصطفیٰ پندرہ بیس دن بعد بچوں کو لے کر گاؤں چلے جاتے۔ وہاں سے بھی کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا۔ آج کل ناعمہ پھوپھو اور ثاقب پھوپھا "مصطفیٰ ہاؤس" آئے ہوئے تھے۔

ثاقب پھوپھا کا ارادہ تھا کہ گاؤں کی تھوڑی سی زمینیں فروخت کر کے شہر میں مناسب قیمت کا کوئی گھر خرید لیں۔ بچوں کی تعلیم کی وجہ سے وہ لوگ شہر شفٹ ہونا چاہ رہے تھے۔ علیزہ نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک کیا تھا پھر قریبی قصبے کے ہائر سیکنڈری اسکول سے ایف اے' لیکن اسے بی اے پرائیویٹ ہی کرنا پڑا تھا کہ ناعمہ پھوپھو کا اسے ہاسٹل بھیجنے کو دل نہ مانتا تھا۔ اب وہ ماسٹرز کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ صمد اور موحد کی بہتر اسکولنگ کا بھی مسئلہ درپیش تھا۔ انہوں نے اس مسئلے کا یہی حل نکالا کہ گاؤں چھوڑ کر عارضی طور پر شہر سکونت اختیار کر لی جائے۔

مصطفیٰ اور عفیفہ بضد تھے کہ ناعمہ کی فیملی ان ہی کے ساتھ رہائش اختیار کرلے' لیکن ثاقب وضع دار شخص تھے انہوں نے سبھاؤ سے معذرت کرلی تھی' لیکن یہ ضرور کہا تھا کہ مصطفیٰ اپنے علاقے میں ہی ان کے لیے کوئی مناسب سا گھر دیکھ لیں۔ اتابیہ'

پھوپھو کی فیملی کے اپنے پاس آنے پر بہت پرجوش اور خوش ہوئی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں اس کی اور علیزہ کی ایسی دوستی ہوگئی تھی جیسے وہ بچپن سے ساتھ پل، بڑھ کر جوان ہوئی ہیں۔

☆ ☆ ☆

بابا جان نے مصطفیٰ کو کسی اہم بات پر مشورے کی غرض سے بلوایا تھا۔ عفیفہ اور بچوں کو لے کر وہ حویلی پہنچ گئے۔ خلاف توقع علیزہ ان لوگوں کی آمد کی خبر پا کر بھی ملنے نہ پہنچی تھی۔ اس نے ناعمہ پھوپھو سے استفسار کیا تو انہوں نے اس کی طبیعت خرابی کا بتایا تھا۔ انابیہ فوراً اس سے ملنے جا پہنچی۔ پھوپھو کا گھر بھی قریب ہی تھا۔

"کیا ہوا ہے علیزہ! چہرہ اتنا کیوں اترا ہوا ہے؟ کیا طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

انابیہ اسے دیکھ کر صحیح معنوں میں پریشان ہوئی تھی۔ ابھی بیس دن پہلے تو وہ ناعمہ پھوپھو اور ثاقب پھوپھا کے ہمراہ شہر آئی تھی جب بالکل ٹھیک ٹھاک تھی اور اب اس کی شکل دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے عرصے سے بیمار ہو۔ رنگت زرد ہو رہی تھی آنکھوں کے گرد حلقے بھی نمایاں تھے۔

"بس یار! بخار ہوگیا تھا۔" علیزہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"بخار میں تو کسی کی اتنی ہی شکل نہیں نکلتی۔" انابیہ کی تشویش کم نہ ہوئی۔

"میرا یہی حال ہو جاتا ہے یار! یا تو کئی کئی سال معمولی سا فلو تک نہیں ہوتا اور ایک بار بیمار پڑ جاؤں تو تندرست ہونے میں عرصہ لگ جاتا ہے۔ دوائیاں کھا کھا کر منہ کا ذائقہ خراب ہے بھوک اڑ گئی ہے۔ راتوں کو نیند نہیں آتی طبیعت بے چین رہتی ہے۔ بس اسی لیے تمہیں ڈھیلی ڈھیلی لگ رہی ہوں۔" علیزہ نے اس بار تفصیلی جواب دے کر اسے مطمئن کرنا چاہا۔

"میں پاپا سے کہتی ہوں، وہ آکر تمہارا چیک اپ کریں۔ پتا نہیں یہاں کس ڈاکٹر سے علاج کروا رہی ہو۔" انابیہ بولی تھی۔

"ماموں کو تکلیف مت دینا۔ میں کل خود آجاؤں گی۔ چیک اپ بھی کرواؤں گی ماموں سے اور اب تم میری فکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ، کتنے دن کے لیے آئے ہو۔ واپسی کب کی ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"پرسوں صبح صبح نکل لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ کل کا دن تو ہے نا۔ کل میں صبح آجاؤں گی اور شام تک حویلی ہی رکوں گی اور ہاں شہرام آگیا یا ابھی نہیں پہنچا؟"

علیزہ کو جیسے اچانک یاد آیا تو پوچھ بیٹھی۔ شہرام کی انجینئرنگ مکمل ہو چکی تھی اور وہ پچھلے تین ماہ سے لاہور میں جاب کر رہا تھا۔ اب انابیہ کا اس سے حویلی میں سامنا کم ہی ہوتا تھا اور وہ اس بات پر شکر بھی مناتی تھی۔ انابیہ جانے کیوں اس شخص کی بھوری شرارتی آنکھوں سے گھبرا سی جاتی تھی۔

"یعنی اس ویک اینڈ پر موصوف نے بھی گاؤں آنا ہے۔" انابیہ نے علیزہ کا سوال سن کر برا سا منہ بنایا تھا۔

"اس کا مطلب ہے نہیں پہنچا۔" علیزہ ہنس پڑی تھی۔

"ویسے مجھے تو لگتا ہی نہیں کہ شہرام، شہریار بھائی کا بھائی ہے۔ شہریار بھائی کتنے سوبر، ڈیسنٹ اور مجھور پرسنیلٹی کے مالک ہیں۔ ہر طرح کی ذمہ داری بھی شہریار بھائی کے سر پر ہے، فزکس میں ماسٹرز کرنے کے باوجود زمینیں سنبھال رہے ہیں۔ شہرام کو دیکھ کر تو لگتا ہی نہیں کہ اس میں بھی کسی قسم کا احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے۔ بس وہ تو باتیں بنانے کا ماہر ہے۔" انابیہ نے دونوں بھائیوں کا تقابل کیا تو علیزہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہریار بھائی جیسا شاندار شخص کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ تم نے ان کی جو خوبیاں گنوائی ہیں، ان میں چار، پانچ خوبیاں مزید بھی شامل کی جا سکتی ہیں لیکن یار! شہرام بھی کسی سے کم تو نہیں۔

ذرا اس کا تعلیمی ریکارڈ اٹھا کر دیکھو۔ اتنے ذہین اور قابل انجینئر کو کہہ رہی ہو کہ وہ صرف باتیں بنانے کا ماہر ہے۔ وہ اگر سن لے تو تمہیں جتنا سنائے گا' تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں۔"

علیزہ مسکراتے ہوئے اسے ڈرا رہی تھی۔ اناب‍یہ ہنس پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کھانے کے بعد حیات احمد نے مصطفیٰ' عفیفہ اور انابیہ کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اصل موضوع پر آئے تھے۔

"تمہیں یاد ہے مصطفیٰ! برسوں پہلے اسی کمرے میں ایک خاص بات کرنے کے لیے میں نے تمہیں اپنے پاس بلوایا تھا۔" بابا جان مصطفیٰ سے مخاطب تھے۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر رہ گئے۔

"جب میں تمہاری زندگی سے متعلق اہم فیصلہ کرنے جا رہا تھا' لیکن میں نے اس بارے میں تم سے مشاورت کی ضرورت تک محسوس نہ کی اور تمہیں سیدھے سیدھے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس سنگین غلطی کا خمیازہ ہمیں برسوں بھگتنا پڑا اب میں ماضی والی غلطی دہرانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے جو بات میں اب کرنے لگا ہوں' اسے میرا فیصلہ نہ سمجھو۔ فیصلہ تم لوگوں نے ہی کرنا ہے۔"

"بابا جان! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ کھل کر کہیں نا۔" مصطفیٰ نے حیرانی سے باپ کو مخاطب کیا۔ حیات احمد مسکرائے تھے۔

"مرتضیٰ اور میمونہ شہرام کے لیے انابیہ کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو۔ یہ سوچ کر اقرار نہ کرنا کہ انکار سے بھائی' بھلوج کے دل کو ٹھیس پہنچے گی۔ مرتضیٰ نے کہہ دیا ہے کہ تمہارا ہر فیصلہ اسے خوش دلی سے قبول ہوگا۔" حیات احمد رسانیت بھرے لہجے میں مخاطب ہوئے۔ مصطفیٰ اور عفیفہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں خوشی نمی بن کر چمکنے لگی تھی۔

"مرتضیٰ بھائی نے یہ سوچا بھی کیسے کہ ہمارا جواب انکار میں ہو سکتا ہے۔ انابیہ کے لیے شہرام سے بہتر انتخاب اور کیا ہو سکتا ہے بابا جان۔" مصطفیٰ نے سوچنے کے لیے ایک منٹ بھی نہ لیا تھا۔ عفیفہ نے بھی گردن ہلا کر ان کی تائید کی۔

"وہ غلطی مت کرو مصطفیٰ! جو میں نے کی تھی۔" بابا جان مسکرائے تھے۔ مصطفیٰ نے نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔

"انابیہ کو میں نے اسی لیے بلوایا ہے تاکہ اس کی رائے اور مرضی بھی جان سکوں۔ اپنی زندگی کے متعلق ہر طرح کا فیصلہ کرنے کا اختیار انابیہ کے ہی پاس ہے۔ ہاں بیٹا! بغیر شرمائے تم مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دو۔ تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ سوچنے کے لیے وقت لینا چاہتی ہو تو لے لو۔ اپنے ماں' باپ کی رائے کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنی دلی آمادگی کو مد نظر رکھو اور پھر کوئی فیصلہ کرو۔" حیات احمد انابیہ سے پیار سے مخاطب ہوئے۔ انابیہ کیا کہتی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دادا جان نے یہ بات کرنے کے لیے بلوایا ہے۔

"کیا آپ نے شہرام سے اس کی مرضی پوچھی ہے؟" کچھ لمحوں کے توقف کے بعد انابیہ نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"دیکھ لیا مصطفیٰ! تم سے زیادہ عقل مند میری پوتی ہے۔" حیات احمد خوش ہوتے ہوئے بولے۔

مصطفیٰ دھیرے سے ہنس پڑے تھے۔ دل میں ایک بار پھر احساس ندامت جاگا تھا۔ یہ ان کا ماضی تھا جس سے خائف ہو کر باپ نے اتنی لمبی تمہید باندھی تھی۔ اور بیٹی کا ذہن بھی ان ہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔

"اس رشتے میں مرتضیٰ اور میمونہ کے ساتھ ساتھ شہرام کی پسندیدگی کا بھی عمل دخل ہے بیٹا۔ تم ہر طرح کا خدشہ ذہن سے جھٹک ڈالو۔ تمہیں صرف اپنے دل سے پوچھ کر اپنی مرضی معلوم کرنی ہے۔" حیات احمد مشفقانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولے تھے۔ انابیہ

کے گالوں پر حیا کی لالی چھپی تھی۔

"آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"جیتی رہو۔ خوش رہو۔" حیات احمد بے پناہ خوش ہو گئے تھے۔ "پھر مرتضیٰ اور میمونہ کو خوش خبری سنا دوں کہ شہزار کے ساتھ ساتھ شہرام کے سر پر بھی سہرا باندھنے کی تیاری کریں۔" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"تو شہریار کا رشتہ اوکے ہو گیا۔ مجھے مرتضیٰ بھائی تو کچھ متذبذب لگ رہے تھے۔" مصطفیٰ نے بابا جان سے استفسار کیا تھا۔ انابیہ نے حیرت سے انہیں دیکھا' اس کے تو علم میں ہی نہ تھا کہ شہریار بھائی کا رشتہ بھی کہیں طے ہونے جا رہا ہے۔

"ہاں مرتضیٰ کچھ ہچکچا رہا تھا' لیکن میں اسے وہ غلطی نہیں دہرانے دوں گا جو ماضی میں مجھ سے سرزد ہوئی۔" حیات احمد ٹھوس لہجے میں بولے تھے۔ مصطفیٰ ایک بار پھر شرمندہ سے ہو گئے تھے۔

"شہریار میرا بہت سمجھ دار اور فرماں بردار پوتا ہے۔ چھوٹی عمر سے ہی اس نے اپنے کندھوں پر بھاری ذمہ داریاں اٹھا رکھی ہیں۔ زمینوں کا انتظام و انصرام سنبھالنا اکیلے مرتضیٰ کے بس کی بات نہیں تھی اور میں تو عرصہ ہوا سب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔ شہزار چاہتا تو تعلیم مکمل کر کے اپنی مرضی کی فیلڈ چن لیتا' لیکن اس نے تو تعلیم کے ساتھ ساتھ بھی باپ کا بھرپور ہاتھ بٹایا۔ شوق کی خاطر ڈگری تو لے لی' لیکن عملی طور پر تو وہ زمین دار ہی ہے نا۔ وہ خاندان کے مفاد میں اپنی خواہش سے دستبردار ہو گیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹریٹ کرنا اس کا جنون تھا۔ اسے تو اسکالر شپ بھی مل رہا تھا' لیکن اس نے آگے پڑھائی جاری نہ رکھی۔ جب وہ ہمارے لیے اپنی خواہش چھوڑ سکتا ہے تو ہمیں بھی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی ایک جائز خواہش کو پورا کرنے میں تعاون کرنا چاہیے۔ حالانکہ مرتضیٰ اور میمونہ اس کے لیے کچھ اور سوچے بیٹھے تھے' لیکن میں نے سمجھایا تو بات ان کی عقل میں سما ہی گئی۔" حیات احمد شگفتہ انداز میں مسکرائے تھے۔

"میمونہ بھابھی نے مجھے سیمین کی تصویر دکھائی ہے۔ مجھے بھی بچی بہت پسند آئی ہے۔ پھر واقعی جب وہ شہریار کی پسند ہے تو ہم سب کو بھی خوشی خوشی اس کی پسند کو اپنا لینا چاہیے۔" عفیفہ نے سسر کی بات کی تائید کی۔

انابیہ کے لیے آج کا دن دوہرے انکشاف کا دن تھا۔ شہزار بھائی اپنی کلاس فیلو میں انٹرسٹڈ تھے' ان کا وہاں رشتہ طے ہونے جا رہا تھا اور شہرام۔ اس کا تصور کر کے ہی انابیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ دادا جان نے بتایا تھا کہ اس رشتے میں شہرام کی پسندیدگی کا بھی پورا پورا عمل دخل ہے اور ان کی بات سن کر وہ بری طرح شرما گئی تھی۔

آج کی رات کتنی انوکھی تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلے جا رہی تھی' مگر نیند روٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی آنکھیں بند کرتی چھم سے شہرام کی بھوری آنکھیں ذہن کے پردے پر مسکرانے لگتیں۔ اپنے دل کی یہ کیفیت انابیہ کے لیے خود بھی حیران کن تھی۔ جب دادا جان نے اس کے لیے شہرام کا رشتہ پیش کیا تو وہ شدید ترین حیرت سے دوچار ہوئی تھی' لیکن وہ خوش گوار حیرت تھی۔ دل میں ایک لمحے کے لیے بھی شہرام کے لیے کوئی ناپسندیدگی نہ ابھری تھی۔ اس کا یہی مطلب نکلتا تھا کہ دل کے نہاں گوشوں میں پہلے ہی اس کے لیے پسندیدگی موجود تھی۔ انابیہ سوچے جا رہی تھی اور دھیمی مسکان لبوں پر پھیلتی جا رہی تھی۔

رات کا دوسرا پہر بھی گزرنے کو تھا' مگر نیند ہنوز آنکھوں سے دور تھی۔ پھر دل میں چائے کی طلب جاگی تھی۔ وہ دبے پاؤں کچن کی طرف آئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ رات کے اس پہر بھی کوئی باورچی خانے میں موجود ہو گا۔ وہ شہرام تھا جو فریج کھنگالنے میں مصروف تھا انابیہ نے واپس پلٹنا چاہا' مگر قدموں کی آہٹ پر شہرام سر اٹھا چکا تھا۔

"واپس تو ایسے مڑ رہی تھیں انابیہ بی بی جیسے کچن میں کوئی بھوت پریت دیکھ لیا ہو۔" وہ مسکرایا تھا۔

"میں، وہ، نہیں تو۔ میں تو چائے پینے آئی تھی۔" اس نے ہکلاتے ہوئے وضاحت دی۔

"تو پی لیجیے۔ کس نے روکا ہے۔"

"نہیں۔ کوئی خاص طلب نہیں۔ صبح پی لوں گی۔" اس کے بوکھلائے ہوئے انداز پر شہرام کو ہنسی روکنا دوبھر ہو گیا۔

"صبح تو سب ہی پییں گے بھئی، لیکن آپ کا دل تو اس وقت کر رہا ہے جب ہی تو رات کے اس پہر آپ باورچی خانے کی طرف نکلی ہیں۔"

"آپ بھی تو رات کے اس پہر باورچی خانے میں موجود ہیں۔" انابیہ نے بھی ذرا خفا ہو کر جتایا تھا۔

"بات تو آپ کی سولہ آنے سچی ہے، لیکن قصہ کچھ یوں ہے کہ میں لاہور سے رات گیارہ بجے گھر پہنچا۔ امی نے کھانے کا پوچھا، مگر سفر میں سینڈوچ وغیرہ کھا چکا تھا سو اس وقت بھوک محسوس نہیں ہوئی۔ امی مطمئن ہو کر سونے چلی گئیں، مگر مجھے تھوڑی دیر میں بھوک لگنا شروع ہو گئی۔ پہلے تو بھوک برداشت کی جب برداشت سے باہر ہوئی تو یہاں آ گیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ فریج میں تین طرح کے سالن تو موجود ہیں مگر ہاٹ پاٹ میں ایک روٹی تک نہیں۔ آپ اتفاق سے ادھر آ ہی گئی ہیں تو پلیز ایک روٹی تو ڈال دیجیے۔" شہرام نے بے تکلفی سے فرمائش کی۔

"روٹی؟" انابیہ نے تھوک نگلا تھا۔

"مجھے روٹی نہیں بنانی آتی۔" اس نے شرمندہ سے لہجے میں بتایا۔

"کیا کہا؟ آپ کو روٹی نہیں بنانی آتی۔" شہرام بولا تھا اور کیا نہیں تھا اس کے لہجے میں۔ حیرت، افسوس، بے یقینی، صدمہ۔

"ہاں، لیکن میں سیکھ لوں گی۔" انابیہ نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں یقین دلایا۔ اس معصومیت کے اظہار پر شہرام فدا ہی تو ہو گیا، مگر کچھ لاپروا سا لہجہ بنا کر بولا۔

"بھئی، آپ روٹی بنانا سیکھیں یا نہ سیکھیں۔ میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔" انابیہ بھی اپنی بوکھلاہٹ پر دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے، میں سونے جا رہی ہوں۔ آپ بھی سو جائیں، فجر کے وقت تائی جان اٹھیں گی تو آپ کو ناشتہ بنا دیں گی۔"

وہ کہہ کر رکی نہ تھی اور پیچھے کھڑے شہرام کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ رات گھر پہنچنے کے بعد وہ سیدھا دادا کے کمرے میں پہنچا تھا۔ وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے پوتے کو دیکھ کر مسکرائے۔

"بتایئے۔ گرینڈ پا کیا بنا میری عرض کا؟" اس نے چھوٹتے ہی استفسار کیا۔

"متفقہ طور پر منظور کر لی گئی ہے۔" انہوں نے مسکرا کر بتایا تھا۔

"گریٹ گرینڈ پا!" اس نے بے ساختہ ان کے ہاتھ چوم لیے تھے۔

دل میں اسی وقت سے خواہش بیدار ہو رہی تھی کہ کاش انابیہ کی ایک جھلک دکھائی دے جائے، لیکن وہ اپنے کمرے میں سونے جا چکی تھی، کیا خبر تھی کہ رات کے اس پہر دعا قبولیت کا درجہ پا جائے گی۔ انابیہ کا گھبرایا، بوکھلایا اور شرمایا سا روپ دل کو اندر تک مطمئن کر گیا تھا۔ شہرام گنگناتے ہوئے اوون میں سالن گرم کرنے لگا پھر سکون سے بیٹھ کر سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔ دو روٹی کھا لینے کے بعد بھی ہاٹ پاٹ میں ڈیڑھ روٹی باقی بچی تھی۔

☼ ☼ ☼

عفیفہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے جا رہی تھیں۔ انابیہ بھی ان کے ساتھ ہولی۔ وہ آج کم سے کم شہرام کا سامنا کرنا چاہ رہی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی تو ناعمہ آئی ہوئی تھیں۔

"علیزہ آج بھی نہیں آئی پھوپھو۔" انابیہ نے چھوٹتے ہی استفسار کیا۔

"آئی ہے بیٹا! شاید بابا جان کی اسٹڈی سے کوئی کتاب لینے گئی ہے۔ تم بیٹھو میرے پاس۔ میں نذیراں کو بھیج کر بلوالی ہوں اسے۔" ناعمہ پھوپھو نے اپنے قریب اس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

"ایک منٹ پھوپھو۔ میں علیزہ کو لے کر آتی ہوں۔" وہ فوراً علیزہ کی تلاش میں نکلی۔ اپنے دل کی بدحتی یقینیات سننے کے لیے اسے ایک رازدان درکار تھا اور ہونوں جیسی کزن سے زیادہ اس کا رازداں اور کون ہو سکتا تھا بھلا۔ دھیمی مسکان لبوں پر سجائے وہ اسٹڈی کی طرف تنی تھی۔ اندر سے آتی شہرام کی آواز سن کر وہ ٹھٹھک کر رکی تھی۔

"رو رو کر تم نے یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ پلیز علیزہ! چپ ہو جاؤ۔"

وہ منت بھرے لہجے میں علیزہ سے مخاطب تھا۔ علیزہ کی سسکیاں تھمنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ انابیہ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ یہ ایک اضطراری فعل تھا۔ پتا نہیں وہ شہرام کا سامنا کرنا چاہ رہی تھی یا پھر علیزہ سے یوں بری طرح رونے کا سبب دریافت کرنا چاہتی تھی۔ کل علیزہ نے اسے تو ٹال دیا تھا، لیکن اس کی اجڑی شکل دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہے جس کی وہ پردہ پوشی کر رہی ہے۔

"میرے سامنے میرا محبوب کسی اور کا ہو رہا ہے اور تم کہتے ہو میں آنسو بھی نہ بہاؤں۔ ایک آنسو بہانا ہی تو میرے اختیار میں ہے شہرام۔ پلیز آنسو بہانے سے تو مت روکو۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

"خود کو سمجھاؤ علیزہ۔ عفیفہ چچی کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ بغیر چاہت کے کسی کی زندگی کا حصہ بنا جائے تو اپنا آپ منوانے اور محبت پانے میں ایک عمر لگ جاتی ہے۔ عفیفہ چچی میں پھر بہت صبر، برداشت اور حوصلہ تھا۔ تم بھی اتنا انتظار نہیں کر پاؤ گی۔" شہرام نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"تم کتنے سنگ دل ہو شہرام۔ یہ خواب تم نے خود میری آنکھوں میں سجائے تھے جب میں اس راہ پر چل پڑی تو مجھے مثالیں دے کر سمجھانے چلے ہو۔" علیزہ بپھر ہی تو گئی تھی۔

"وہ میرا بچپنا تھا علیزہ! میری حماقت تھی۔" شہرام بظاہر افسردہ سے لہجے میں مخاطب ہوا تھا، مگر باہر کھڑی انابیہ کے رگ و پے میں اشتعال کی شدید لہر دوڑ گئی۔

غم اور غصے کی شدت سے اسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ بنا کچھ مزید سنے وہ واپس پلٹ آئی تھی۔ ایک رات میں ہی جو شخص دل کے اتنا قریب ہو گیا تھا وہ اب نگاہوں تک سے گر گیا۔ کتنا بدمنافق، دغاباز اور ہرجائی شخص تھا وہ۔ انابیہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

کل جب اس نے دادا جان سے پوچھا تھا کہ کیا اس رشتے میں شہرام کی مرضی بھی شامل ہے تو دادا جان نے کتنا خوش ہو کر اس کی عقل مندی کو سراہا تھا، لیکن اس سے زیادہ نادان بھلا کون ہو سکتا تھا۔ علیزہ اور شہرام کی دوستی اور بے تکلفی اس سے ڈھکی چھپی تو تھی، آخر اس کے ذہن میں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ علیزہ اور شہرام کے درمیان دوستی کے علاوہ کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا ہے۔ محبت کا وہ رشتہ جس کو شہرام نے تو مزے سے بچپن کی حماقت قرار دے دیا تھا۔ کتنا بے مول کر دیا تھا اس نے علیزہ کے جذبوں کو انابیہ کا دل اپنی سہیلی کے لیے رو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب علیزہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی تو انابیہ کو اس سے نگاہیں ملانا دشوار ہو گیا۔

"چپکے چپکے بات پکی کروالی اور ہمیں خبر تک نہ ہونے دی۔ مبارکاں بھئی مبارکاں۔" علیزہ شگفتگی سے کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی تھی۔ انابیہ اس کے حوصلے اور ظرف پر ششدر رہ گئی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں ابھی تک یقین ہی نہیں آیا کہ شہرام سے تمہارا رشتہ طے ہو گیا ہے۔" علیزہ اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"یہ سب کچھ اچانک ہوا ہے علیزہ۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کل دادا جان مما، پاپا سے یہ بات کریں گے۔" انابیہ وضاحت دیتے ہوئے روہانسی ہو رہی تھی۔

"تو پگلی لڑکی! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ خوش قسمت ہو تم تو، جو کسی کی چاہت پر اس کی زندگی کا حصہ بننے جا رہی ہو۔"

علیزہ مسکرا کر بولی تھی' لیکن اس کا بھیگا بھیگا لہجہ انابیہ کے دل کو چیر گیا تھا۔ کاش وہ علیزہ کے لیے کچھ کر سکتی' مگر وہ علیزہ کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ آنے والے دنوں میں یہ ہی سوچ اسے بری طرح ہلکان کرتی رہی تھی۔ میمونہ تائی نے بہت پیار سے اس کی انگلی میں شہرام کے نام کی انگوٹھی پہنادی تھی۔ اس وقت حویلی میں ہر شخص کے چہرے پر بڑی واضح خوشی دیکھی جا سکتی تھی۔ انابیہ کا بس نہ چلتا کہ وہ حویلی کے ایک ایک شخص کو پکڑ کر شہرام کی حقیقت سے آگاہ کردے' لیکن شہرام جیسے ڈھیٹ شخص سے کچھ بعید نہ تھا ہو سکتا ہے وہ صاف مکر ہی جاتا کہ اس نے بھی علیزہ کو بھی اپنی محبت کا یقین دلایا ہے' جب وہ علیزہ کے منہ پر کہہ سکتا تھا کہ وہ محبت' بچپن کی حماقت تھی تو سب کے سامنے بھی وہ یہ بات ہنسی مذاق میں اڑا سکتا تھا۔ باتوں کا تو ویسے بھی کھلاڑی تھا۔

انابیہ ہرگز نہ چاہتی تھی کہ علیزہ کی ذات کا بھرم ٹوٹے جب اس نے خود کسی کے سامنے صدائے احتجاج بلند نہیں کی تو انابیہ بھی یہ کیسے کر سکتی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ وہ علیزہ کا نام لیے بغیر شہرام سے جڑا رشتہ توڑ دے تو ہو سکتا ہے شہرام علیزہ کو اپنا لے لیکن پھر شہرام کی سفاکی یاد آجاتی۔ وہ علیزہ کو جتا رہا تھا کہ بغیر چاہت کے کسی کی زندگی میں شامل ہو جائے تو زندگی عفیفہ کی طرح گزرتی ہے۔ تشنہ اور نا آسودہ۔

اپنی ماں کی پوری زندگی انابیہ کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی۔ آبلہ پائی کا یہ سفر اختیار کرنا واقعی علیزہ کے بس کی بات نہ تھی۔

انابیہ سوچتی جاتی اور دماغ پھٹنے کو ہو جاتا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے شہرام کی زندگی میں شامل ہونا اس کے بس سے باہر تھا لیکن اپنے ماں باپ کے خوشی سے دمکتے چہرے دیکھتی تو بے بسی کا احساس سوا ہو جاتا۔ اس نے زندگی میں کبھی انہیں اتنا مطمئن اور خوش باش نہ دیکھا تھا۔ اس کا ایک جذباتی قدم خاندان بھر کی خوشیوں کو داؤ پر لگا سکتا تھا۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے اب جا کر ملے تھے وہ پھر سے ان میں کوئی دراڑ نہ ڈالنا چاہتی تھی سو سب کچھ وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

☆ ☆ ☆

انابیہ کے فائنل سمسٹر کے فوراً بعد شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی' پہلے شہریار کی بارات سبین کے گھر گئی تھی۔ اگلے روز وہ شہرام کے سنگ رخصت ہو کر حویلی پہنچ گئی تھی۔ علیزہ نے شادی کی تمام رسموں میں بھرپور شرکت کی تھی لیکن انابیہ نے بارہا اسے اپنی بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ بلا کا ضبط تھا اس لڑکی میں۔ اس نے انابیہ کی بہن بن کر شہرام سے تگڑا سا نیگ بھی وصول کیا تھا اور اس وقت اس کی کھلکھلاہٹیں عروج پر تھیں۔

انابیہ میں اس جتنا ضبط نہ تھا۔ وہ مسلسل روئے جارہی تھی۔ سب اس رونے کو دلہن کے روایتی رونے پر محمول کررہے تھے مگر وہ تو جیسے آج سارے آنسو بہا دینا چاہتی تھی' شاید اسی طرح دل پر دھرا بوجھ کچھ کم ہو جاتا۔

"انابیہ میری جان! میرے بچے کیوں رو رو کر خود کو ہلکان کر رہی ہو بیٹا' اس طرح تو کل سبین بھی نہیں روئی تھی۔ تم تو اپنوں میں آئی ہو۔ ہم سب ہیں نا تمہارے پاس۔ کل صبح سویرے تمہارے مما' پاپا اور سلمان' سنعان بھی آجائیں گے۔" ناعمہ پھوپھو نے اسے بانہوں میں بھینچ کر خوب پیار کیا تھا۔

"سب رسمیں چھوڑو ناعمہ! میری بیٹی کو اس کے کمرے تک لے جاؤ۔ اس نے تو رو رو کر اپنا برا حال کرلیا ہے۔ بابا جان نے دیکھ لیا تو وہ بھی پریشان ہو جائیں گے۔" میمونہ بیگم نے ناعمہ کو مخاطب کیا۔

ناعمہ اسے کمرے تک چھوڑ آئی تھیں۔

"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے پھوپھو! یہ جیولری اتار دوں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ ناعمہ اس کا سوال سن کر کچھ پریشان ہوئی تھیں۔

"کچھ دیر رک جاؤ۔ بس ہم ابھی شہرام کو تمہارے پاس بھیجتے ہیں۔" وہ اسے موقع محل کی نزاکت سمجھانا چاہ رہی تھیں۔

اتنے میں میمونہ دودھ کا فلاسک لیے آ گئی تھیں۔
ناعمہ نے دھیرے سے بھانجی کو اس کی طبیعت سے آگاہ کیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھی تھی۔ چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

"تائی جان پلیز۔ کوئی ایزی سا ڈریس نکال دیں۔ میں ریلیکس کرنا چاہتی ہوں۔ اسی حالت میں رہی تو مجھے خدشہ ہے کہ بے ہوش ہی نہ ہو جاؤں۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ ناعمہ اور میمونہ نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے میرے بچے! تم پریشان نہ ہو۔ ناعمہ وارڈروب سے کوئی سوتی جوڑا نکال دو انابیہ کو، میں سر درد کی کوئی دوا لاتی ہوں۔" میمونہ نے ناعمہ کو مخاطب کیا۔ ناعمہ کی مدد سے اس نے جیولری، بالوں اور دوپٹے میں اٹکی پنوں سے نجات حاصل کی تھی پھر کپڑے تبدیل کر کے وہ بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ اور شہرام کے آنے سے پہلے وہ نیند کی وادی میں اتر چکی تھی۔

***
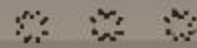
صبح اس کی آنکھ کھلی تو چند لمحوں کے لیے تو سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ پھر گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ آخر شہرام کے نام سے جڑ کر اس کے بیڈ روم میں پہنچ چکی تھی۔ قسمت کے سامنے کس کا زور چلتا ہے بھلا۔ وہ گہری سانس لیتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔ اتنے میں ڈریسنگ روم سے شہرام برآمد ہوا۔ انابیہ نے صرف ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر جامد احساسات کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

"صبح بخیر زندگی۔" شہرام اسے دیکھ کر بہت محبت سے مسکرایا تھا۔ انابیہ نے اس پر دوبارہ نگاہ تک ڈالنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔" وہ نرمی سے استفسار کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے لٹھ مار انداز میں مختصر سا جواب دیا۔

"دلچسپ بات ہے۔ ویسے میں تاریخ عالم کا پہلا دولہا ہوں جس کی سہاگ رات بیوی کا سر دباتے ہوئے گزری ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔

اگر وہ شہرام کی اصلیت سے آگاہ نہ ہوتی تو اس وقت دل میں اس کی اعلیٰ ظرفی کی قائل ہو چکی ہوتی۔

گزری رات اس نے شہرام کا انتظار تک نہ کیا تھا۔ مانا اس کی طبیعت خراب تھی لیکن جس طرح وہ کپڑے تبدیل کر کے لمبی تان کر سو گئی تھی کوئی اور ہوتا تو زندگی کی حسین رات کو اس بے دردی سے ضائع کرنے پر خفگی کا اظہار تو کرتا، لیکن وہ بنا کچھ جتائے، بہت ہنستے مسکراتے اس کی مزاج پرسی کر رہا تھا۔

"چلو تم فریش ہو لو پھر سب کے ساتھ مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔" شہرام کے کہنے پر وہ اٹھ گئی تھی۔ اس کا اصل مسئلہ شہرام تھا۔ وہ گھر کے باقی لوگوں کو اپنے رویے سے پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ پھر گھر میں ایک اور دلہن بھی موجود تھی۔ انابیہ جانتی تھی کہ اگر وہ سر جھاڑ منہ پہاڑ حلیے میں کمرے سے نکلی تو فوراً اس کا تقابل بجی سنوری ثمین بھابھی سے کیا جائے گا۔

شفیق سی تائی جان کی رات والی مہربانی ہی بہت تھی، وہ اب انہیں شکایت کا موقع نہ دینا چاہتی تھی۔ نہا دھو کر اس نے ہلکا فیروزی کامدانی کا سوٹ پہنا تھا۔ کندن کی نازک سی جیولری اور لائٹ سا میک اپ۔ آئینہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ اگر وہ کمرے میں موجود اپنے شوہر کی آنکھوں میں جھانک لیتی تو گواہی کے لیے آئینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ شہرام بہت فرصت سے اس کے چہرے کے حسین نقوش تک رہا تھا۔ انابیہ اسے لاکھ نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی مگر اس کی نگاہوں کی تپش سے اس کی ہتھیلیاں پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔" ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں اپنے پیچھے کھڑے شہرام کا عکس دیکھ کر وہ سپٹا گئی تھی۔

"معلوم ہے مجھے۔" اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے

ہوئے اس نے سرد مہری سے جواب دیا اور بیڈ پر بیٹھ کر سینڈلز پہننے لگی۔

"اینی پرابلم انابیہ؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا۔" شہرام اس کے سرد سپاٹ رویے پر قدرے الجھا تھا۔ یہ دلہنوں والی روایتی شرم نہ تھی' اس کا رویہ ناقابل فہم سا تھا۔

"میں نے کہا ناں' ٹھیک ہے میری طبیعت۔ آئیں چلیں' ناشتے پر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔" انابیہ نے اسی سپاٹ سے لہجے میں شہرام کو مخاطب کیا۔

"چلتے ہیں' پہلے اپنا رونمائی کا تحفہ تو لے لو۔" شہرام نے مسکراتے ہوئے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دھری مخملی ڈبیہ اٹھائی تھی پھر اس کے قریب بیٹھا تھا۔ انابیہ نفس انداز میں دونوں ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی رہی۔ شہرام نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نازک سی ڈائمنڈ رنگ اس کی انگلی میں پہنائی تھی۔ انگوٹھی پہن لینے کے بعد انابیہ نے یک لخت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا۔

"تم مجھ سے کس بات پر خفا ہو انابیہ۔" شہرام اس کے انداز پر ششدر رہ گیا تھا۔ انابیہ نے ایک کٹیلی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"مجھے بھوک لگی ہے' میں ناشتا کرنے جا رہی ہوں۔" شہرام کی بات کا جواب دیے بنا وہ اٹھ گئی تھی۔ شہرام نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔ وہ پہیلیاں بوجھنے کا ہمیشہ سے ہی بہت شوقین تھا لیکن جو پہیلی اسے اپنی شادی شدہ زندگی کی اولین صبح بوجھنی پڑ رہی تھی دماغ میں دور دور تک اس کا کوئی ممکنہ جواب موجود نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم بہت خوش قسمت ہو انابیہ۔ اب تمہارے اپنے تئیں' تم سب کو اچھی طرح جانتی ہو۔ کوئی شرم' جھجک یا گھبراہٹ نہیں۔ میں تو بہت کنفیوز ہو رہی ہوں یار۔" ولیمے کی تقریب میں دلہن بنی سبین اس سے مخاطب تھی۔

"شروع شروع میں تو یہ شرم اور گھبراہٹ فطری ہے' سبین بھابھی۔ کچھ وقت لگے گا پھر آپ بھی سب میں گھل مل جائیں گی۔" اس نے سبین کو دوستانہ انداز میں تسلی دی۔

"ہاں' کل شہریار بھی مجھے یہی سمجھا رہے تھے۔" شہریار کا ذکر کرتے ہوئے سبین کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

چند لمحے پہلے سبین انابیہ پر رشک کر رہی تھی اور اب انابیہ کو اس کی قسمت پر جی بھر کر رشک آ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں سبین کی خوشیوں کے سدا قائم رہنے کی دعا کی تھی۔

☆ ☆ ☆

شہرام ہرگز توقع نہ کر رہا تھا کہ آج بھی اس کی دلہن دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ بیڈ پر نیم دراز ملے گی۔ انابیہ نے شہرام کے قدموں کی چاپ سن کر لحاف منہ تک تان لیا تھا۔ کچھ لمحوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی وہ شاید فریش ہونے واش روم گیا تھا۔ ذرا دیر بعد کمرے میں کچھ کھٹ پٹ ہوئی تھی اور پھر دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ انابیہ نے لحاف کا ذرا سا کونا چہرے سے ہٹایا۔

شہرام جائے نماز بچھائے قبلہ رو کھڑا تھا۔ وائٹ کاٹن کے شلوار قمیص میں وہ رات کے اس پہر بھی تنا فریش اور تروتازہ لگ رہا تھا۔ جس انہماک سے وہ نماز پڑھ رہا تھا' انابیہ چند لمحوں کے لیے اس پر سے نگاہیں نہ ہٹا پائی۔

"اونہہ! صرف حقوق اللہ کی ادائیگی سے کیا ہوتا ہے۔" انابیہ نے خود کو متاثر ہونے سے روکا تھا۔ شہرام نے پورے سکون سے نماز کی ادائیگی کی تھی۔ انابیہ کا خیال تھا کہ وہ کل کی طرح اسے سوتا جان کر خود بھی سو جائے گا لیکن یہ اس کی بھول تھی۔

"مجھے علم ہے' تم جاگ رہی ہو۔ سونے کی ایکٹنگ چھوڑو اور اٹھو' مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" شہرام کی سنجیدہ سی آواز انابیہ کے کانوں سے ٹکرائی

تھی۔ وہ پھر بھی اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑی رہی تو شہرام نے اس کا لحاف پکڑ کر کھینچا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے شہرام۔" انابیہ ناگواری سے کہتی اٹھ بیٹھی تھی۔

"بدتمیزی یہ نہیں، بدتمیزی وہ ہے جو تم کر رہی ہو۔" وہ خفگی سے گویا ہوا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ سونا ہے مجھے۔" انابیہ کی بیزاری کا عجب ہی عالم تھا۔

"تم مجھے مسلسل ایوائیڈ کر رہی ہو۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ انابیہ۔! مسئلے بات چیت سے ہی سولو ہوتے ہیں۔" وہ بہت تحمل مزاجی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ انابیہ نے ایک تیکھی نگاہ اس کے خوبرو چہرے پر ڈالی۔

"میں تو پہلے ہی تمہاری محبت میں گھائل ہو چکا ہوں۔ یوں نگاہوں کے تیر تو مت چلاؤ یار۔" وہ بے بسی سے مسکرایا تھا۔ ایک تنفر بھری مسکراہٹ انابیہ کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔

"اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یہی سمجھتا کہ تم اس شادی پر راضی نہیں تھیں اور تمہیں زبردستی اس بندھن میں باندھا گیا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ رشتہ سو فیصد تمہاری مرضی پر طے ہوا ہے پھر اس طرح بی ہیو کیوں کر رہی ہو۔؟"

"آپ غلط سمجھے تھے شہرام! میں اس رشتے کے لیے قطعاً" راضی نہ تھی۔ آپ کی زندگی کا حصہ بننے کے لیے مجھے اپنے دل پر جتنا جبر کرنا پڑا ہے۔ آپ اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔" وہ سفاکی سے بولی تھی۔

شہرام اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا تھا۔

"تم جانتی ہو، تم کیا کہہ رہی ہو۔" وہ اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ لگتا تھا۔

"سچ ہی کہہ رہی ہوں شہرام۔" اس کے چہرے پر پھیلی اذیت دیکھ کر انابیہ کے دل میں ٹھنڈک سی اتر گئی تھی۔

"اگر تم اس رشتے پر راضی نہیں تھیں تو ہاں کیوں کی تھی، کسی نے گن پوائنٹ پر تو مجبور نہیں کیا تھا تمہیں۔؟" وہ غصے سے لب بھینچے استفسار کر رہا تھا۔

"بعض اوقات اپنوں کی محبت آپ سے وہ کام کروا لیتی ہے جو شاید کوئی گن پوائنٹ پر بھی نہیں کروا سکتا۔" اس بار انابیہ تھکے تھکے لہجے میں بولی تھی۔

"تمہیں میری زندگی کے ساتھ یہ مذاق کرنے کی جرأت بھی کیسے ہوئی۔؟" شہرام بھنچے بھنچے لہجے میں چیخا۔ شہرام کے تیور دیکھ کر ایک لمحے کو تو انابیہ کا دل بھی پسلیوں میں زور سے دھڑکا تھا۔ مگر وہ چہرے کو بے تاثر رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ کچھ لمحوں تک شہرام اسے قہر بار نگاہوں سے تکتا رہا پھر اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔ اسے یوں بے سکون دیکھ کر انابیہ کے رگ و پے میں سکون اتر آیا تھا۔

"تو شہرام صاحب! آپ علیزہ کو میری ماں کی مثال دیتے ہوئے سمجھا رہے تھے کہ بغیر چاہت کے کسی کی زندگی کا حصہ بنا جائے تو زندگی کتنی ناآسودہ اور غیر مطمئن گزرتی ہے۔ اب یہ ہی ناآسودہ زندگی آپ کو جینی پڑے گی۔ میں اپنے بڑوں کو ذہنی اذیت سے بچانا چاہتی تھی، اس لیے ان کے سامنے آپ کی اصلیت نہ کھول پائی جس طرح یہ رشتہ جوڑنا میری مجبوری تھی ویسے ہی یہ رشتہ نبھانا آپ کی مجبوری ہے شہرام۔!" وہ زہرخند مسکراہٹ چہرے پر سجائے دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی۔

"تم سو سکتی ہو۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شہرام سپاٹ سے انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔ انابیہ پھر سے لحاف میں گھس کر سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

رواج کے مطابق سبین بھابھی کے میکے والے انہیں ساتھ لے گئے تھے۔ اس کی ماں کا تو مستقل ہی یہ تھا۔ عفیفہ، سلمان، سمعان کے ساتھ دو روز میں رکی تھیں۔ مصطفیٰ کو اسپتال کی مصروفیت کی وجہ سے جانا پڑا تھا۔ وہ اور شہرام سب کے سامنے ایک خوش باش کپل کا تاثر پیش کرنے میں کامیاب ٹھہرے تھے۔ دادا

جان، تایا ابو، تائی جان سب اس کے واری صدقے جارہے تھے۔ یمین صحیح کہتی تھی، وہ خوش قسمت تھی جو اتنے محبت کرنے والے اپنوں کے درمیان تھی۔

نامعہ پھوپھو اور علیزہ آج کل گھر کا سامان پیک کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ لوگ بس اب شہر شفٹ ہونے ہی والے تھے۔

"قسمت کی ستم ظریفی ہی ہے نا انابیہ! پہلے تم وہاں اور میں یہاں اور اب میں وہاں اور تم یہاں۔ اپنی قسمت میں ایک دوجے کے پاس رہنا تو لکھا ہی نہیں۔" علیزہ جاتے سمے اداس ہو رہی تھی۔

"میں جب ماما، پاپا کے پاس آیا کروں گی تو پھر تم بھی ہمارے ہاں رہنے آجایا کرنا۔" انابیہ نے اپنی پیاری سی سہیلی کو تسلی دی تھی۔

"تم لاہور سے اتنی جلدی جلدی تھوڑی آسکو گی۔" علیزہ مسکرائی تھی۔

"لاہور کون جارہا ہے؟" انابیہ لاپروائی سے بولی تھی۔

"ہیں، مطلب کون۔ کیا شادی کے بعد بھی شہرام بے چارہ چھڑا چھانٹ بن کر زندگی گزارے گا۔ بی بی! تیاری پکڑلو، تمہیں اس کے گھر کی چولہا چکی سنبھالنی پڑے گی۔" علیزہ نے اسے شرارت سے چھیڑا۔ اس وقت تو انابیہ محض مسکرا کر رہ گئی مگر اگلے دن دوپہر کے کھانے کے وقت گفتگو کا یہی موضوع چھڑ گیا تھا۔

"شہرام بیٹا! اب روانگی ہے تمہاری۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ پہلے غلام حسین کو ساتھ لے جاؤ۔ اپارٹمنٹ وغیرہ سیٹ کرو پھر انابیہ کو ساتھ لے جانا۔" مرتضیٰ نے گھریلو ملازم کا نام لیتے ہوئے شہرام کو مشورہ دیا تھا۔ تایا کے مشورے پر انابیہ گڑبڑا گئی تھی۔

"ابھی تو چھٹیوں کے بعد آفس جوائن کروں گا پاپا! کاموں کا انبار جمع ہوگا۔ اپارٹمنٹ وغیرہ سیٹ کرنا تو خاصی فرصت میں کرنے والا کام ہے۔"

شہرام نے بمشکل ٹالا تو انابیہ نے سکون کا سانس لیا۔

"دو تین جلدی تم واپس جارہے ہو۔ میں تو کہہ رہی تھی ہفتے، دس دن کی چھٹی اور لے لیتے۔ کہیں گھومنے پھرنے ہی چلے جاتے۔ شہریار اور یمین بھی تو جارہے ہیں۔ ساتھ تم بھی چلے جاتے بیٹا۔" اس بار مشکل میں ڈالنے والی میمونہ تھیں۔

"نہیں انکل مزید چھٹی ملنا مشکل ہے امی۔ ان شاء اللہ کچھ عرصے بعد چھٹی لے کر ناردرن ایریاز کی طرف گھومنے نکلیں گے۔ جب موسم بھی خوشگوار ہوگا۔ کیوں انابیہ۔" بات کے اختتام پر اس نے انابیہ سے بھی رائے طلب کی۔

"جی، جی بالکل۔" وہ اچانک مخاطب کیے جانے پر چونکی مگر پھر تابعداری سے اس کی بات کی تائید کی تھی۔ میمونہ کو بہو کی تابعداری پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے، جیسے تم لوگوں کی مرضی۔" وہ مطمئن ہوگئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

شہرام لاہور چلا گیا تھا۔ انابیہ کا خیال تھا کہ وہ اس کے جانے کے بعد خود کو مطمئن محسوس کرے گی مگر حیرت انگیز طور پر آج کمرے کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی خالی خالی ہو رہا تھا۔ وہ دس دن تک ایک چھت تلے دو اجنبیوں کی طرح رہے تھے۔ اب شہرام بھی اسے مسلسل نظرانداز کرنے کی پالیسی اپنائے ہوئے تھا۔ انابیہ اس بات پر شکر کرتی تھی کہ اس نے غصے اور ضد میں آکر انتقام کی کوئی اور راہ نہیں اپنائی تھی۔ اگر اس کی فطرت کے ہرجائی پن کو نظرانداز کردیا جاتا تو وہ بظاہر بہت ڈیسنٹ اور سلجھی ہوئی عادات کا مالک تھا۔

انابیہ اسے یاد کرنا نہ چاہ رہی تھی مگر لاشعوری طور پر اسی کو سوچے جاتی تھی۔ سب گھر والوں کو وہ باقاعدگی سے فون کرتا مگر انابیہ کے سیل فون پر اس کی کبھی کوئی کال نہ آئی۔ اسے خود پر شدید غصہ آتا تھا کہ وہ اس کے کسی میسج یا کال کا انتظار ہی کیوں کر رہی ہے۔ غصے کی جس آگ میں جلتے ہوئے وہ اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی، آخر وہ آگ سرد کیوں پڑتی جارہی

تھی۔ شہرام کا جرم ابھی بھی اس کی نظر میں ناقابل معافی تھا پھر اسے کیوں لگتا تھا کہ جو سزا اس نے شہرام کے لیے منتخب کی ہے' اس کی اذیت شہرام سے زیادہ اسے بھگتنی پڑ رہی ہے۔ ابھی تو اس نے شہرام کے ساتھ فقط دس دن گزارے تھے پھر کیوں اس کا دل موم کی طرح پگھلتا جا رہا تھا۔

ہر روز لب بے جواب میں بھوری آنکھوں والا ہنستا مسکراتا شہرام نظر آتا تھا وہ ایسی ہی ایک رات تھی جب دروازے کی زوردار دستک پر اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس ٹائم کون دروازہ بجا سکتا تھا۔ اسے تھوڑا ڈر لگا تھا۔ اتنے میں دوبارہ دروازہ بجا تھا' ساتھ ہی شہرام کی آواز بھی سنائی دی۔ انابیہ نے لپک کر دروازہ کھولا تھا۔

"کیسے گھوڑے بیچ کر سوتی ہو تم۔ کب سے دروازہ بجا رہا تھا۔" وہ خفگی سے کہتا کمرے میں داخل ہوا۔

"آپ اچانک کیسے۔ تائی جان نے تو نہیں بتایا تھا کہ آپ کے آنے کا کوئی پروگرام ہے۔" انابیہ نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

شہرام نے ایک تیکھی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی مگر جواب دینے کی زحمت نہ کی۔ انابیہ کو اپنے لہجے کی حلاوت پر خود ہی غصہ آگیا۔ ضرورت ہی کیا تھی اس شخص کے منہ لگنے کی۔ وہ دوبارہ بستر میں گھس گئی تھی لیکن اب دوبارہ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ شہرام نے سفری بیگ صوفے پر رکھا۔ سائیڈ ٹیبل پر دھرے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ صوفے پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پانی پیا پھر موبائل ہاتھ میں لے کر چارجر کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔

"میرا چارجر کہاں ہے؟" آخر انابیہ سے ہی پوچھنا پڑا تھا۔

"یمین بھابھی کے فون میں بھی وہی چارجر لگتا ہے۔ ان کو اپنے والا نہیں مل رہا تھا' میں نے آپ کا دے دیا۔" انابیہ نے اس بار سپاٹ سے انداز میں ہی جواب دیا۔ شہرام نے گہری سانس اندر کھینچی تھی پھر دروازے کی سمت بڑھا۔

"آپ رات کے اس پہر ان سے چارجر لینے جائیں گے۔" انابیہ اچھل ہی تو پڑی۔ دروازے کی ناب گھماتے گھماتے شہرام پلٹا تھا۔

"اتنا پاگل نہیں ہوں کہ اس ٹائم یمین بھابھی کو جگا کر ان سے چارجر مانگوں۔ امی کو جگانے جا رہا ہوں۔ سخت بھوک لگی ہے مجھے۔ امی کھانا دے دیں گی۔"

"اس ٹائم تائی جان کو بے آرام کریں گے پھر کہہ رہے ہیں اتنا پاگل نہیں ہوں میں۔" انابیہ نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔

"تو کیا بھوکا سو جاؤں۔" وہ تنک کر بولا تھا۔

"ویسے تو ایک رات بھوکا سونے سے بھی بندہ فوت نہیں ہو جاتا۔ لیکن دیتی ہوں کھانا۔" انابیہ جیسے اس کی سات پشتوں پر احسان کرتے ہوئے اٹھی تھی۔

"روٹی بنانا سیکھ لی؟" شہرام نے یقیناً طنز ہی کیا تھا وہ بنا جواب دیے کمرے سے نکل گئی تھی۔ شہرام نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا لیا ایک بے بس سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ دل بھی انسان کو کیسے کیسے خوار کرواتا ہے۔ اس لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کو آج دل اتنا بے تاب ہوا کہ وہ بنا کسی پروگرام کے اچانک گاؤں کے لیے نکل پڑا۔ تھکاوٹ سے اس کا جسم چور چور ہو رہا تھا۔ رات کی ڈرائیونگ اسے ہمیشہ ہی بہت مشکل لگتی تھی مگر آج یہ مشکل کام اس نے برضا و رغبت کیا تھا۔

صوفے سے سر ٹکائے ٹکائے ہی اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ برتنوں کی کھٹر پٹر سے آنکھ کھلی۔ انابیہ جہازی سائز بیڈ کے ایک سرے پر دسترخوان بچھا کر کھانا چن رہی تھی۔

"اب آ بھی جائیں' بھوک بھوک کا شور مچا رہے تھے اور بنا کھانا کھائے سو بھی گئے۔" شہرام نے تھکاوٹ اور نیند سے بوجھل ہوتی سرخ سرخ آنکھوں سے انابیہ کو گھورا پھر ہاتھ دھونے واش روم چلا گیا۔ انابیہ صوفے پر جا بیٹھی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" شہرام کھانے بیٹھا تو ہاٹ پاٹ میں سے روٹی سے ملتی جلتی چیز نکال کر حیرت سے استفسار

گیا۔
"یہ صحیح نہیں لگ رہی تو دوسری کھالیں۔ اس کے کنارے اتنے موٹے نہیں ہیں اور گول بھی ہے۔"
انابیہ کے کہنے پر اس نے دوسری روٹی نکالی تھی۔ اس روٹی کے کنارے واقعی زیادہ موٹے نہیں تھے، پہلی لمبوتری سی روٹی کی نسبت وہ واقعی بیضوی شکل کی روٹی تھی۔ شہرام وہ کھا بھی لیتا اگر وہ اس بری طرح جلی نہ ہوتی۔"
"امی نے تمہیں ابھی تک روٹی بنانا بھی نہیں سکھائی۔" وہ خاصی بے چارگی سے پوچھ رہا تھا۔
"کھیر پکوائی سے پہلے تائی جان مجھ سے روٹی ایسے پکواتی ہیں۔" اس نے جیسے شہرام کی عقل پر تاسف کا اظہار کیا۔
"امی کو مشورہ دوں گا کہ کھیر پکوائی کے بعد بھی تم سے روٹی پکوائی مت کروائیں۔" وہ صاف صاف مذاق اڑا رہا تھا۔
"زیادہ نخرے آرہے ہیں تو مت کھائیں' ایک تو اتنی زور سے میرا ہاتھ جل گیا' اوپر سے مجھے آپ کی باتیں بھی سننا پڑ رہی ہیں۔"
رونے والی بات نہیں تھی مگر جانے کیوں انابیہ کو بری طرح رونا آگیا۔ شہرام گھبرا کر اٹھا تھا۔
"دکھاؤ ہاتھ۔" وہ اس کے قریب بیٹھا پھر خود اس کی کلائی تھام کر معائنہ کیا۔
"یہ والا جلا ہے۔" انابیہ نے دائیں ہاتھ کی کلائی اس کے سامنے کی بہت بری طرح نہ سہی مگر جلنے کا نشان واضح تھا۔
"ایک دم پھوہڑ لڑکی ہو تم اور برنال وغیرہ کیوں نہ لگائی۔" وہ ڈانٹتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ انابیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو بس بے تحاشا امڈنے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شہرام اٹھ کر واش روم تک گیا تھا۔ وہ وہاں سے ٹوتھ پیسٹ اٹھا لایا' بنا اسے مخاطب کیے اس نے انابیہ کی کلائی تھامی تھی اور جلی ہوئی جگہ پر ٹوتھ پیسٹ کا لیپ سا کر دیا۔ جلی ہوئی جلد میں ٹھنڈک سی اتر گئی تھی پھر بھی اس کے آنسو نہ رکے تھے۔
"اب اتنی تکلیف بھی نہیں ہو رہی ہوگی انابیہ! پھر ایسے کیوں رو رہی ہو۔" وہ اس پر خفا ہوتے ہوئے بولا۔
"پاگل ہوں اس لیے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔
شہرام خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر دسترخوان سمیٹ کر کچھ برتن سائیڈ ٹیبل پر اور کچھ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیے۔ انابیہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے لحاف میں گھس گئی۔ ابھی بے آواز آنسوؤں نے بہت دیر تک اس کا تکیہ بھگونا تھا۔

☆ ☆ ☆

عجیب سی یاسیت نے اس کے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا۔ شہرام کو واپس گئے کئی روز ہو چکے تھے۔ وہ اسے سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی سوچے ہی جاتی۔ کبھی سوچتی کہ کاش اس روز وہ علیزہ کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی اسٹڈی تک نہ جاتی تو آج زندگی میں یہ بے سکونی اور خالی پن نہ ہوتا۔ بھلے سے شہرام علیزہ سے بے وفائی کرلیتا مگر یہ بات اس کے علم میں نہ آتی۔ شہرام جب اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا تو وہ فوراً "اس محبت پر ایمان لے آتی مگر اگلے ہی پل ایسی سوچوں پر وہ خود کو لتاڑ رہی ہوتی' ایک دھوکے باز اور ہرجائی شخص اس کی زندگی کا حصہ تو بن گیا تھا مگر وہ اسے اپنے دل میں کوئی جگہ نہ دینا چاہتی تھی۔ ہاں' وہ اس کے دل میں نہیں نہ بستا تھا وہ اس بارے میں پر یقین تھی مگر وہ اپنے دل میں جھانکنے سے ڈرتی بھی تھی۔
وہ اپنا دھیان بٹانے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ کبھی دادا جان کے پاس جا کر ان سے پچھلے وقتوں کے قصے سنتی۔ مرحومہ دادی کی باتیں' پاپا اور تایا جان کی بچپن کی شرارتیں۔ کبھی سیمن بھابھی کے پاس بیٹھتی تو وہ شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ اپنی اور شہریار کی محبت کے قصے سنانے لگتیں۔
یونیورسٹی لائف کی باتیں۔ کیسے ان کی محبت کی

شروعات ہوئی ہے۔ بینہ بھابھی نے اپنے گھر والوں کو
شہریار بھائی کے لیے قائل کیا۔ ان کے پاس سنانے کو
بہت سے قصے تھے اور انابیہ کے پاس بہت سا فارغ
وقت۔ اور پھر بھی انابیہ، میمونہ سے کوکنگ سیکھنے کے
درپے ہو جاتی۔ ہانڈی پکانے میں وہ پھر بھی زیادہ دلچسپی
نہ لیتی تھی۔ ہاں کسی طرح تائی جان جیسی گول روٹی بنانا
وہ بھی سیکھ جائے اسی کوشش میں لگی رہتی۔ لیکن پھر
اس کا سب کاموں سے جی اچاٹ ہونے لگا۔ اس کی
طبیعت پر چھائی مردنی سب کے نوٹس میں آنے لگی۔

"کیا بات ہے بیٹا۔ اتنا چپ چپ کیوں رہنے لگی
ہو۔" تایا، تائی کے بعد جب دادا نے بھی یہی استفسار
کیا تو اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ
پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"اس گدھے کا نمبر ملاؤ۔ اس سے کہوں گا کہ فوراً
آئے اور تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے کر جائے۔"

"مجھے گھر یاد آ رہا ہے دادا جان۔" وہ روتے روتے
بھی ترنت بولی تھی۔

"تو پھر ملاؤ اپنے باپ کا نمبر۔ وہ بھی کم گدھا نہیں
ہے۔ دونوں میاں بیوی ہر دس دن بعد تم سے ملنے
یہاں پہنچ جاتے ہیں انہیں تمہارے احساسات کی پروا
ہی نہیں۔ شادی کے بعد لڑکی کا دل صرف ماں، باپ
سے ملنے کے لیے ہی اداس نہیں ہوتا اسے اپنا گھر، گھر
کی چیزیں، اپنا کمرہ سب یاد آتا ہے۔ کہتا ہوں مصطفیٰ
سے کہ آئے اور تمہیں ساتھ لے جائے۔ کچھ دن گھر
گزار آؤ تو دل بہل جائے گا۔" دادا جان مشفقانہ انداز
میں بولے تھے اتنے میں شہریار وہاں آنکلا۔

"ارے ارے یہ بن موسم کی برسات کیوں ہو رہی
ہے۔" وہ ٹھٹھک کر رکا۔

"گھر یاد آ رہا ہے۔ میں مصطفیٰ کو فون کرنے لگا ہوں
کہ پہلی فرصت میں آئے اور انابیہ کو ساتھ لے
جائے۔" دادا جان نے بتایا تھا۔

"یہ بھی کوئی پریشان ہونے والی بات ہے۔ میں صبح
خود چھوڑ آؤں گا۔" شہریار نے پیار سے اس کا سر تھپکا
تھا۔ وہ سب واقعی اس سے محبت کرتے تھے اس بار
اس کی آنکھیں سب کی محبت پر نم ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

گھر آ کر واقعی اس کا دل بہل گیا تھا۔ سب سے پہلے
تو علیزہ نے ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"کب سے تمہاری منت کر رہی تھی کہ شہر کا چکر
لگالو۔ مجھے تمہارے ساتھ شاپنگ کرنی ہے اور ڈھیروں
کام ہیں جنہیں نمٹانے کے لیے تمہارا ساتھ درکار ہے
اور تمہارا وہاں اتنا دل لگا کہ یہاں آنے کا نام ہی نہ لے
رہی تھیں۔" علیزہ خفا ہو رہی تھی۔

"اب آ گئی ہوں نا۔ کاموں کی لسٹ بناؤ۔ سارے
کام نمٹا کر جاؤں گی۔" اس نے اسے تسلی دی تھی اور
پھر واقعی اس کا آدھا دن اپنے گھر تو آدھا عمہ پھوپھو
کے ہاں گزرتا۔

اس روز بھی وہ علیزہ کے ساتھ شاپنگ پر نکلی
تھی۔ خوب تھک ہار کر وہ دونوں "مصطفیٰ ہاؤس"
لوٹے۔

"لگتا ہے مہد اور موحد بھی یہاں پہنچے ہوئے
ہیں۔" لان میں برپا ہونے والا شور شرابا گیٹ کے باہر
بھی سنا جا سکتا تھا۔

"فٹ بال کا میچ ہو رہا ہوگا آج کل ہمارے بھائیوں
کو فٹ بال کا جنون چڑھا ہوا ہے۔" انابیہ مسکرا کر
بولی۔

اس کا اندازہ درست تھا اندر فٹ بال میچ جاری تھا
لیکن لان میں ایک دراز قد کھلاڑی ایسا بھی تھا جس کی
موجودگی کی توقع وہ کر ہی نہ سکتی تھی۔

"شہرام۔ واٹ آ سرپرائز۔" انابیہ سے پہلے علیزہ
پرجوش ہو کر چیخی۔ شہرام نے گردن موڑ کر دونوں کو
دیکھا، مسکرایا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے فٹ بال کو
زوردار کک لگائی تھی وہ شاید پینلٹی اسٹروک لینے کھڑا
تھا۔ ان دونوں کی آمد سے گول کیپر بنے موحد کی توجہ
ہٹی تھی جس کا اس نے فائدہ اٹھالیا۔

"یہ فاؤل ہے شہرام بھائی۔!" موحد اور سلمان چیخنے
لگے۔

"کوئی فاؤل نہیں۔ میں نے مقابلہ برابر کر دیا۔"

"دو چھوٹوں کو ایک ٹیم میں ڈال کر تم ان سے مقابلہ کر رہے تھے۔ آئندہ ٹیم بناتے وقت یہ بے ایمانی مت کرنا۔" شہرام نے سلمان کے بال بکھیرے تھے۔ پھر علیزہ اور انابیہ کی طرف بڑھ آیا۔

"مجھے دیکھ کر میری مسز ہمیشہ ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہیں۔ سلام تک کرنا بھول جاتی ہیں۔ السلام علیکم زوجہ محترمہ۔ اینڈ بیسٹ فرینڈ آف زوجہ محترمہ۔" وہ شرارت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"صرف تمہاری زوجہ محترمہ کی ہی بیسٹ فرینڈ نہیں ہوں۔ کسی زمانے میں تمہاری بھی بیسٹ فرینڈ تھی۔ تم نے تو مجھے ایسے بھلایا کہ مجھے یقین ہی نہیں آتا۔ نہ کوئی فون' نہ میسج' پھر اگر تمہاری شادی انابیہ سے نہ ہوئی ہوتی تو میں یہی سمجھتی کہ بیوی آنے کے بعد تم نے آنکھیں بدل لی ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری اس طوطا چشمی کو کیا نام دوں۔"

علیزہ اس پر بگڑ رہی تھی۔ بے تکلفی کا وہی پرانا انداز۔ انابیہ چاہ کر بھی اس کے لہجے میں کسی قسم کی ذو معنویت محسوس نہ کر سکی۔ شہرام بھی اسے ہنستے ہوئے چھیڑ رہا تھا۔ اس وقت وہ صرف اچھے دوست لگ رہے تھے۔ اگر شہرام کو ڈھیٹ تصور کر بھی لیا جاتا تو علیزہ کے اتنے نارمل بی ہیویر وہ پھنس جاتے میں ذاتی۔

انابیہ نے اسے شہرام کے سامنے' شہرام کے ہی لیے بہت بلک کر روتے دیکھا تھا۔ شادی کی تمام تقریبات میں علیزہ کی بھیگی پلکیں انابیہ کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ پائی تھیں' لیکن وہ جب بھی شہرام کو مخاطب کرتی تھی تو اس کا لہجہ اور انداز بالکل نارمل ہوتا۔ کوئی شخص اتنی شاندار اور جاندار ایکٹنگ کیسے کر سکتا تھا۔ انابیہ کا دماغ بری طرح الجھ رہا تھا۔

"کھڑے کھڑے کہاں کھو جاتی ہو۔ چچی جان آواز دے رہی ہیں۔" شہرام نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔ وہ جیسے یکدم چونکی' علیزہ پہلے ہی رہائشی حصے کی جانب بڑھ چکی تھی وہ بھی شہرام کی معیت میں آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"اور ہونا شہرام۔ یہ پالک پنیر تو خصوصاً" تمہارے لیے ہی بنایا ہے۔ تمہیں بہت پسند ہے نا۔" داماد پہلی بار گھر آیا تھا اور عفیفہ اسے فل پروٹوکول دے رہی تھیں۔

"کھانا بہت لاجواب بنا ہے چچی جان! بہت دن بعد اتنا سیر ہو کر کھایا ہے اور روٹیوں کا تو جواب ہی نہیں۔ کیسی گول روٹی ہے' کنارے بھی موٹے نہیں اور جلی ہوئی تو بالکل نہیں۔" اس نے سامنے پڑی چنگیر میں سے ایک روٹی اٹھا کر بے ساختہ تعریف کی۔

"لاہور میں بازار کی روٹی کھانا پڑتی ہوگی نا' اسی لیے گھر کی روٹی کی قدر آ رہی ہے۔" عفیفہ مسکرائی تھیں۔

"نہیں۔ گھر والی کی روٹی یاد آ گئی تھی' اسی لیے اس روٹی کی قدر آ رہی ہے۔" وہ بڑبڑایا تھا مگر بڑبڑاہٹ اتنی بلند ضرور تھی کہ ساتھ والی چیئر پر بیٹھی انابیہ کی سماعتوں تک باآسانی پہنچ گئی تھی۔

"مما! یہ پائے والا ڈونگا بھی تو ادھر کیجیے نا۔ شہرام کو بکرے کے سری پائے بھی بہت پسند ہیں۔" انابیہ نے بات فوری بدل لیا تھا۔

"ارے نہیں نہیں۔ میں پہلے ہی بہت کھا چکا۔ یہ پھر کبھی۔" شہرام نے فوراً منع کرنا چاہا۔

"تھوڑا سا تو ٹرائی کیجیے شہرام۔ مما کے ہاتھوں کی بنی نرم نرم روٹی پائے کے شوربے میں بھگو کر کھائیں گے تو کھانے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔" انابیہ نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا۔ شہرام بس اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ناراض تم
ناراض ہم
کیسے مٹیں یہ دوریاں
ہم منتظر
تم بے خبر

دونوں کی ہیں مجبوریاں

گاڑی میں دھیمے سروں میں جنید جمشید کا بہت پرانا گانا چل رہا تھا۔ وہ شہرام کے ساتھ واپس گاؤں جا رہی تھی۔ یہ شہرام کے ساتھ اس کا پہلا سفر تھا۔ بظاہر اس کی توجہ باہر کے نظاروں پر تھی لیکن اگر اس سے چند سیکنڈ پہلے گزرنے والے منظر کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکتی۔ "ناراض" سونگ ختم ہوا تو جنید کا ہی ایک اور گانا چل پڑا تھا۔

دل، دروازہ کھولے کب سے کھڑا ہوں
آ، میرے مہمان تو
گھر میں اندھیرا کیسے کب سے پڑا ہوں
چاند، ستارے لیے تو
او میرے دل کی پہلی دھڑکن

"کتنا سفر باقی رہ گیا ہے شہرام۔" انابیہ نے گاڑی میں چھایا فسوں توڑنا چاہا تھا۔ شہرام نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے؟" وہ اس کی نگاہوں کی تپش سے تھوڑا جزبز ہوئی تھی۔

"میں نے بھی کچھ پوچھا تھا۔ پہلے اس کا جواب تو دو۔" شہرام نے اسے سنجیدگی سے مخاطب کیا تھا۔

"آپ نے کب پوچھا۔؟" وہ حیران ہوئی۔

"میں یہ دوریاں مزید نہیں سہہ سکتا انابیہ۔ پلیز خود کو اور مجھ کو مزید سزا مت دو۔" وہ بے چارگی بھرے لہجے میں بولا تھا۔ انابیہ کچھ لمحوں کے لیے کچھ نہ بول سکی تھی۔

"میں یقین کر ہی نہیں سکتا انابیہ کہ تم نے مجھ سے جو بندھن جوڑا ہے، وہ زبردستی کا بندھن ہے ہاں لیکن جب تم نے مجھے یہ بتایا تھا تو میں نے اپنے جذبوں کی سخت توہین محسوس کی تھی، میری انا نے گوارا ہی نہ کیا کہ میں دوبارہ تم سے اس موضوع پر بات کروں۔ آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہوا کہ محبت اور انا اکٹھے چل ہی نہیں سکتے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ تم سے میری محبت بڑھتی جا رہی ہے اور انا۔" وہ دل شکستہ انداز میں ہنسا۔

"انا کا کوئی وجود ہوتا تو میں اس وقت اتنے عاجزی بھرے انداز میں تم سے مخاطب نہ ہوتا۔" شہرام کی بات سن کر بھی انابیہ بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی رہی۔

"میں تم سے یہ سوال نہیں کروں گا انابیہ! کہ تم نے ماضی میں میرے ساتھ وہ رویہ کیوں اختیار کیا تھا۔ ہو سکتا ہے تمہارا جواب میری مردانہ انا کو گوارا نہ ہو۔ بس ہم ماضی کو فراموش کر دیتے ہیں اور ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہیں۔ میں فی الحال تم سے تمہاری محبت نہیں مانگ رہا بس تم میری محبت کا یقین کر لو۔ میں تمہیں خود محبت کرنے کا ہنر سکھا دوں گا۔"

شہرام بول رہا تھا اور انابیہ اپنے دل کے دروازے بند کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ اسے خود کو یاد دلانا پڑا تھا کہ وہ شخص باتوں کا بہت بڑا کھلاڑی ہے۔

"خاموش کیوں ہو۔ کچھ تو بولو۔" شہرام کے انگ انگ سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

"میں آپ کی محبت کا اعتبار کروں شہرام اور کچھ عرصے بعد آپ محبت کا کوئی اور جزیرہ دریافت کر لیں۔ میں آپ کو آپ کی محبت یاد دلاؤں تو آپ کہیں کہ وہ محبت نادانی اور حماقت کے سوا کچھ نہ تھی۔" ایک زہر خند مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اس نے شہرام کو مخاطب کیا۔

شہرام کا پاؤں یک لخت بریک پر جا پڑا تھا۔

"اس بکواس کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں۔" وہ مسلسل اس کے جذبوں کی توہین کر رہی تھی۔ طیش میں آنا فطری امر تھا۔ انابیہ کو اس کے غصے سے زیادہ اس کی ڈھٹائی پر تعجب ہوا تھا۔ کوئی اور شخص ہوتا تو اتنا کھلا طنز سن کر گڑبڑا کر رہ جاتا۔ وہ اس کے ماضی سے واقف تھی، یہ جان کر بھی اس کے چہرے کا رنگ نہ بدلا تھا۔ اس کے چہرے پر صرف بے تحاشا غصہ اور دکھ جھلک رہا تھا۔

"گاڑی چلائیں شہرام! پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس نے اکتا کر شہرام کو مخاطب کیا۔ اس نے بنا کچھ مزید کہے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ باقی کا پورا سفر

دو لب بھینچے ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر وہی بے کیف دن تھے اور بے چین راتیں۔
شہرام لاہور چلا گیا تھا اور اس بار آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ گھر والے اس سے سخت خفا تھے وہ آخر انابیہ کو اپنے پاس کیوں نہیں بلوا رہا۔

"میری جاب بہت ٹف ہے امی۔ کوئی اسپیسفک ڈیوٹی آورز نہیں۔ انابیہ یہاں اکیلی کیسے رہ پائے گی۔"
ہر بار اس کا بہانہ یہ ہی ہوتا۔

"تو ٹھیک ہے کچھ دنوں کے لیے میں انابیہ کے ساتھ آجاتی ہوں۔ اس کا دل لگ جائے گا تو میں واپس آجاؤں گی۔" میمونہ اب اس کا کوئی عذر سننے کو تیار نہ تھیں۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ بس کچھ دنوں کی مہلت دے دیں۔ ایک بہت اہم پراجیکٹ چل رہا ہے وہ مکمل ہو جائے تو پھر میں آتا ہوں تب اس موضوع پر بات کریں گے۔" شہرام نے ماں کو پھر ٹال دیا تھا۔

فون بند ہونے کے بعد بھی میمونہ دیر تک بڑبڑاتی رہی تھیں۔ پاس بیٹھی انابیہ کے دل پر بوجھ مزید بڑھ گیا تھا۔ شہرام اس پر کوئی بات نہ آنے دے رہا تھا وہ خود ماں' باپ اور دادی کی ناراضی کا سامنا کر رہا تھا لیکن آخر وہ کب تک بہانے بنا کر سب کو ٹال سکتا تھا۔ یہ سوچ انابیہ کے دماغ کو مزید الجھانے کا باعث بن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مصطفیٰ ماموں کے دوست ڈاکٹر خالد اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے ہاں کے دو چکر لگا چکے ہیں۔"
انابیہ نے علیزہ کی خیر خیریت لینے کو فون کیا تو اس نے روہانسی ہو کر اطلاع دی تھی۔ ڈاکٹر خالد کا شمار مصطفیٰ کے بہت ہی قریبی دوستوں میں ہوتا تھا۔ دونوں کی فیملیز کا بھی ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا اس لیے علیزہ کی بات سن کر انابیہ کو کوئی تعجب نہ ہوا۔
آنٹی روزینہ بہت جلد دوستیاں گانٹھنے والی خوش مزاج خاتون تھیں ضرور انہوں نے ناعمہ پھوپھو سے بھی دوستی گانٹھ لی ہو گی اور ان سے ملنے ان کے گھر چلی گئی ہوں گی۔ ناعمہ پھوپھو کا گھر مصطفیٰ ہاؤس سے زیادہ دور تھوڑی تھا اور یہ ہی بات اس نے علیزہ سے بھی کہہ دی تھی۔

"صرف تمہاری روزینہ آنٹی ہی نہیں آئیں۔ ان کے ساتھ ان کے ہسبنڈ اور ان کا وہ لمبو ڈاکٹر بیٹا بھی ہوتا ہے۔" علیزہ نے جل بھن کر بتایا تھا۔

"اسامہ بھائی کی بات کر رہی ہو۔" انابیہ کو ڈاکٹر اسامہ کے لیے لمبو ڈاکٹر کی اصطلاح سن کر خوب ہی ہنسی آئی تھی۔

"ہنس لو' اڑا لو مذاق۔ یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ مجھے اس لمبو ڈاکٹر کے ارادے نیک نہیں لگتے۔ سب سے نگاہیں بچا کر وہ مجھے خوب ہی گھورتا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی چپکی رہتی ہے۔ میرا بس نہیں چلتا اس بندے کو اٹھا کر اپنے ڈرائنگ روم سے باہر پھینک دوں۔" علیزہ سخت چڑی بیٹھی تھی۔

"ہائے اللہ علیزہ! ایسے تو مت کہو۔ اگر میں خود اسامہ بھائی کو اچھی طرح نہ جانتی ہوتی تو تمہاری باتیں سن کر کسی چھچھورے سے بندے کا خاکہ قائم کرتی۔ وہ تو بہت ڈیسنٹ اور ڈیشنگ سے شخص ہیں۔" انابیہ نے ڈاکٹر اسامہ کی وکالت کی تھی۔

"وہ بھلے سے ہوتا رہے ڈیسنٹ اور ڈیشنگ لیکن اس کی فیملی کی بار بار آمد مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی ہے۔ میں پڑھ لکھ کر اپنا کیریر بنانا چاہتی ہوں اگر ان لوگوں کی طرف سے کوئی ایسا ویسا سلسلہ شروع ہو گیا تو میرا کیا بنے گا۔" علیزہ سخت تشویش میں مبتلا ہو رہی تھی۔

"اچھا تم فکر مت کرو میں مما سے پوچھتی ہوں کہ کیا چکر ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب تمہارا وہم ہو۔ خالد انکل پاپا کے بہت اچھے دوست ہیں ہو سکتا ہے بس اسی لیے وہ لوگ پاپا سے ملنے گھر آتے ہوں تو تم لوگوں کی طرف بھی چکر لگا لیتے ہوں آخر ناعمہ پھوپھی سگی بہن ہیں پاپا کی۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔" علیزہ نے ٹھنڈی سانس بھری

تھی۔ لیکن آئندہ آنے والے دنوں نے ثابت کر دیا کہ علیزہ کے خدشے بے بنیاد نہیں تھے۔ ڈاکٹر خالد نے واقعی اپنے لائق فائق ڈاکٹر بیٹے کے لیے علیزہ کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ اور آج کل ثاقب پھوپھا اپنی فیملی میں اس حوالے سے صلاح مشورے کرنے میں مصروف تھے۔ امید تھی کہ جلد ہی یہ بیل منڈھے چڑھ جائے گی۔

☆ ☆ ☆

رات کافی دیر تک بھی جب بستر پر کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند مہربان نہ ہوئی تو وہ اٹھ بیٹھی۔ آج شام کو ہی دادا جان کی اسٹڈی سے الطاف فاطمہ کا ناول اٹھا لائی تھی اب اسی کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اتنے میں سائیڈ ٹیبل پر دھرا موبائل گنگنایا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ سکرین پر شہرام کالنگ کے الفاظ دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ یہ اس کے سیل پر آنے والی شہرام کی پہلی کال تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے کال ریسیو کی تھی۔

"یہ ڈاکٹر اسامہ کا کیا حدود اربعہ ہے۔ تم جانتی ہو اسے؟" اس کے سلام کا جواب دے کر شہرام نے پہلا سوال یہ ہی پوچھا تھا۔ انابیہ جانے اس کے لبوں سے کیا سننے کی متمنی تھی اس کے ارمانوں پر اوس سی پڑ گئی۔

"پاپا کے بہت اچھے دوست ہیں خالد انکل۔ اسامہ بھائی ان ہی کے بیٹے ہیں۔" اس نے مختصراً" جواب دیا۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ بندہ کیسا ہے۔ کیسی عادتیں ہیں کیا وہ ہماری علیزہ کو ڈیزرو کرتا ہے؟" شہرام کے پوچھنے پر پھیکی سی مسکراہٹ انابیہ کے لبوں پر پھیل گئی۔ علیزہ کے لیے شہرام کا اتنا حساس ہونا اس کے گلٹ کو ظاہر کرتا تھا۔

"بظاہر اسامہ بھائی کی شخصیت میں کوئی خامی نہیں۔ پاپا بھی ان کے متعلق ہر طرح کی گارنٹی دینے کو تیار ہیں۔ خالد انکل پاپا کے اتنے اچھے دوست ہیں کہ ان کے گھر یا ان کے بچوں کی کوئی بات پاپا سے چھپی ہوئی نہیں ہو سکتی۔" اس نے شہرام کی تسلی کروائی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ بس یہ ہی پوچھنا تھا۔" شہرام نے لائن منقطع کر دی اور وہ کتنی دیر تک بے جان ہاتھوں میں سیل فون لیے بیٹھی رہی۔

☆ ☆ ☆

تایا جان' دادا جان اور ثاقب پھوپھا کی فیملی کے دو چار بندے ڈاکٹر اسامہ سے مل کر اس کے حق میں فیصلہ دے چکے تھے۔ خالد انکل کی فیملی کی خواہش پر باضابطہ منگنی کی رسم ادا کی جارہی تھی۔ انابیہ کے پاس علیزہ کے فون پر فون آرہے تھے۔ وہ اسے فوراً" اپنے پاس بلا رہی تھی۔ باقی لوگوں نے رسم سے ایک دن پہلے ہی پہنچنا تھا مگر وہ دادا جان اور ڈرائیور کے ہمراہ چار' پانچ دن پہلے ہی مصطفیٰ ہاؤس چلی گئی تھی۔ دادا جان تو فوراً" ہی بیٹی اور نواسی سے ملنے چلے گئے۔ اس کا کچھ ٹھہر کر جانے کا ارادہ تھا۔

"ماموں جان اس دفعہ آپ کی بیٹی میری مہمان ہے اس لیے برائے مہربانی اسے بیگ سمیت ہمارے گھر چھوڑ جائیے۔" علیزہ نے مصطفیٰ کو فون کھڑکا دیا تھا۔ حکم کی فوری تعمیل کر دی گئی تھی۔ ناعمہ کو بھی بھتیجی کی آمد سے خاصی ڈھارس ملی تھی۔

"بازاروں کی خاک چھاننے سے غنی کی بھی جان جاتی ہے اور میری بھی۔ اب تم آگئی ہو تو اپنی سہیلی کی شاپنگ خود ہی نمٹاؤ۔" ناعمہ نے شاپنگ کا ڈیپارٹمنٹ اس کے سپرد کر دیا۔

"میں کہتی تھی نا تم سے 'اس گھونچو ڈاکٹر کی نیت میں فتور ہے ایسے ہی تو گھوریاں نہیں مارتا تھا مجھے۔" رات کو جب تنہائی میسر آئی تو علیزہ نے اس کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"شہرام کا فون آیا تھا۔ اسامہ بھائی کے متعلق انویسٹی گیشن کر رہے تھے۔ پوچھ رہے تھے کہ وہ بندہ تمہیں ڈیزرو کرتا بھی ہے یا نہیں۔" انابیہ علیزہ کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے

دھیرے سے بولی تھی۔ علیزہ کے چہرے پر زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں نے شہرام جیسے مخلص دوست کو بہت ستایا ہے، ابویں اتنے دن اسے ٹینشن میں مبتلا رکھا۔ اسے تسلی دے دینا کہ اسامہ واقعی بہت اچھا بندہ ہے، امید ہے وہ علیزہ کے دل کو پھر سے دھڑکنا سکھا دے گا۔"

علیزہ دھیرے سے بولی تھی۔ انابیہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے تکنے لگی۔ وہ علیزہ سے اس قسم کی بات کی ہرگز توقع نہ کر رہی تھی۔ کیا علیزہ کو علم تھا کہ انابیہ کو سب پتا ہے، وہ کتنی آسانی سے اس کے سامنے اظہار کر گئی تھی۔

"اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو، کیا شہرام نے آج تک تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ وہ تو تمہیں اپنی زندگی کہتا ہے، تم سے کب کوئی بات چھپائی ہو گی۔" علیزہ مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب تھی۔ انابیہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ علیزہ اب آگے کیا کہنے لگی تھی وہ دم سادھے اس کی بات سننے لگی۔

"پھر تو واقعی شہرام بہت وفادار اور با اعتماد دوست ثابت ہوا ہے، اسے دوستی نبھانے پر سو بٹا سو نمبر ملنے چاہییں۔" علیزہ نے شہرام کی تعریف کی۔ انابیہ اسے نا سمجھی سے تکنے لگی۔

"لیکن شاید میں اتنی اچھی دوست نہیں ہوں۔ کہنے کو تو تمہیں اپنا بیسٹ فرینڈ کہتی ہوں، لیکن اپنی زندگی کا ایک گوشہ تم سے بھی چھپایا۔" علیزہ نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے خود کلامی سی کی۔

"لیکن آج مجھے تمہاری ضرورت ہے انابیہ! مجھے ایسا کندھا چاہیے جس پر سر رکھ کر میں اپنی گزشتہ محبت کے لیے سارے آنسو بہاؤں، شہرام صحیح کہتا تھا، وہ محبت بچپن کی حماقت کے سوا کچھ نہ تھی لیکن میرے دل میں اس محبت کی جڑیں بہت دور دور تک پھیل چکی تھیں۔" علیزہ کے آنسو گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ وہ اس وقت خود اذیتی کی انتہائی پر تھی اس کی کھوئی کھوئی باتوں میں ربط نہ تھا لیکن انابیہ کا رواں رواں اس کی طرف متوجہ تھا۔

"شہرام نے بہت بچپن میں کبھی مرتضیٰ ماموں اور میمونہ پھوپھو کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ باتیں میرے اور شہریار کے مستقبل سے متعلق تھیں۔ میں میمونہ پھوپھو کی بھتیجی بھی تھی اور ایک لحاظ سے بھانجی بھی۔ وہ مستقبل میں میرے ساتھ تیسرا رشتہ جوڑنے کی خواہشمند تھیں۔ مرتضیٰ ماموں تو خیر میرے پیارے ماموں تھے ہی، بیوی کی بات پر انہیں کیا اعتراض ہوتا تھا انہوں نے ہنستے ہنستے پھوپھو کی تجویز کی تائید کر دی۔

کاش شہرام اس روز اپنے امی ابو کی وہ باتیں نہ سنتا۔ وہ میرا بچپن سے ہی بہت اچھا دوست تھا۔ شہریار بھائی اور میرے رشتے کے متعلق ماموں اور پھوپھو نے جو بھی باتیں کیں، وہ شہرام نے مجھے من و عن بتا دیں۔ کچی عمر میں جو خواب آنکھوں میں بس جائیں، وہ اتنی آسانی سے انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ یہ جان کر کہ مجھے شہریار کی زندگی کا حصہ بننا ہے، میں شہریار کو چاہنے لگی۔ شہرام بھی اس حوالے سے مجھے خوب ہی چھیڑتا مگر وہ میری نسبت جلد ہی سنجیدہ ہو گیا۔ مصطفیٰ ماموں اور عفیفہ مامی کے حالات زندگی سے آگاہی کے بعد وہ مجھے سمجھانے لگا تھا کہ میں شہریار کے حوالے سے اتنی سیریس نہ ہوں۔ گھر میں یہ قصہ دوبارہ نہیں چھیڑا گیا تھا، شہرام کو ڈر تھا کہ اگر یہ رشتہ طے نہ پایا تو میرے دل کو بہت دھچکا لگے گا اور اس کا خدشہ صحیح ثابت ہوا شہریار نے سین کو جیون ساتھی کے طور پر منتخب کر لیا اور میں خالی ہاتھ رہ گئی۔"

علیزہ کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ انابیہ کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔

"شہرام مجھے سمجھاتا تھا کہ اللہ نے میرے مقدر میں کسی بہت اچھے بندے کا ساتھ لکھا ہو گا۔ مگر میرے دل کو قرار نہ آتا تھا۔ میں اپنی فرسٹریشن میں اس پر چڑھ دوڑتی تھی۔ اس کی وجہ سے میرے دل میں شہریار بھائی کی چاہت بیدار ہوئی۔ میں قسمت کی ستم ظریفی کو بھی اس کا قصور بتا کر اس کے کندھوں پر تھوپ دیتی تھی، لیکن وہ مجھے ہمیشہ یقین دلاتا کہ میں محبت کے معاملے میں تہی داماں نہیں رہوں گی۔ شہریار کی محبت

میری قسمت میں نہیں ہے تو نہ سہی اللہ مجھے کسی اور شخص کی چاہت سے ضرور سرفراز کرے گا اور دیکھو اس کا کہا سچ ثابت ہوا۔" علیزہ کی بھیگی آنکھیں مسکرائی تھیں۔

"تم لوگوں کے لان میں ڈاکٹر صاحب سے ایک حادثاتی ٹکر ہوئی اور وہ کہتے ہیں کہ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ان کے دل کے ساتھ حادثہ ہو گیا۔ ڈاکٹر اسامہ کی سب سے اچھی بات ہی مجھے یہ لگی کہ اس نے مجھے پسند کیا اور سیدھے سبھاؤ اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیج دیا۔ مجھے اس کی سچائی پر یقین آگیا' دعا کرنا اس کی محبت پر بھی یقین آجائے اور اس کی محبت مجھے پھر سے محبت کرنا سکھا دے۔" علیزہ دھیرے سے بولی تھی۔

"تم ان شاء اللہ ڈاکٹر اسامہ کے ساتھ بہت خوش رہو گی علیزہ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

انابیہ کی اپنی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے علیزہ کے ہاتھ تھام کر اسے بہت خلوص سے دعا دی تھی۔ علیزہ اب واقعی پرسکون تھی اس نے اپنے سارے آنسو انابیہ کے کندھے پر سر رکھ کر بہا لیے تھے۔ اب انابیہ علیزہ کے سونے کی منتظر تھی۔ ابھی اسے بھی اپنی بے وقوفیوں اور حماقتوں پر جی بھر کر آنسو بہانے تھے لیکن وہ یہ آنسو کسی اور کے سامنے نہ بہانا چاہتی تھی' کم از کم علیزہ کے سامنے تو بالکل نہیں۔

❊ ❊ ❊

منگنی علیزہ کی ہو رہی تھی اور تیاری پر سارے ارمان انابیہ نکال رہی تھی۔ تازہ ترین اطلاع یہ تھی کہ شہرام منگنی کا فنکشن اٹینڈ کرنے پہنچ رہا ہے۔ وہ باہر سے آرہا تھا۔ انابیہ کا رواں رواں اس کا منتظر تھا۔ قدرت نے کتنے پیارے شخص کو اس کا ہم سفر بنایا تھا اور وہ کتنے عرصے سے اس پیارے شخص کے پیار کی توہین کرتی آرہی تھی۔ وہ کتنا وسیع القلب اور اعلا ظرف تھا' اس کی بدتمیزیاں نظرانداز کر کے مسلسل اسے اپنی چاہت کا یقین دلانے میں مصروف رہا۔

کتنا غلط سمجھتی رہی وہ اسے۔ اس کے بارے میں کیسے کیسے اندازے اور قیافے لگائے۔ چند ادھوری باتوں کا غلط مفہوم اخذ کر کے کس قدر حماقت کا ثبوت دیا اور اب وہ کس منہ سے اپنی حماقتوں کا اعتراف کرے گی۔ وہ بہت اچھا سا تیار ہونا چاہتی تھی علیزہ کی منگنی کے لیے نہیں بلکہ اپنے محبوب اور اپنے شوہر کے سواگت کے لیے۔ اس کی نگاہیں بے تابی سے شہرام کو کھوج رہی تھیں اور پھر وہ آگیا تھا' لیکن آج وہ ہمیشہ کی طرح فریش نہ لگ رہا تھا۔ وہ بہت تھکا تھکا اور نڈھال سا لگ رہا تھا' انابیہ منتظر رہی کہ اسے دیکھ کر شہرام کی نگاہوں میں ستائش ابھرے گی۔ وہ جانے یہ کیوں بھول گئی کہ اس نے شہرام کو ایسا کوئی حق دیا ہی کب تھا۔ وہ اس سے ملا ضرور تھا۔ سلام وہ ہوئی' حال احوال بھی دریافت کیا اور بس۔

انابیہ کی ذات کے لیے اس کا یہ احسان ہی بہت بڑا تھا وہ گھر والوں کے سامنے اس کی ذات کا بھرم قائم رکھتا تھا۔ اس نے علیزہ اور اسامہ کو جو گفٹس دیے ان پر مسٹر اینڈ مسز شہرام لکھا تھا۔ انابیہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ وہ خود کتنی ان مصروف تھی اپنی ہی سوچوں کے تانے بانے میں گم' یہ خیال تک نہ آیا کہ اس موقع پر علیزہ اور اسامہ کو کوئی گفٹ بھی دینا چاہیے۔ اپنے کھڑوس میاں پر اسے اس وقت بہت پیار آیا تھا فنکشن بھرپور رہا تھا۔ ڈنر کے بعد مہمان رخصت ہونے لگے تو انابیہ کی متلاشی نگاہوں نے شہرام کو ڈھونڈنا چاہا۔ وہ اسے بہت دیر سے نظر نہ آیا تھا اور جب گردوپیش میں وہ اسے کہیں تلاش نہ کر پائی تو اس نے شہریار بھائی سے شہرام کی بابت استفسار کیا۔

"وہ تو چلا گیا۔ تمہیں نہیں پتا۔" شہریار بھائی الٹا حیران ہوئے تھے۔

"چلے گئے پر کہاں۔" انابیہ کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

"اتفاق سے لاہور واپسی کی فلائٹ مل گئی۔ کل اس کی بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے نا۔ لیکن کیا وہ تمہیں بتا کر نہیں گیا۔" شہریار بھائی حیران ہو کر پوچھ رہے

تھے۔

"بتایا تھا، میں نے سمجھا مذاق کر رہے ہیں۔" انابیہ نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکے۔

"میں فون کر کے کان کھینچوں گا اس کے، تم فکر ہی نہ کرو۔"

شہریار بھائی نے اسے تسلی دی۔ وہ آنسو پینے کی کوشش کرتے ہوئے محض سر ہی ہلا پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے ویک اینڈ تک اس نے شہرام کا شدت سے انتظار کیا تھا، مگر انتظار، انتظار ہی رہا۔

"مجھے لاہور جانا ہے تایا جان۔" اتوار کے دن جب پوری فیملی دوپہر کے کھانے پر اکٹھی تھی اس نے مرتضیٰ کو مخاطب کیا۔

"ہاں بیٹا! اس بار شہرام آئے گا تو ہم نے تمہیں اس کے ساتھ بھیجنا ہی ہے۔ میں نے اور تمہاری نانی جان نے فیصلہ کر لیا ہے۔" تایا جان مطمئن سے انداز میں بولے تھے۔

"مجھے کل ہی جانا ہے۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔ آنسوؤں کا گولہ حلق میں اٹکا تھا۔

"کل؟ مگر بیٹا۔" میمونہ نے تعجب سے اسے دیکھا پھر کچھ سمجھانا چاہا۔

"ہم دونوں کی بہت سخت لڑائی ہو گئی ہے۔ وہ مجھ سے سخت خفا ہو کر گئے ہیں۔ مجھے انہیں منانے جانا ہے۔" وہ بتاتے بتاتے رو پڑی تھی۔ دسترخوان کے گرد بیٹھے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس کی یہ مجال کہ وہ تم سے لڑائی کرے۔ ذرا آنے دو اسے، خوب کان کھینچوں گا اس کے۔" مرتضیٰ نے اسے تسلی دی۔ اس گھر کے لوگ اس کے میاں کے کان کھینچنے کے ہی درپے رہتے تھے۔ انابیہ کو مزید رونا آ گیا۔

"اچھا تم پریشان مت ہو۔ شہریار تمہیں لاہور چھوڑ آئیں گے، اس طرح شہرام کو بھی اچھا سرپرائز ملے گا۔" ہمہ رو فطرت کی مالک بیگم نے فوراً اس کی تجویز کی تائید کر دی۔

"پرامس شہریار بھائی! آئندہ کبھی آنے جانے کے لیے آپ کو بالکل تنگ نہیں کروں گی۔" انابیہ نے جھٹ آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

"پاگل ہو بالکل۔" شہریار بھائی ہنس پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

علی الصبح وہ اور شہریار بھائی گاؤں سے نکل پڑے تھے۔ گاڑی ملتان شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو شہریار بھائی نے اس سے گھر جانے کے متعلق پوچھا۔

"مصطفیٰ ماموں وغیرہ سے ہائے ہیلو کرنی ہے تو تھوڑی دیر کے لیے چلیں وہاں۔"

"نہیں شہریار بھائی! بہت لمبا سفر طے کرنا ہے، میں مزید دیر نہیں کرنا چاہتی۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔

ایک طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد جب وہ لاہور پہنچے تو انابیہ کو آج صحیح معنوں میں شہرام کی تھکن کا خیال آیا۔ تھکا دینے والی ڈرائیو کے بعد وہ حویلی پہنچتا تھا اور انابیہ اسے پانی کا گلاس دینا تو دور کی بات سیدھے منہ بات تک نہ کرتی تھی۔ پچھتاووں کا کوئی انت نہ تھا۔

"اب تو لاہور کی حدود میں داخل ہو چکے۔ اب انفارم کر دوں اسے۔" شہریار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اگر ہم سیدھے اپارٹمنٹ چلیں تو؟" انابیہ نے دھیرے سے پوچھا۔

"گھر لاکڈ ہو گا۔ چابی شہرام کے پاس ہو گی اور شہرام ابھی تک آفس میں ہو گا۔" شہریار بھائی نے صورت حال واضح کی۔

"بس پھر پہلے ان کے آفس چلیں۔ چابی لے کر گھر چلیں گے۔"

انابیہ نے فوراً فیصلہ کیا۔ شہریار بھائی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ آدھے گھنٹے کی مزید ڈرائیو کے بعد وہ اس کے آفس پہنچ چکے تھے۔ شہریار بھائی نے شہرام کو کال ملائی۔

"ہم تمہارے آفس کے نیچے پارکنگ میں موجود ہیں۔ نیچے آرہے ہو یا ہم اوپر آجائیں۔ ہمیں تمہارے اپارٹمنٹ کی چابی درکار ہے۔" شہریار بھائی متبسم لہجے میں چھوٹے بھائی سے پوچھ رہے تھے۔ یہ ساری سچویشن انہیں بھی مزہ دے رہی تھی۔

"ہم کا مطلب ہم۔" دوسری جانب سے کچھ استفسار کیا گیا تو شہریار بھائی مسکرا کر بولے تھے۔

"اے یار، مذاق نہیں کر رہا۔ میں انابیہ کو لے کر آیا ہوں، سخت تھکے ہوئے ہیں۔ فٹافٹ چابی لے کر آؤ نیچے۔" شہریار بھائی نے آرڈر دے کر کال ڈسکنکٹ کردی۔

"ابھی دیکھنا، سر کے بل چلتے ہوئے آئیں گے سرکار تمہارے۔" وہ اب انابیہ کو چھیڑ رہے تھے انابیہ جھینپ کر ہنس پڑی۔

دو منٹ کے اندر اندر وہ واقعی ہانپتا کانپتا پارکنگ میں موجود تھا۔ شہریار بھائی گاڑی سے اتر کر اس سے گلے ملے تھے، وہ بے یقینی سے کبھی شہریار بھائی کو اور کبھی گاڑی کے اندر بیٹھی انابیہ کو دیکھ رہا تھا۔ انابیہ نے اسے فارمل ڈریسنگ میں بہت کم دیکھا تھا اور اس وقت وہ اسے حد سے زیادہ ڈیشنگ لگ رہا تھا۔

"آنے سے پہلے انفارم تو کردیتے۔" وہ ابھی تک ان کی آمد پر بے یقین سا تھا۔

"گھر سے کسی نے فون کرکے پتہ نہیں بتایا۔" شہریار بھائی ہنستے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"صبح سے سب مجھے باری باری فون کرچکے ہیں لیکن آپ لوگوں کے آنے کا کسی نے نہیں بتایا۔" وہ کچھ ناراضی سے گویا ہوا۔

"اچھا چابی دو یار! باقی باتیں گھر جا کر ہوں گی۔" شہریار بھائی کے کہنے پر اس نے انہیں چابی تھمائی تھی۔

"آپ لوگ چلیں۔ میں بھی بس تھوڑی دیر تک پہنچتا ہوں۔" اس نے مخاطب شہریار بھائی کو کیا تھا اور تیکھی نگاہ انابیہ کے چہرے پر ڈالی تھی۔ اور وہ تو اس پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئی تھی۔ اب بھی ہینڈ بیگ کی زپ کھولے جانے اس میں کیا تلاش کرنے میں مصروف تھی۔

✿ ✿ ✿

یہ ایک انتہائی پھوہڑ شخص کا اپارٹمنٹ تھا۔ بے ترتیبی اور بدسلیقگی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ ان لوگوں کے گھر پہنچنے کے ٹھیک پچیس منٹ بعد شہرام بھی گھر پہنچ چکا تھا اور اب بوکھلائے ہوئے انداز میں گھر کی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ شہریار بھائی لمبی ڈرائیونگ کے بعد تھک چکے تھے اور اب صوفے پر نیم دراز تھے۔ انابیہ سنگل صوفے پر مطمئن انداز میں بیٹھی اپنے شوہر کی پھرتیاں ملاحظہ کررہی تھی۔

"گھر کی چیزیں بعد میں سمیٹ لینا یار! پہلے کچھ کھانے کو لاؤ، بہت بھوک لگی ہے۔" اسے خود سے آداب میزبانی نبھانے کا خیال نہ آیا تو شہریار بھائی کو ہی اس جانب توجہ مبذول کروانی پڑی۔

"کیا کھائیں گے؟" شہرام نے بے چارگی سے پوچھا۔

"انابیہ سے پوچھو۔" شہریار بھائی نے لمبی سی جمائی لی۔

"کیا کھاؤ گی۔" شہرام نے کھلے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"جو بھی گھر میں پکا ہوگا۔" انابیہ یکدم مخاطب کیے جانے پر گڑبڑا سی گئی تھی۔

"گھر میں نہ کچھ پکا ہوا ہے نہ کچھ پکتا ہے، جو کہوگی، بازار سے لادوں گا۔" وہ چبا چبا کر بولا تھا۔

"اوہ نو، شہرام! میں سویا نہیں ہوں، بچی کو کیوں ڈانٹ رہے ہو۔" آنکھیں موندے شہریار بھائی شہرام کو ٹوکے بنا نہ رہ پائے۔ شہرام جھنجلایا ہوا کھانا لینے چلا گیا تھا۔

کھانے کے بعد انابیہ نے ازراہ مہربانی برتن سمیٹ لیے تھے لیکن جب یہ برتن کچن میں رکھنے گئی تو کچن کی حالت دیکھ کر سر چکرا گیا۔ پورے گھر میں جو ابتری پھیلی ہوئی تھی، کچن میں اس سے ڈبل ابتری تھی۔

"ایسے کھڑی کیا انسپیکشن کررہی ہو۔" یکدم شہرام

پیچھے سے آکر غرایا۔ انابیہ ڈر کر پیچھے ہٹی۔

"چائے بنانے کا سوچ رہی تھی' سر میں درد ہو رہا تھا۔" نرم خو سے شہرام کے یہ بگڑے اکھڑے تیور انابیہ کا دل دہلا رہے تھے۔

"چائے ختم ہے۔ ٹی بیگز بھی نہیں ہیں۔ سو جاؤ جاکر سر کا درد خود ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے انابیہ کو رکھائی سے مخاطب کیا۔ انابیہ لب کچلتی آنسو پیتی کچن سے باہر نکل گئی۔

"یہ فالتو میٹرس ہے تو مجھے یہاں لاؤنج میں ڈال دو یار۔" شہریار بھائی اب سونے کے موڈ میں تھے۔

"ایک منٹ بھائی۔ ذرا نیچے مارکیٹ سے چائے کی پتی لے آؤں' پھر آپ کے سونے کا انتظام کرتا ہوں۔" شہرام کہہ کر پھر گھر سے نکل گیا تھا۔ انابیہ نے میٹرس ڈھونڈ کر لاؤنج میں شہریار بھائی کے سونے کا انتظام کر دیا تھا اور خود بیڈ روم میں چلی آئی۔

بیڈ روم نسبتاً" صاف تھا اس نے سکون کا سانس لیا۔

"کیوں آئی ہو تم یہاں...؟" تھوڑی دیر میں شہرام دو چائے کے کپ ٹرے میں سجائے بیڈ روم میں پہنچ گیا تھا۔ انابیہ نے تصویر واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور ٹرے میں سے ایک چائے کا کپ اٹھالیا۔ شہرام کا سوال گویا اس نے سنا ہی نہ تھا۔

"گھر والوں سے جھوٹ کیوں بولا کہ میں نے تم سے جھگڑا کیا ہے۔ صبح سے گھر کا ہر بندہ فون کر کے مجھے ڈانٹ پلا چکا ہے۔" وہ اس پر مزید بگڑا تھا۔ انابیہ چپ کر کے چائے کی چسکیاں لیتی رہی۔

"کل میں آفس سے چھٹی لے لوں گا۔ تمہیں مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کی سیر کروادوں گا اور کل ہی تم شہریار بھائی کے ساتھ واپس جاؤ گی۔ رائٹ۔"

"میں یہاں مینار پاکستان کی سیر کرنے نہیں آئی۔" اس بار انابیہ کو بھی غصہ آگیا۔

"پھر کس لیے آئی ہو؟" شہرام جواباً اس سے زیادہ غصے میں آیا۔

"آہستہ بولیں' باہر شہریار بھائی سو رہے ہیں۔ انہوں نے صبح صبح واپس جانا ہے۔ زمینوں کا کوئی مسئلہ ہے' کہہ رہے تھے فجر پڑھتے ہی نکل لیں گے۔" انابیہ نے اسے آگاہ کیا تھا۔ شہرام اسے لب بھینچے گھورنے لگا تھا۔

"مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ میں سونے لگی ہوں۔" اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاکر انابیہ نے سونے کی ہی ٹھانی تھی۔ شہرام بھناتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

صبح شہرام نے اسے جھنجوڑ کر اٹھایا تھا۔

"تم واقعی گھوڑے گدھے بیچ کر سوتی ہو۔ کب سے آوازیں دے رہا تھا تمہیں۔" وہ سخت جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔ انابیہ کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اسے بتا ہی نہ سکی کہ کتنے عرصے بعد رات کو اسے ایسی گہری اور پرسکون نیند آئی ہے۔

"میں آفس جا رہا ہوں۔ ناشتے کا سامان کچن میں رکھا ہے' ناشتہ کر لینا۔" شہرام کے بتانے پر انابیہ نے ذرا چونک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی آفس جانے کے لیے نک سک سے تیار تھا۔

"شہریار بھائی نے ناشتہ کر لیا؟" اس نے پوچھا تھا۔ کل کی بات اور تھی آج سے وہ واقعی گھر کی ذمہ داریاں نبھانے کا عزم کیے ہوئی تھی۔

"شہریار بھائی کو لاہور کی حدود سے نکلے ہوئے بھی گھنٹہ ہو گیا ہو گا۔" شہرام نے کٹیلے لہجے میں آگاہ کیا۔

"شہریار بھائی چلے گئے اور اب آپ بھی آفس جا رہے ہیں۔" ایک لمحے کو انابیہ یہ سوچ کر گھبرا گئی تھی کہ اب اسے گھر میں اکیلا رہنا پڑے گا۔

"ظاہر ہے مجھے آفس ہی جانا ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جتایا تھا۔

"تو ٹھیک ہے نا' آپ جائیں۔ دیر کیوں کر رہے ہیں۔ میں ناشتہ کر لوں گی۔" وہ ایسے اطمینان سے بولی جیسے شہرام اس کے ناشتے کے انتظار میں ہی کھڑا ہے۔ شہرام اسے گھورتا ہوا چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے

بعد اناباب کتنی دیر تک سر پکڑے بیٹھی رہی۔ جو فاصلے ان دونوں کے درمیان حائل ہو چکے تھے انہیں مٹانا اتنا بھی آسان نہ تھا۔ پھر وہ گہری سانس لیتے ہوئے اٹھی تھی، ہاتھ منہ دھو کر کچن کا رخ کیا۔ ناشتے کے سب لوازمات موجود تھے۔ ڈٹ کر ناشتہ کرنے کے بعد اس نے گھر سمیٹنا شروع کر دیا۔ ڈھائی تین گھنٹے کی محنت کے بعد بکھری چیزیں کسی حد تک ٹھکانے لگ چکی تھیں۔ گھر کے ہر کونے کھدرے سے کوئی نہ کوئی ان دھلا کپڑا ملا تھا۔ شکر ہے سرف بھی موجود تھا۔ وہ ٹب میں سرف کا جھاگ بنا کر شہرام کی شرٹس، موزے اور بنیانیں دھونے لگی تھی اور جب ہی شہرام چلا آیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم۔" وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

"وارڈ روب میں آپ کی ایک بھی دھلی بنیان نہیں نہ ہی کوئی موزے کی جوڑی ہے۔ میں نے سوچا، میلی جرابیں اور بنیان دھو کر ڈال دوں۔ پھر یہ دو تین شرٹس ملیں تو یہ بھی بھگو دیں۔" اس نے تفصیلی جواب دیا۔ شہرام کچھ نہ بولا بس اسے گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔

"آپ آفس سے اتنی جلدی کیسے آ گئے؟" انابیہ اس کی نگاہوں سے خائف ہوئی۔

"ہاتھ دھو کر فوراً آؤ میرے پاس۔" وہ اس کی بات کا جواب دیئے بنا آرڈر دے کر چلتا بنا تھا۔ انابیہ نے حکم کی تعمیل کی۔

"اب بتاؤ۔ کیوں آئی ہو۔ امی نے بھیجا ہے نا۔" وہ اس بار نرمی سے استفسار کر رہا تھا۔ انابیہ نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"پھر یقیناً" گرینڈ پا نے مجبور کیا ہو گا تمہیں یہاں آنے پر۔" وہ قیاس کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

"مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ میں خود آئی ہوں۔" انابیہ نے اس کے اندازوں کی نفی کی۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کیوں؟" وہ پھر تیز ہوا۔

"میں نے گول روٹی بنانا سیکھ لی ہے۔ میں آپ کے لیے کھانا بنایا کروں گی۔ آپ کے کپڑے پریس کروں گی۔ گھر کی چیزیں سلیقے سے سمیٹ کر رکھوں گی بس آپ مجھے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیں۔ مجھے واپس چھوڑ کر آنے کی بات مت کہیے گا۔" انابیہ جیسے اس کے دل کی بات پہنچ گئی تھی۔

"میرے اعصاب کا مزید امتحان مت لو انابیہ! میں پہلے ہی بہت ٹوٹ چکا ہوں۔ تمہارے ایک روپ سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ تم دوسرا روپ لیے سامنے آجاتی ہو۔ میں یہ پہیلیاں بوجھنے کے مزید موڈ میں نہیں ہوں۔ آج تم اپنے دل کی ہر بات مجھ سے صاف صاف کہہ ڈالو۔ سننے کا حوصلہ ہے مجھ میں۔" وہ ٹوٹے بکھرے لہجے میں بولا۔

انابیہ کے ضبط کے بندھن بھی ٹوٹ گئے۔ وہ چپ رہ کر اپنا مزید نقصان نہ کر سکتی تھی، اس نے روتے روتے اپنی حماقتوں اور بے وقوفیوں کی الف سے یے تک ساری تفصیل سنا دی تھی۔

"مجھ سے زیادہ احمق اور بے وقوف اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں شہرام! مجھے آپ کے ظرف پر حیرت ہوتی ہے، مجھ جیسی عورت کو تو چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کرنا چاہیے تھا اور آپ میرے ناز نخرے برداشت کرتے ہوئے مجھے منانے کی کوششوں میں ہی لگے رہے۔" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اپنی حماقتوں پر خود کو ملامت کر رہی تھی اور شہرام اس کے آنسو دیکھ کر بے چین ہوئے جا رہا تھا۔

"اب بس کرو اور کتنا ہلکان کرو گی خود کو۔" شہرام نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"آپ مجھے معاف کر دیں گے نا شہرام۔" وہ بہت آس سے پوچھ رہی تھی۔

"ایک شرط پر۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"وہ کیا؟" انابیہ ہمہ تن گوش تھی۔

"آئندہ میں تمہارے منہ سے ایسی کوئی فضول بات نہ سنوں۔" اس نے تنبیہہ کی۔

"کیسی فضول بات۔" انابیہ قطعاً" نہ سمجھی تھی۔

"وہی چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکالنے والی بات۔ تم میرے دل کی ہر دھڑکن میں بستی ہو۔ تم سے محبت کرنا میرا اختیاری فعل نہیں۔ میں مجبور ہوں تم سے

محبت کرنے پر اور میں ہمیشہ سے یہ بھی جانتا تھا کہ محبت کے اس سفر میں میں تنہا نہیں ہوں۔ میں تمہاری آنکھوں میں جب بھی جھانکتا تھا مجھے اپنا ہی عکس نظر آتا تھا۔ تمہارے ایٹی ٹیوڈ کی صرف ایک ممکنہ وجہ میرے ذہن میں آئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ تم اپنے پیرنٹس کی ان اسٹیبل لائف کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار ہو۔ مصطفیٰ چاچو نے جوانی میں عفیفہ چچی کو ان کا جائز حق نہ دیا۔ مجھے لگتا تھا کہ تم ہر مرد کو اسی کسوٹی پر پرکھتی ہو۔ تمہاری اس نفسیاتی گرہ کو کھلوانے کے لیے میں عنقریب کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرنے لگا تھا۔"

"یعنی دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ مجھے پاگل سمجھنے لگے تھے۔" اس نے تیوریاں چڑھا کر شہرام کو گھورا۔

"پاگل تو تم نے مجھے بنا رکھا تھا۔ پہلے ہوش اڑاتی تھیں پھر منہ دھو کر مزے سے سو جاتی تھیں۔ شادی پر میرے ساتھ یہ کیا۔ ولیمے والی رات پھر یہی ہوا اور علیزہ کی منگنی پر میں اگلے روز کی چھٹی لے کر آیا تھا لیکن اس روز تم اتنی حسین لگ رہی تھیں کہ مجھے خدشہ ستایا کہ اگر میں رات ٹھہر گیا اور منہ دھونے والی پریکٹس جاری رکھی گئی تو میں چاچو کے گھر کوئی بڑا گھڑاگ پھیلا دوں گا۔ بس اسی لیے امپورٹنٹ میٹنگ کا بہانہ کر کے واپسی کی ٹھانی حالانکہ مجھے واپسی کی فلائٹ نہیں مل سکی تھی۔ بائے روڈ آنا پڑا تھا۔" وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔

"میں اس روز سر سے پاؤں تک آپ کے لیے ہی سنوری تھی۔" انابیہ نے اس کے کندھے سے سر ٹکا کر اعتراف کیا۔ اس اظہار پر شہرام فدا ہی ہو گیا۔

"تم مجھے ہر روپ میں ہی بہت پیاری لگتی ہو۔ یقین کرو اس وقت اس سڑے بسے حلیے میں تم کوئی کام کرنے والی ماسی لگ رہی ہو پھر بھی سیدھا دل میں اتر رہی ہو۔"

اب شہرام اسے چھیڑ رہا تھا لیکن انابیہ شرمندہ ہوتے ہوئے اس سے پیچھے ہٹی تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی کے بعد اس کا حلیہ خاصا ملگجا ہو رہا تھا۔ چہرے اور بالوں پر بھی گرد کی ہلکی سی تہہ جم گئی تھی۔ اچھی طرح ڈریس اپ ہوئے شہرام کے سامنے تو یہ رف حلیہ زیادہ ہی واضح ہو رہا تھا۔

"میں منہ دھو کر آتی ہوں۔" اس نے اٹھنا چاہا۔

"خبردار جو اب منہ دھونے کا نام لیا۔" شہرام نے اسے کھینچ کر پھر سے اپنے قریب بٹھایا۔

"ابھی آپ کے کپڑے بھی دھونے ہیں۔" وہ منمنائی۔

"پھر کہو گی کھانا بھی بنانا ہے۔" وہ ہولے سے ہنسا۔

"بالکل بنانا ہے۔ اب میں بہت اچھی روٹی بنانا سیکھ گئی ہوں۔" اس نے ذرا اترا کر بتایا تھا۔

"ہوں تو گویا اپنے سگھڑاپے سے مجھے امپریس کرنا چاہتی ہو۔" وہ اس کے بال چھیڑتے ہوئے بولا۔

"جی بالکل۔ سیانے کہتے ہیں کہ مرد کے دل کا راستہ اس کے معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ میں بھی آپ کو اچھے اچھے کھانے کھلا کر آپ کے دل پر راج کرنا چاہتی ہوں۔" وہ اپنی لانگ ٹرم پلاننگ سے آگاہ کر رہی تھی۔

"میرا کیس مختلف ہے زوجہ محترمہ! تمہارے ہاتھ کی جلی ہوئی روٹیاں کھانے کے بعد تم سے میری محبت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔" شہرام نے اعتراف کرنے میں عار نہ سمجھا۔

"یعنی محبت میں اضافے کے لیے آئندہ بھی آپ کو ویسی روٹیاں کھلانی پڑیں گی۔" وہ معصومیت سے استفسار کر رہی تھی۔

"آئندہ ویسی روٹی کھلائی تو پھر پٹو گی بھی مجھ سے۔" شہرام نے وارننگ دی۔ انابیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ شہرام بھی ہنس پڑا۔ زندگی کے اس نئے موڑ کی اس قدر حسین شروعات پر دونوں کا رواں رواں اپنے رب کا شکر گزار تھا۔

دیناز سحر نسیم

دھول اگر مٹی کی اُڑ رہی ہو تو منظر کچھ پل کے لیے دھندلا سا جاتا ہے! آنکھیں کچھ لمحوں کے لیے منظر سے مانوس نہیں ہوتیں پھر آہستہ آہستہ دھول بیٹھ جاتی ہے اور منظر پہلے جیسا صاف ستھرا نظر آنے لگتا ہے لیکن اگر دھول عزت کی اُڑ جائے تو؟

پھر کچھ پل تو کیا کچھ سال بھی بیت جائیں تو منظر شفاف نہیں ہوتا۔ نفرت زدہ نظریں کئی سال جھیلنی پڑتی ہیں۔ ملنے ملانے والوں کی زبانیں کبھی ہمدردی تو کبھی ترس بھری گفتگو میں ڈھل جاتی ہیں۔ اور ناکردہ گناہوں کی سزا نسل در نسل چلتی رہتی ہے۔ وہ عزت جسے سالوں لگ جاتے ہیں بنانے میں 'معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے میں' لیکن اک لمحہ لگتا ہے عزت کی دھول اڑنے میں۔ بالکل یوں جیسے کوئی چاول بھری تھال میں سے باریک باریک کنکر چُن رہا ہو اور جب چُن لے تو کوئی شرارتی بچہ تھال میں ہاتھ مار کر تھال گرا دے۔

"اللہ خیر کرے ماسی نذیراں آج صبح صبح ادھر آرہی ہے۔" دونوں عورتوں نے ایک ساتھ اُدھر دیکھا۔ اتنے میں ماسی نذیراں پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ان کے قریب آ کر رکی۔

"کیا ہوا ماسی اتنی صبح کہاں سے آرہی ہو؟"

"ارے نہ پوچھو کیا ہوا ہے' سمجھو قیامت آگئی ہے۔" ماسی نذیراں گھبرائی ہوئی تھی۔

"کیسی قیامت ماسی؟"

"رانا آفاق کی بڑی بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے۔"

"کیا؟" دونوں عورتوں کے حلق سے چیخ نما آواز نکلی۔

"ماسی! اللہ کا نام لے اتنی صبح اتنا بڑا الزام۔ تجھے پتا ہے رب سوہنا کتنا ناراض ہوتا ہے کسی پر بہتان لگانے پر۔" پہلی عورت نے ذرا سنبھل کر کہا۔

"تو بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی۔ میں خود دیکھ کر آئی ہوں۔"

"ماسی بس کر بھائی آفاق کی بچیاں کتنی نیک اور باحیا ہیں پورا محلہ جانتا ہے۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند ہیں۔ اپنے ہاتھوں میں تو پلی ہیں۔ گھر کی دہلیز پر کبھی کھڑی نہ ہوئیں۔ اسکول کالج عبایا میں گئیں اور نظر جھکا کر گئیں اور تو کیا صبح صبح بکواس کر رہی ہے۔" دونوں عورتوں کو شدید بُرا لگا تھا۔

"تم لوگوں کو یقین نہیں آئے گا۔ خود جا کر دیکھ لو' صف ماتم بچھی ہوئی ہے رانا آفاق کے گھر۔"

"ماسی چپ کر جا! یہ ساتھ والی گلی میں تو آفاق بھائی کے بھائی کا یعنی طاہرہ کا سسرال ہے۔ طاہرہ کے منگیتر نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔" پہلی عورت نے پھر دبی آواز میں سمجھانا چاہا تھا لیکن چنگاری لگے تو آگ تو بہت دور تک جاتی ہے۔

"میں وہی تو بتا رہی ہوں عاصم کے چھوٹے بھائی فاخر کے ساتھ تو بھاگی ہے طاہرہ۔"

"ماسی نذیراں! لگتا ہے تو رات کو کوئی خواب دیکھتی رہی ہے اور اب وہی ذہن میں اٹک گیا ہے۔ بھائی آفاق کی دونوں بیٹیاں اپنے تایا کے گھر جا رہی ہیں بیاہ کر اور ایک ہفتہ ہی تو رہتا ہے شادی میں۔ طاہرہ کیوں جانے لگی اپنی چھوٹی بہن کے منگیتر کے ساتھ؟ اور کتنے سالوں سے تو رشتے طے تھے اور اب شادی سے ایک ہفتہ پہلے گھر سے بھاگے گی۔ طاہرہ تو اپنے نام کی طرح پاکیزہ ہے۔ ایسے الزام نہیں لگاتے ماسی!"

وہ اپنی بات مکمل کر کے پلٹنے ہی والی تھیں جب رانا آفاق کے بڑے بھائی رانا آفتاب اور ان کی بیوی راحیلہ آفتاب روتے ہوئے رانا آفاق کے گھر کی

طرف جاتے نظر آئے۔

"ماسی نذیراں! کیا تو واقعی سچ کہہ رہی ہے؟" دونوں عورتیں حیرت سے رک گئیں۔

"میں نے پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے؟" ماسی نذیراں بگڑ کر بولی۔

"دو لیکن۔" وہ دونوں حیرت سے نکل نہ پا رہی تھیں۔

"بھئی میں تو صاف بات کروں گی۔ شادی تو رانا آفاق اور رانا آفتاب کی اکٹھی ہوئی تھی۔ بیویاں بھی دونوں کی بہنیں تھیں! آفتاب کے ہاں پہلے عاصم آیا پھر درمیان کے دو بچے فوت ہو گئے، پھر نازلی اور آخر میں فاخر۔ جبکہ رانا آفاق کی شادی کے دس سال بعد اولاد ہوئی! پہلی بیٹی طاہرہ جو فاخر کی ہم عمر تھی۔ اس سے چھوٹا اطہر اور اس سے چھوٹی فارہ آفتاب کی نازلی اطہر کو بیاہی گئی! اکلوتے بیٹے کی خوشی آفاق نے پہلے کرلی کیا ہوا جو نازلی تھوڑی بڑی تھی اطہر سے، رہ گئی بیٹیاں تو بڑے کو بڑی دے دی اور چھوٹے کو چھوٹی اب آفتاب کا بڑا بیٹا عاصم طاہرہ سے دس سال بڑا ہے جبکہ فاخر ہم عمر ممکن ہے وہ اپنے ہم عمر کو پسند کرتی ہو۔ جب کوئی راستہ نہ ملا تو گھر سے بھاگ گئے ہوں گے" ماسی نذیراں نے جیسے دل میں سوچا من و عن وہی بیان کر دیا۔

"دو لیکن ماسی۔۔۔ میرا دل نہیں مانتا۔ طاہرہ تو بہت نیک بچی تھی۔ آنکھوں کے سامنے رہی ہے۔ معصوم چہرہ معصوم باتیں۔ پھر اپنی چھوٹی بہن کا گھر کیوں برباد کرتی۔ جبکہ میں نے سنا تھا فاخر فارہ کو بہت پسند کرتا تھا۔"

"رب سوہنا خیر کرے۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔ نہ باپ کا سوچا نہ تایا کا نہ چھوٹی بہن کا۔ شکل سے شریف دکھنے والیاں ہی ایسے کرتوت کی نکلتی ہیں۔ سارے رشتے برباد کر کے گئی ہے۔"

جہاں کچھ دیر پہلے طاہرہ کی پاکیزگی کی باتیں ہو رہی تھیں اب وہیں برائیاں ہو رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"بتا کہاں گئی ہے اور کیوں گھر سے بھاگی ہے۔ ورنہ میں تیری جان لے لوں گا؟"

رانا آفاق کا بے بسی اور غصے سے برا حال تھا۔ بے بسی میں ان مردوں کا عورتوں پر ہی بس چلتا ہے۔

"ابو جی مت ماریں امی جی کو انہیں بھی آپ کی طرح کچھ نہیں پتہ۔"

رانا آفاق نے کھینچ کر ایک تھپڑ فارہ کو دے مارا۔ ان کا رخ اب اس کی طرف ہو گیا تھا۔

"پھر تجھے پتا ہو گا۔ ہر وقت ایک ساتھ ہوتی تھیں۔"

رانا آفاق سرخ انگارہ آنکھیں لیے فارہ سے پوچھ

رہے تھے۔

"دیکھ فارہ! تیرے باپ کی عزت تیرے قدموں میں پڑی ہے۔ مجھے بتادے وہ کون سے شہر گئے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں تجھ سے۔ طاہرہ کی شادی فاخر سے ہی کروں گا اور تو جس سے چاہے گی۔ کارڈ بانٹ دیے گئے ہیں۔ ایک ہفتے بعد مہمان آجائیں گے۔ اور تیرے باپ تایا کی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ چالیس سال کی کمائی ہوئی عزت لمحوں میں لٹ جائے گی۔"

رانا آفاق بے بسی سے رونے لگے تھے۔

فارہ ان کے قدموں میں گر کر رونے لگی۔

"ابو جی! مجھے بھی کچھ نہیں پتا۔ آپا نے ایسا کیوں کیا۔ وہ تو عاصم بھائی سے بہت محبت کرتی تھیں۔"

کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اسی وقت رانا آفتاب اور ان کی بیوی راحیلہ روتے ہوئے داخل ہوئے۔

"آفاق! یہ کیا ہو گیا ہمارے بچوں نے ہمیں کن گناہوں کی سزا دی ہے؟" دونوں بھائی گلے لگ کر رونے لگے تھے جبکہ راحیلہ بیگم اپنی بہن رضیہ کو سنبھالنے لگیں۔

"عاصم کی آنکھوں میں تو خون اتر آیا ہے۔ پولیس کو فون کر دیا ہے زندہ یا مردہ پکڑ لائیں — سارے دوستوں کو ارد گرد بھیج دیا ہے۔ آفاق! جوان بیٹے کی لاش دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ تم۔ تم عاصم کو سمجھاؤ۔ اپنے بھائی سے انتقام نہ لے۔"

"لیکن انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ ان کی بات تو سالوں سے طے ہے فاخر کے اصرار پر ہی فارہ کو مانگا تھا اور طاہرہ عاصم کا جھکاؤ بھی ایک دوسرے کی طرف تھا۔ طاہرہ کو تو کبھی فاخر سے مذاق کرتے نہیں دیکھا کہاں یہ انتہائی قدم اٹھا لینا۔ بات کچھ اور ہے۔" وہ بہن کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"یہ دو لیٹر ان دونوں کے بیڈ روم سے ملے ہیں۔" رانا آفتاب نے غصے سے راحیلہ بیگم کی طرف وہ خط پھینکے۔ جس پر لکھا تھا۔ ہم یعنی فاخر اور طاہرہ اپنی مرضی سے گھر سے ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں۔ ہمیں تلاش کرنے کی بھی کوئی کوشش نہ کی جائے۔" یہی وہ لائنیں طاہرہ نے لکھی تھیں۔ حیرت کی بات تھی گھر سے وہ کچھ بھی نہیں لے کر گئے تھے۔ سوائے ایک تصویروں کے البم کے۔

عاصم دھاڑتا ہوا اندر آیا تھا۔

وہ آسمان نگل گیا ہے انہیں۔

کسی کو کچھ نہ بھی پتا ہو! اسے تو سب کچھ پتا ہو گا' آخر اس کے یار کے ساتھ بھاگی ہے اس کی بہن۔" عاصم کی — آنکھوں میں انگارے جلنے لگے۔

اس نے بالوں سے پکڑ کر فارہ کو کھڑا کیا تھا۔

"بتا کہاں ہے جو ہماری عزت کی دھول اڑا کر گئی ہے۔" فارہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں سختی سے بند کیں۔ انمول کرنے والا بے مول کر گیا تھا اور اس کی بہن طاہرہ اپنے عمل سے ان سب کو بدنام کر گئی تھی۔

"فارہ! خود بتادے ورنہ مجھے اگلوانا آتا ہے۔" عاصم کا سخت ہاتھ فارہ کے نازک رخسار کو سرخ کر گیا تھا۔

عاصم کو آج تک کسی نے بھی اس انداز اور لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن چوٹ شاید شدید تھی۔ اسی لیے وہ اس قدر مشتعل تھا۔

"ہاں یہ سچ ہے ہم دونوں ایک دوسرے سے ہر بات شیئر کرتے تھے لیکن یہ بات انہوں نے نہیں بتائی اور رہی بات فاخر کی تو وہ مجھ سے ملنے کے لیے اصرار کرتا تھا لیکن میں ابو کے ڈر سے کبھی نہیں ملی۔ تاریخ والے دن بھی اس نے سختی سے کہا تھا کہ اگلے دن طاہرہ آپا اور خالہ کو بازار بھیج دینا میں آؤں گا۔ مگر میں نے ڈر کے مارے آپا کو بتا دیا۔ انہوں نے کہا میں فاخر کو سمجھا دوں گی پھر اس دن آپا کے بجائے میں اور امی بازار چلے گئے۔ بعد میں فاخر آیا تھا۔ آپا نے مجھے اتنا ہی بتایا۔ میں نے بہت پوچھا لیکن انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" فارہ نے روتے ہوئے ساری بات تفصیل سے بتائی۔

"اس کا مطلب ہے ضرور فاخر کے پاس ایسی کوئی بات تھی جس نے طاہرہ کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا۔ لیکن کون سی بات؟" رانا آفتاب بولے۔

"وہ بات بھی یہی ہمیں بتائے گی۔ اس کو پتا ہے سب۔" عاصم نے ایک بار پھر جھنجوڑ کر فارہ کو سامنے کیا وہ شدت سے رونے لگی۔

"عاصم بھائی مجھے اتنا ہی پتا ہے۔"

عاصم نے پوری قوت سے الٹے ہاتھ کا ایک اور تھپڑ فارہ کو مارا۔ وہ دور جا گری۔

"عاصم! تم بھول رہے ہو منہ کالا کر کے جانے والا تمہارا اپنا بھائی ہے۔" عاصم نے دونوں مٹھیاں سختی سے بند کیں۔

"یہی بات میرے تن من میں آگ لگا رہی ہے۔ میری منگ کو میری عزت کو میرے بھائی نے لوٹ لیا۔ میری غیرت پہ یہ بات تازیانے لگا رہی ہے۔ میرے جسم میں خون کے شرارے پھوٹ رہے ہیں۔ میں آپ سب کو بتا دوں جس طرح اس نے میری ذلت کی ہے میری عزت کی دھول اڑائی ہے، میں جب تک اس کے سینے میں انتقام کی گولیاں نہیں اتاروں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

عاصم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھی۔ لہجہ خونخوار تھا۔ وہ سب پر ایک تیز نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔ وہاں موجود ہر نفس کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ ہی تو بھائی تھے! عاصم کا غصہ اگر ٹھنڈا نہ ہوا تو ایک بیٹا مارا جائے گا اور دوسرا ساری زندگی کے لیے جیل چلے جائے گا۔ اتنی ذلت بھری زندگی وہ کیسے جی پائیں گے سب کے دلوں پر ہاتھ پڑا تھا۔ بعض اوقات غلطی کوئی اور کرتا اور سزا بہت سے لوگوں کو بہت سارے سال بھگتنی پڑتی ہے۔ ایسا ہی کڑا وقت رانا آفتاب کے خاندان پر آیا تھا۔ بیٹا اپنا تھا وہ کس کا گریبان پکڑتے۔ سزا کا سوچتے تب ہی اپنا ہی جگر کٹتا۔ بے بسی سے دونوں بھائی دیواروں میں سر مار رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

کہتے ہیں غربت کے دن آجائیں تو صبر و شکر سے کٹ جاتے ہیں لیکن اگر ذلت کے دن آجائیں تو نہ ہی صبر نیکی بنتا ہے نہ ہی شکر ہی کیا جاتا ہے۔ بس اک بے رحم ان دیکھا خنجر ہوتا ہے جو پورے خاندان کو اندر ہی اندر قتل کر دیتا ہے۔

آٹھ دن پر لگا کر اڑ گئے عاصم بھوکے شیر کی طرح خونخوار پھر تا۔ مہمان آنے شروع ہو گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ راحیلہ بیگم اور رضیہ بیگم تو ہوش سے ہی بیگانہ ہو رہی تھیں۔ اطہر اور نازلی تھے جو بھانت بھانت کے مہمانوں کو سنبھالنے میں ہلکان ہو رہے تھے۔ عاصم سرے سے غائب تھا اور فارہ کو بالکل چپ لگ گئی تھی۔ وہ خالی نظروں سے سب دیکھ رہی تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہو رہی تھی۔ کسی عورت کے منہ سے نکلنے والی ایک چنگاری رانا آفتاب کے کان میں بھی پڑی تھی۔

"ارے بڑی بھاگ گئی تو کیا ہوا چھوٹی تو ہے نا۔ اس طرح کی ذلت کے بعد اور تو کوئی بیاہنے آئے گا نہیں۔ گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی پھر بیٹا بھی تو بھائی کے خون کا پیاسا ہوا ہے۔ اس طرح کرنے سے اس کا غصہ بھی جھاگ بن کر بیٹھ جائے گا۔" رانا آفتاب نے یہ سب بہت غور سے سنا تھا اور ایک لمحے میں فیصلہ کیا۔

عاصم اس بات کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا۔

"دیکھو عاصم! ایسا کرنے میں ہمارا بہت بھلا ہے بلکہ فائدہ ہے۔ ایک تو آفاق پر یہ احسان کر کے دبا کے رکھیں گے۔ کیونکہ ہماری نازلی ان کے گھر بیاہی ہے۔ دوسرا نکاح کر کے تم فارہ سے ہر وہ راز اگلوا سکتے ہو جو وہ طاہرہ کے بارے میں جانتی ہے۔ تمہارا انتقام پورا ہو جائے گا۔ اور پھر لوگوں کی زبانیں بھی بند ہو جائیں گی۔"

یہ ساری باتیں عاصم کی سمجھ میں آگئی تھیں۔ فارہ سے کسی نے نہیں پوچھا۔

اطہر آفاق نے دبا دبا سا احتجاج کیا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ایک تو عاصم فارہ سے بہت بڑا ہے۔ دوسرا وہ اس صورتحال میں فارہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنی دونوں بہنوں سے بہت پیار کرتا تھا مگر رانا آفاق نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی تھی۔

"کیا چاہتے ہو تم کہ دوسری بھی رات کے اندھیرے میں منہ کالا کر کے چلی جائے؟" اور رانا اطہر

خاموش ہو گیا۔
جیسے تیسے عورتوں نے اسے دلہن بنا دیا تھا۔
رخصتی کے وقت رانا آفاق نے اسے پیار نہیں کیا۔ ایک بیٹی نے اعتبار توڑا تھا اور وہ دوسری سے بھی نفرت کرنے لگے تھے۔ اس دنیا کا دستور رہا ہے غلطی کوئی کرتا ہے سزا کسی کو جھیلنی پڑتی ہے۔
اس گھر کی دہلیز پار کرنے سے پہلے اپنی خواہشوں محبتوں اور اعتبار کو فارہ آفاق وہیں چھوڑ آئی تھی۔ جانتی تھی! اسے طاہرہ کی بہن ہونے اور فاخر کی منگیتر ہونے کی سزا بھگتنی ہے۔

✡ ✡ ✡

طاہرہ کا سارا جہیز بھی اسے دے دیا گیا تھا۔ عاصم آفتاب کا پورا گھر اس کے جہیز سے سج گیا تھا۔ بس ایک وہی پتھر کی مورت بن گئی تھی۔ نازک جذبے اور ارمان مر گئے تھے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب عاصم دروازے کو ٹھوکر مارتا اندر آیا تھا۔
"وہ تو انتظار کیا جا رہا ہے۔ لیکن کس کا؟" زہریلے لہجے کا زہر فارہ کے کانوں میں اترا۔ وہ خود میں مزید سمٹ گئی۔
ایک سے ایک گرا ہوا لفظ استعمال کرتا وہ خود میں نہیں رہا تھا۔
"بتا کس کا انتظار کر رہی تھی۔" بے دردی سے اس کا دوپٹا اتار پھینکا۔ زیورات نوچ نوچ کر اتار دیے۔ تھپڑوں سے چہرہ سرخ کر دیا۔ وہ روتی بلکتی اپنا بچاؤ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔
"اگر تم یہ سوچ کر آئی ہو کہ میں تمہیں اپنی بیوی بنا کر رکھوں گا۔ تمہارے حقوق ادا کروں گا تو یہ بات ابھی سے اپنے ذہن سے نکال دو۔ میں تمہیں اپنی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ جتنا بڑا گناہ ان دونوں کا ہے۔ اس سے بڑا گناہ تم نے ان کے بارے میں سچ نہ بتا کر کیا ہے۔ اگر تم بتا دیتیں تو تم بچ جاتیں۔ لیکن اب تم روز جیو گی روز مرو گی۔" وہ اس کا چہرہ سختی سے دبوچے ہوئے تھا۔ فارہ کے خاموش آنسوؤں سے عاصم کے دونوں ہاتھ تر ہو گئے تھے۔
"اگر اب بھی تم مجھے سچ بتا دو تو تھوڑی بہت گنجائش نکالی جا سکتی ہے! بتاؤ شاباش کہاں گئے ہیں اور کیوں گئے ہیں؟" فارہ کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔
"مجھے کچھ نہیں پتا۔" وہ کہتے رکی تھی اور عاصم اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ تھپڑوں سے ٹھوکروں سے مار مار کر اسے بے جان کر دیا تھا۔ عاصم کا غیظ و غضب سن کر رانا آفتاب اور راحیلہ بیگم دوڑتے اندر آئے تھے۔
اندر کے منظر نے ان کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ فارہ بے جان پڑی تھی۔
رانا آفتاب نے بمشکل عاصم کو پکڑا۔ جبکہ اس بے ہوش وجود کو راحیلہ بیگم نے سنبھالا تھا۔
فارہ کے ہونٹوں اور پیشانی سے خون نکل رہا تھا۔ اور بھی کئی جگہ سے زخمی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر راحیلہ بیگم کے آنسو بہنے لگے۔ فارہ سب سے چھوٹی تھی اور دونوں گھروں کی لاڈلی تھی، خود عاصم نے کتنے ہی ناز نخرے اور فرمائشیں پوری کی تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ جس کی زندگی میں تیس برس بعد بہار آئی تھی تو کس انداز میں ان کا فرماں بردار بیٹا بدلتے وقت کے ساتھ کیسے بدل گیا تھا۔
رانا آفتاب نے تقریباً" بے سدھ پڑی فارہ کو گلے سے لگا لیا۔ وہ ان کا سہارا پاتے ہی اور شدت سے رونے لگی۔
"اب اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" رانا آفتاب نے انتہائی غصے سے اسے کہا۔ عاصم نے زوردار ٹھوکر کرسی کو ماری اور کمرے سے چلا گیا۔

✡ ✡ ✡

اگلے دن رسم کے مطابق رانا آفاق کی فیملی فارہ کو لینے آئی تھی مگر عاصم نے صاف انکار کر دیا۔
"عاصم بھائی! آپ طاہرہ آپا کی سزا فارہ کو نہیں دے سکتے۔" اطہر غصے سے بولا۔
"اطہر! تم خاموش رہو! فارہ اب عاصم کی ذمہ داری

ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ چلو اٹھو چلتے ہیں۔" رانا آفاق نے کہتے ہی رضیہ بیگم کو چلنے کا اصرار کیا۔

"لیکن ابو جی! میں فارہ کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا!" اطہر کا دل اپنی معصوم سی بہن کے لیے تڑپ رہا تھا! جبکہ رانا آفاق نے اپنا دل پتھر کا کر لیا تھا۔

"بھائی پلیز! آپ جائیں ابو جی جیسے کہہ رہے ہیں، ٹھیک ہے۔" فارہ کی آنسوؤں بھری کانپتی آواز اطہر اور اس کی ماں کا دل چیر گئی تھی۔

"فارہ ابھی تمہارا بھائی زندہ ہے!" اطہر چیخ پڑا تھا۔

"بھائی! آپ چلے جائیں پلیز!" فارہ نے کچھ اس لہجے میں کہا تھا کہ اطہر کو اپنے قدم باہر کی طرف موڑنے ہی پڑے۔

"شاباش اسی طرح تمہیں اپنی سزاؤں کو اپنے لیے مضبوط کرنا ہوگا۔" وہ دو قدم بڑھا کر اس تک آیا تھا۔

"اور کان کھول کر سن لو! آج کے بعد گیٹ تو کیا صحن میں بھی نظر نہ آؤ! نہ موبائل کو ہاتھ لگاؤ گی! اور نہ ہی گلی محلے کی کسی عورت سے ملو گی! بات دہرانے کی مجھے عادت نہیں ہے کبھی بھولنا مت۔" عاصم نے اسے بازوؤں سے سختی سے پکڑ کر کہا تھا اور پھر دھکا دے کر صوفے پر پٹخ دیا تھا۔

رانا آفتاب اور راحیلہ بیگم گم صم سے بیٹھے رہ گئے تھے۔ آخر وہ کیا کرتے ایک ہی تو بیٹا رہ گیا تھا ان کے پاس۔ رانا آفتاب نے تو بہت دور کی سوچی تھی کہ فارہ کو اپنے گھر لا کر سب کچھ ان کے ہاتھ میں آجائے گا۔ ان کی بیٹی نازلی بھی محفوظ رہے گی اور فاخر بھی۔ رانا آفتاب اتنا تو جان گئے تھے عاصم جتنا بھی فارہ پر تشدد کرلے فارہ اپنی زبان نہیں کھولے گی۔ یقیناً بات درمیان میں کچھ اور ہے اور غلطی بھی اپنے بیٹے کی ہی نکلے گی! مگر ان کو کیا خبر عاصم اس پھول جیسی فارہ کو اتنا تاراج کرے گا کیونکہ انہوں نے فارہ اور طاہرہ کو بھی باپ بن کر ہی پالا تھا۔

اطہر ڈاکٹر تھا۔ اس کی پوسٹنگ ملتان میں تھی! لوگوں کے طعنوں سے بچنے کے لیے رانا آفاق سب کچھ چھوڑ کر اطہر اور نازلی کے ساتھ ملتان شفٹ ہو گئے تھے۔

✡ ✡ ✡

وقت اور مقدر نہ تو کسی کے ہاتھ میں آتے ہیں اور نہ ہی کسی کی مرضی سے چلتے ہیں۔ مقدر تو انسانوں کو ایسے نچاتا ہے کہ انسان محلوں سے اٹھ کر سڑک پر آجائے اور محبتوں سے کھیلتا نفرتوں میں گر جائے۔ پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی رانا آفتاب اور رانا آفاق کے گھر کا ہر فرد حیرت زدہ کھڑا تھا۔ وقت نے ایسی شطرنج ان کے ساتھ کھیلی تھی کہ مقدر کی بساط پر بچھے مہرے سب دھول ہو گئے تھے۔ وقت تو گزر گیا تھا لیکن عاصم کا رویہ نہیں بدلا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارے پھوٹتے رہتے۔ طاہرہ اور فاخر کا ان گزرے پانچ سالوں میں کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ یہی بات عاصم کی مردانگی اور انا پر ضرب لگاتی تھی۔ اس کی سوچ بہت منفی ہو گئی تھی۔ ہر رشتے کو غلط ہی لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ فارہ کی بے لوث خدمت اور وفا بھی اس میں ذرا سی بھی لچک نہ لا سکی اور لوگ بھی کب بھولتے ہیں ایسی باتوں کو۔ وہ اسی شہر اور گلی میں رہتا تھا جہاں سب ہی طاہرہ اور فاخر کو جانتے تھے۔ گھر سے نکلتے وقت کوئی عورت یہ پوچھ لیتی کچھ پتا نہیں چلا طاہرہ کا۔ یا فاخر کے ملنے جلنے والے فاخر کا پوچھتے۔ پوچھنے والا تو پوچھ کر اپنی راہ لیتا اور شامت فارہ کی آجاتی۔ وہ خاموشی سے مار سہتی رہتی، راحیلہ بیگم ہاتھ جوڑ جوڑ کر اسے بچاتیں۔ رانا آفاق نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے لیے فارہ بھی مر گئی تھی۔ جبکہ اطہر اپنی ماں کے ساتھ کئی بار آیا تھا لیکن اسے ساتھ لے جانے کی نہ ہی عاصم نے اجازت دی نہ ہی فارہ راضی ہوئی۔ وہ بہن کے ساتھ بیٹھ کر روتا اسے مناتا اور تھک کر واپس چلا جاتا۔

ایک دن راحیلہ بیگم فاخر کا کمرا صاف کرنے اور اس کی چیزوں کو چھونے میں مصروف تھیں وہ ماں تھیں انہیں فاخر دن رات یاد آتا تھا۔ چیزیں رکھتے وقت ایک ڈائری ان کے ہاتھ لگی۔ وہ خود تو پڑھی لکھی

نہ تھیں فارہ کو آوازیں دینے لگیں۔ فارہ اس کمرے میں آنا نہیں چاہتی تھی کہ عاصم نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ راحیلہ بیگم کی بار بار آوازیں دینے پر چلی آئی۔

"جی خالہ! آپ بلا رہی تھیں؟"

"فارہ! دیکھنا یہ فاخر کی ڈائری ہے شاید اسی سے کچھ پتا چل جائے!" فارہ نے ابھی ڈائری کھولی ہی تھی کہ عاصم آگیا اور آتے ہی گرجنے لگا تھا۔

"جب میں نے تمہیں منع کیا ہے تو تم کیوں اس کمرے میں...؟" فارہ کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ کلائی پکڑ کر کمرے میں لے گیا تھا اور دروازہ بند کر دیا۔ باہر راحیلہ بیگم فریاد کرتی رہ گئیں۔ لاتوں سے ہاتھوں سے اس کے پورے وجود کو نیل و نیل کر دیا۔ جسم پر جو پہلے کے زخم تھے ان میں خون رسنے لگا تھا۔ اسی شام اطہر آفاق چلا آیا۔ فارہ کی حالت دیکھ کر اس کا دل پھٹ گیا۔

"یار بس کر! بس کر دے کیا تجھے خدا کا خوف نہیں میں بھی تو نازلی پر تشدد کر سکتا تھا کہ تمہارا بھائی میری بہن کو ورغلا کر لے گیا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس میں نازلی کا کوئی قصور نہیں۔ اسی طرح فارہ کا بھی کوئی قصور نہیں۔ وہ مر جائے گی۔ کہیں اس کا صبر تمہارے لیے ناسور نہ بن جائے۔ پانچ سال کم تو نہیں ہوتے۔ وہ پتھر تو نہیں انسان ہے۔ اتنا تارچر اگر کسی جانور پر بھی کرتے تو وہ بھاگ جاتا۔ باغی ہو جاتا۔ یہ وہی فارہ ہے جس کی ہم ہر فرمائش منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کرتے تھے! اس وقت اس میں اتنا سا بھی صبر نہیں تھا۔ ذرا سی بات پر روٹھ جاتی تھی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔ دھول ہوتی جا رہی ہے۔" اطہر جیسے جیسے اسے یاد کروا رہا تھا عاصم کے اندر ندامت کا سمندر بہنے لگا تھا اطہر اسی شام چلا گیا تھا اور عاصم کو سوچنے کا موقع دے گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فارہ ٹھنڈے فرش پر دوہری ہو کر لیٹی ___ گردے میں اٹھنے والے شدید درد سے نڈھال ہو رہی تھی۔ درد بھی کتنی شکلیں بدلتے ہیں۔ طاہو کا دیا ہوا درد اس کی پیشانی پر لگ گیا تھا۔ اور رانا آفاق کی نفرت کا درد دل میں جم گیا تھا۔ شوہر کا دیا درد اس کے اندر باہر سے رستا تھا۔ اب پچھلے چند ماہ سے پیٹ میں شدید درد اٹھتا تھا۔ جو اسے نڈھال کر دیتا تھا! اور وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی! پہلے آزمائشیں کم تھیں جو اب اندرونی درد نے بھی جگہ گھیر لی تھی!

عاصم بیڈ پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ بار بار چینل سرچ کرتا لاشعوری طور پر فارہ پر نظر پڑ جاتی! جو کمبل میں لپٹی زمین پر لیٹی مسلسل بل رہی تھی۔ عاصم نے اسے اپنے برابر کبھی جگہ نہیں دی تھی۔

"اگر تمہیں نیچے نیند نہیں آ رہی تو صوفے پر لیٹ جاؤ۔"

فارہ جو پیٹ پہ ہاتھ رکھے دوہری ہو رہی تھی! حیرت زدہ سی عاصم کو دیکھنے لگی ___ وہ خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے ٹی وی پر نظریں جما کر بیٹھا تھا۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" کچھ دیر بعد فارہ نے حیرت پر قابو پا کر آہستہ سے کہا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ عاصم نے چونک کر اسے دیکھا۔

"نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں ہے جتنا کہا ہے اتنا کرو۔"

وہ پیشانی پر بل ڈالے بولا تھا۔ اب فارہ اسے کیا بتاتی وہ پیٹ میں اٹھنے والے شدید درد سے نڈھال ہے۔ اتنی ہمت ہی نہیں ہے کہ اٹھ کر صوفے تک جا سکے۔ پہلے راحیلہ بیگم کو بتا دیتی تھی اور وہ گولی دے دیا کرتی تھیں۔ اور اب تو وہ گھر پر ہی نہیں تھیں۔ نازلی کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ رانا آفتاب اور راحیلہ بیگم وہاں گئے ہوئے تھے! اور فارہ کی سمجھ نہیں آ رہا تھا اس سنگدل ہم سفر سے کیا کہے۔ وہ سسکیوں کو اپنے اندر دباتی اسی کمبل میں چھپ گئی تھی۔ عاصم نے رد عمل کے طور پر غصے سے ریموٹ پٹخا تھا۔ ٹی وی لائٹ ایک ساتھ بند کیا اور خود سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

"عاصم ___ عاصم پلیز مجھے کہیں سے پین کلر لا دیں۔" رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب عاصم کو

اپنے قدموں پر سسکتی فارہ کی آواز سنائی دی تھی۔ عاصم نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کی تھی! فارہ کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں سے عاصم کے پاؤں بھیگ گئے تھے۔

"عاصم! میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں مر جاؤں گی۔ مجھے کہیں سے ٹیبلٹ لا دیں۔" وہ روئے جا رہی تھی شاید جسم میں اٹھنے والے درد میں صبر نہیں تھا۔ عاصم نے گھبرا کر بے جان وجود کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"چلو اسپتال لے کر چلتا ہوں۔"

فارہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ اسے گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے آیا تھا۔

"جب مریض ختم ہو جاتا ہے تب ادھر لے آتے ہیں۔ گلے کا طوق بننے کے لیے۔ پہلے کیا سوئے ہوئے تھے۔" پیشہ ور ڈاکٹر کا انداز سخت تھا۔

"پولیس کیس بنتا ہے۔ کس نے کیا ہے اس پر اتنا تشدد؟" ڈاکٹر نے فارہ کے زرد چہرے پر پڑے ہوئے زخموں کے نشان دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! تفتیش بعد میں کرنا۔ میری بیوی کو چیک کرو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں چھوڑوں گا نہیں کسی کو۔" عاصم شدید غصے میں آ گیا تھا جب دوسری طرف سے آنے والے ڈاکٹر کی نظر بے ہوش پڑی فارہ پر پڑی تھی۔

"اتنا سیریس مریض ہے اور تم لوگ یہاں کھڑے ہو کر بحث کر رہے ہو۔ جلدی اندر لے کر چلو۔"

اور وہ پوری رات فارہ کے ایکسرے رپورٹس بلڈ گروپ اور دوسرے ٹیسٹ کرواتے گزر گئی۔ فارہ ہوش میں آ گئی تھی۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ فارہ کی ضد پر وہ اسے گھر لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا رپورٹس آنے کے بعد ہی وہ اصل بیماری کا بتا سکیں گے۔

فارہ میڈیسن کے زیر اثر گہری نیند میں سوئی ہوئی تھی۔ اور عاصم اس کے زرد چہرے پر نظریں ٹکائے گہری سوچ میں گم تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟! اتنا ظالم کیسے بن گیا تھا؟ کیا اس پر تشدد کرنے کی وجہ طاہرہ تھی؟ طاہرہ سے محبت تو اسے کبھی بھی نہیں رہی! ہاں البتہ نسبت طے ہونے کی وجہ سے اک خاص قسم کا لگاؤ ہو گیا تھا۔ اسے محبت تو نہیں کہا جا سکتا۔ کیا وجہ تھی جو میں سب کچھ جان کر بھی اپنا سارا غصہ تم پر نکالتا رہا! شاید سبب فاخر تھا! ہاں یہی وجہ تھی! وہ سوچتے ہوئے خود چونکا تھا۔

طاہرہ فاخر کے ساتھ بھاگی تھی اور فارہ فاخر کی منگ تھی۔

"ہاں فارہ تم سے نکاح کے بعد میرے احساسات بدلے تھے لیکن افسوس میں اس ذلت پر جذبات کو سوچ کر ہر رشتے کو منفی طور پر لے رہا تھا۔ یہیں پر غلطی ہوئی، میرے دل و دماغ پر یہ بات حاوی تھی کہ تم فاخر سے محبت کرتی ہو گی اور یہ اک اذیت دینے والی سوچ تھی، جو تم پر تشدد کرنے پر اکساتی تھی۔ میں لاشعوری طور پر تمہیں ہر اس چیز سے دور رکھنا چاہتا تھا جس میں فاخر کا ذکر ہوتا۔ میرے اندر یہ بات جڑ پکڑ گئی تھی کہ میں جتنا بھی فاخر کے حوالے سے تمہیں ٹارچر کروں گا۔ تم فاخر سے نفرت کرو گی مگر میں بھول گیا تھا کہ ایسا کرنے سے میں اپنا نقصان کر رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دو فارہ۔"

عاصم نے اس کے نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اسی پل فارہ کی آنکھ کھلی تھی۔ فارہ کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔

"ڈرو نہیں۔ اگر درد دوبارہ ہو رہا ہے تو بتا دو میں ابھی تمہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔" فارہ نے نفی میں سر ہلایا البتہ وہ ابھی تک شاکڈ تھی۔

"کیا بتایا ڈاکٹر نے کیا ہوا ہے مجھے۔" فارہ کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔ عاصم نے چونک کر اسے دیکھا۔

"رپورٹس ملنے پر۔۔۔ بتائیں گے۔ فارہ! میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے کیا حق تھا میں تمہیں کسی اور کے گناہوں کی سزا دیتا۔ حق تو تمہارا ابھی چھینا گیا۔ یہ بات مجھے بہت دیر کے بعد سمجھ میں آئی، میں تمہارے

درد کا مداوا کبھی بھی نہیں کر سکتا' لیکن میں تمہارے صدقے طاہرہ اور فاخر کو معاف کرتا ہوں۔" فارہ جو ساکت بیٹھی حیرت سے عاصم کو سن رہی تھی چونکی۔

"عا۔۔۔ صم۔۔۔ آپ!" فارہ کے آنسو بے اختیار ہوئے تھے۔

"فارہ! میں نے تم پر بہت ظلم کیا اور تم نے ثابت کر دیا۔ طاہرہ جیسی بھی بیٹی ہوتی تمہاری جیسی باوفا باکردار بھی بیٹیاں ہی ہوا کرتی ہیں۔ تم نے انتہا کا صبر کر کے تمام بیٹیوں پر داغ لگنے سے بچا لیا۔ مجھے تم پر فخر ہے۔" فارہ کو لگا تھا تمام زخموں پر مرہم لگ گیا ہو۔

"میں تمہارے زخموں کا ازالہ نہیں کر سکتا فارہ! مجھے معاف کر دو۔ میں بہت برا ہوں۔" عاصم کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔

"فارہ میں۔۔۔"

"بس بھی کریں اب۔" فارہ کا زخم دل اپنے ہم سفر کے لیے تڑپ اٹھا۔

"تو تم نے مجھے معاف کر دیا۔" عاصم نے حیرت سے پوچھا۔

"میاں بیوی کے رشتے میں نہ انا ہونی چاہیے نہ نفرت۔۔۔ میرے ماں باپ نے مجھے یہی سکھایا ہے۔" فارہ نے اپنے ماں باپ کے جھکے سر کو بلند کر دیا تھا۔ عاصم نے فارہ کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"میں جانتا ہوں میں بہت برا ہوں اور غلطیاں بھی ساری میری ہیں' لیکن تم کسی بھول میں مت رہنا۔ تمہیں تو میں پھر بھی بخشنے والا نہیں ہوں۔" وہ اس کے چہرے پر جھک آیا۔

عاصم اس رات فارہ سے معافی مانگتا رہا۔ محبت کا اعتبار دیتا رہا' وہ رات بہار بن کر اتری تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن رانا آفتاب' راحیلہ بیگم کے ہمراہ اطہر اور رضیہ بیگم بھی آئے تھے' لیکن فارہ کی پیاسی نظریں اپنے باپ کو تلاش کر رہی تھیں۔ "امی! ابو جی نہیں آئے؟" وہ نم آنکھوں سے بولی تھی اور اس بات کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"بھائی! ابو جی سے کہیں مرنے سے پہلے ایک بار مجھ سے مل جائیں۔"

"پاگل ہوئی ہو تم فارہ!" عاصم تڑپ کر اس کے قریب آیا تھا۔

"ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو ہم سب ہیں تمہارے پاس۔ میں خود لے کر آؤں گا چچا جی کو۔" وہ اس کے ہاتھ تھام کر محبت سے بولا تھا۔ وہ سب جب سے آئے تھے عاصم یونہی فارہ کا خیال کر رہا تھا۔ اپنے ہاتھ سے دوا اور سوپ پلاتا تھا اور اس کی ذرا سی پکار پر بھاگا چلا آتا۔ وہ سب عاصم کے بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر حیرت زدہ بھی تھے اور خوش بھی۔

"اطہر بھائی!" فارہ نے آہستہ سے پکارا۔ وہ کسی کو نہیں بتا پائی تھی کہ اسے اس وقت بھی شدید درد ہو رہا ہے۔ سب ہی اس کے اندر اٹھنے والے درد سے بے خبر تھے۔ وہ تکیے کے سہارے سے نیم دراز تھی۔

"کیا بات ہے فارہ!" اطہر اٹھ کر قریب آیا تو عاصم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اطہر! تم اس کے پاس بیٹھو میں اس کی رپورٹس لے کر آتا ہوں۔" عاصم نے نرمی سے اس کے ٹھنڈے ہاتھ کو چھوڑا اور باہر نکل گیا۔

"بھائی!" وہ اطہر کا سہارا ملتے ہی شدت سے رونے لگی تھی۔

"فارہ۔" اطہر سے بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔ آنسوؤں کا گولہ سا حلق میں اٹک گیا۔

"اطہر بھائی۔۔۔ ابو جی سے کہیں۔۔۔ میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔ اتنی کہ اگر وہ عاصم سے شادی کے بجائے مرنے کا بھی کہتے تو میں مر جاتی۔" کمرے میں موجود سب ہی لوگ بے بسی سے رو رہے تھے۔

"میں نے تائی کو فون کیا ہے وہ جیسے بھی ہوا ابو جی کو لے کر آئیں گی۔" اطہر نے دلاسا دیا۔

"بچے غلطیاں کریں تو ماں باپ انہیں ڈانٹتے ہیں انہیں سمجھاتے ہیں ان کی غلطی سدھارتے ہیں کیونکہ وہ ماں باپ ہوتے ہیں پھر وہ ہمارے باپ کیوں

نہیں ہے۔ انہوں نے ہمیں اتنے مان اور لاڈ سے کیوں پالا تھا؟ انہیں اپنی بیٹیوں کی پہچان کیوں نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بیٹیاں ایسی نہیں پھر انہوں نے لوگوں کے ساتھ مل کر پتھر کیوں اٹھا لیے؟“ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”لوگوں نے اگر پتھر اٹھائے تو انہوں نے ہاتھ میں خنجر اٹھا لیے تھے۔“ کمرے کی چوکھٹ پر رانا آفاق نے قدم رکھا تھا۔ وہ اطہر کے فون کرنے سے پہلے ہی چل پڑے تھے۔ پیچھے نانی اور بچے عاصم ہاتھ میں ریوالور لیے بے جان قدموں سے نانی کے پیچھے آ کر رکا تھا۔ فارہ کی کرب میں ڈوبی ہوئی آواز سب کو سنائی دے رہی تھی اور اسی لمحے دروازے کی چوکھٹ پر دھول اڑاتے دو نفوس اور بھی اندر آئے تھے۔

”اپنے نادان باپ کو معاف کر دو میری بچی!“ رانا آفاق بے اختیار آگے بڑھ کر بولے۔ کمرے میں موجود سکوت ٹوٹ گیا تھا۔

”میں بھول گیا کہ میں تمہارا باپ ہوں‘ میں نے اپنی عزت اور ذلت کی تمام قیمت سود سمیت تم سے وصول کی اور تمہیں دھول ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔“ فارہ اپنے باپ کے سینے سے لگ کر بری طرح سسک اٹھی۔

ستون کے قریب کھڑی طاہرہ نے بمشکل ستون کو تھاما۔

”پوچھو عاصم سے میں نے اسے کتنے فون کیے؟ کتنی مرتبہ تمہارا پوچھا۔ کتنی مرتبہ اس سے التجا کی میری فارہ کو اذیت دینا چھوڑ دو‘ میں بس تمہارے سامنے آنے سے ڈرتا تھا۔ کل رات تمہیں بار بار روتے خواب میں دیکھتا رہا۔ صبح اتنا دل پریشان ہوا کہ ان کے پیچھے ہی چل پڑا۔“ وہ فارہ کو بار بار پیار کر رہے تھے۔ فارہ کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے جن پر وہ نرمی سے ہاتھ پھیر رہے تھے۔

”ابو جی! آپ سے ناراض نہیں ہو سکتی۔“ فارہ نے ان کے دونوں ـــــ ہاتھ تھام کر روتے ہوئے کہا تو رانا آفاق کے سینے میں اٹھتی ٹیس ذرا سی کم ہوئی تھی۔

عاصم کمرے کی چوکھٹ پر کھڑا دکھ سے فارہ کو دیکھتا ہوا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی ریوالور تھی اور اس سے چند قدم دور طاہرہ کھڑی تھی۔ بے آواز روتی ہوئی اور اس کے پیچھے فاخر کوئی نہیں جانتا تھا ان دو بھائیوں کے درمیان کھڑی طاہرہ آفاق دونوں کے دلوں میں نہیں ہے۔

”عاصم نے مجھ سے بہت پوچھا طاہرہ آپا کہاں ہیں اور کیوں گئیں؟ مجھے یہ تو نہیں پتا وہ کہاں ہیں۔ لیکن میں یہ جانتی تھی وہ کیوں گئیں۔“

فارہ کی بات پر کمرے میں موجود سب ہی افراد چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے اور باہر کھڑی طاہرہ کہنا چاہتی تھی۔

”نہ بتاؤ پلیز فارہ! اب میری بے گناہی ثابت مت کرو۔ مجھے گناہ گار ہی رہنے دو۔“ پانچ سال سے بہتے آنسوؤں میں اتنا درد اور خوف نہیں تھا‘ جتنا آج تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل سسکیوں کو روک سکی تھی اور فاخر وہاں موجود ہو کر بھی وہاں نہیں تھا۔ کمرے سے آتی فارہ کی آواز سینے میں موجود دل کو سلگا رہی تھی رُلا رہی تھی۔

”طاہرہ آپا اپنے نام کی طرح آج بھی پاکیزہ ہیں اور کل بھی پاکیزہ تھیں۔ کبھی آنکھوں دیکھا سچ نہیں ہوتا تو کبھی کانوں سنا! فاخر ـــ وہ انسان‘ جس کو مجھ سے محبت کا دعوا تھا اور وہ مجھ سے محبت کرتا تھا‘ لیکن محبت میں جنونی بھی تھا۔ وہ تمام رسم رواج توڑ دینا چاہتا تھا‘ اپنے اور میرے درمیان تمام ـــ دیواریں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ ہوٹلنگ کروں۔ شاپنگ پر جاؤں‘ لانگ ڈرائیو پر جاؤں۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پارکوں میں گھوموں‘ لیکن میں ایسا کیسے کر سکتی تھی‘ میں رانا آفاق کی بیٹی تھی اور مجھے میرے اسلام نے بھی اپنی حدود توڑنے کی اجازت نہیں دی‘ لیکن اسے تو اپنی جوانی پر مان تھا۔ وہ مجھے شادی سے پہلے زیر کرنا چاہتا تھا۔ جھکانا چاہتا تھا۔ جب اس نے مجھے زیادہ تنگ کیا تو طاہرہ آپا درمیان میں آ گئیں۔ میرے لیے ڈھال بن گئیں اور فاخر کو لگنے لگا تھا کہ

طاہرہ آپا مجھ پر سختی کر رہی ہیں اور مجھے اس سے ملنے نہیں دیتیں۔ بس یہیں سے غلطی کا آغاز ہوا۔ شادی کی تاریخ رکھ لینے کے باوجود وہ اپنی بے جا خواہشات سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ اس نے مجھے باہر ملنے کے لیے بہت بلایا' میں نہیں گئی اور اس کی بے بسی' غصہ انتقام میں بدل گیا اور وہ ہمارے گھر آگیا اس دن میں اور امی بازار گئے تھے اور ابو جاب ۔۔۔ پر' طاہرہ آپا نے یہ سوچ کر اسے اندر بلا لیا کہ وہ اسے سمجھائیں گی۔

مگر۔ وہ تو انتقام لینے آیا تھا۔ طاہرہ آپا نازک سی لڑکی۔ اور وہ اک بھرپور مرد۔ وہ اپنی مدد کے لیے کسی کو پکار بھی نہ سکیں اور وہ اپنے بھائی کی عزت لوٹ کر چلا گیا۔"

عاصم کے ہاتھ سے ریوالور نیچے جا گریں سب ساکت بیٹھے رہ گئے۔ جیسے ابھی تک کسی کو یقین ہی نہ آیا ہو۔ بھلا یوں کوئی اپنی عزت کو بھی لوٹا کرتا ہے۔

"گناہ تو گناہ ہی ہوتا ہے چاہے اندھیرے میں کیا جائے یا روشنی میں۔" رانا آفتاب کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔ وہ مریم نہیں تھی' جس کی گواہی آسمان سے اتر آتی۔ وہ تو طاہرہ آفاق تھی جسے باپ کا بھی خیال تھا اور بہن کا بھی۔ پھر وہ عاصم سے محبت کرتی تھی اور محبت کرنے والے دھوکا نہیں دیا کرتے۔ اس مشکل وقت میں انہیں جو مناسب لگا اسی پر عمل کر ڈالا۔ خاموشی سے گھر سے نکل گئیں۔ انہیں کیا پتا گھر سے نکل جانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اپنے تو قدم زخمی کیے۔ پیچھے رہ جانے والوں کو بھی لہولہان کر دیا۔ وہ گھر سے اکیلی گئی تھیں۔ میں نے ان کی ڈائری پڑھی تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا میں کیا کروں' میں نے شدید غصے میں فاخر کو فون کیا اور بہت برا بھلا کہا۔ فاخر نے کہا میں اسے تلاش کرنے جا رہا ہوں اگر وہ مل گئی تو واپس لے آؤں گا اور آکر اس سے نکاح کرلوں گا۔ اگر نہ ملی تو میں بھی کبھی نہیں آؤں گا۔ فاخر نے اپنی طرف سے ایک لیٹر لکھ کر چھوڑ دیا' میں نے بالکل ویسا ہی لیٹر آپا کی رائٹنگ میں لکھ دیا۔ مجھے پتا تھا طاہرہ آپا اگر فاخرہ کو مل بھی گئیں تو لوٹ کر کبھی نہیں آئیں گی۔" کمرے میں موجود ہر انسان ہی سکتے میں تھا۔

"میں نے یہ سب اس وقت اس لیے نہیں بتایا کہ ہماری عزتیں تو برباد ہو ہی گئی تھیں۔ میرے بتانے پر طاہرہ آپا شاید بچ جاتیں' لیکن فاخر یا تو پولیس کے ہاتھ لگ جاتا یا پھر عاصم کے ہاتھوں قتل ہو جاتا پھر کیا بچتا۔ تایا جی نے بھی شاید یہی سوچ کر میرا نکاح عاصم سے کروایا تھا تو پھر میں کیسے اپنے ہاتھوں اپنا خاندان ختم کرتی۔ اس لیے میں نے اپنی قربانی دے دی۔"

"بس کرو فارعہ۔ خدا کے لیے بس کرو۔" باہر کھڑا فاخر پوری قوت سے چیخا تھا اور شدت سے روتا ہوا دیوار میں سر مارنے لگا تھا۔ کمرے میں موجود تمام لوگ جو اب تک ساکت تھے' آواز سن کر اپنی جگہ سے ہل گئے تھے عاصم کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ طاہرہ اور اس کے پیچھے جنونی حالت میں روتا ہوا فاخر۔ سب سے پہلے راحیلہ بیگم بھاگ کر آئیں۔

بچوں کی طرح روتا ہوا فاخر ماں سے لپٹ گیا۔ جبکہ طاہرہ باپ اور بھائی کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگی تھی۔ سب ہی جان گئے تھے وہ بے قصور ہے۔ سب نے کھلے دل سے اسے قبول کرلیا' عاصم ساکت کھڑا تھا۔

"امی جی۔ فارعہ سے کہیں مجھے معاف کر دے میں اپنے غلیظ وجود کو سزا دیتے تھک گیا ہوں۔ میں نے پورے پانچ سال کانٹوں پر گزارے ہیں۔ طاہرہ سے بھی ہر دن' ہر لمحہ معافی مانگی ہے لیکن اس نے مجھے معاف نہیں کیا۔ اس مرنے والے بچے سے بھی' جس نے اک سانس بھی دنیا میں لینا گوارہ نہ کیا۔ فارعہ سے کہیں مجھے معاف کر دے۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا۔ میں آج بھی اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔" فارعہ کی آنکھوں سے کئی آنسو ٹوٹ کے بکھرے تھے۔ یہ کیسی محبت تھی' جو ذلت کی آخری انتہا بھی پار کر گئی۔

فاخر نے اپنا سر دیوار پر مار مار کر زخمی کرلیا تھا اور راحیلہ بیگم اسے سنبھالنے میں ناکام ہو گئی تھیں۔ عاصم کے قدموں میں گری ریوالور اطہر نے اٹھائی

تھیں۔

"امی جی۔۔۔ میں نے رب کی رضا کے لیے فاخر کو معاف کیا۔" فارہ کا سانس اٹک رہا تھا۔

طاہرہ نے فارہ کے ہاتھ تھام لیے اور نم آنکھوں سے کہا۔

"میں نے بھی اسے معاف کیا۔" مزید کسی کے کہنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ فاخر کچھ پل سر اٹھا کر عاصم کو دیکھتا رہا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ فاخر نے اپنے درد کو ماں سے بانٹ لیا۔ اک نظر شرمندگی کی سب پر ڈالی اور باہر کی طرف قدم بڑھادیے۔ کوئی نہیں جانتا تھا اب وہ واپس کبھی آئے گا یا نہیں؟

"جگر کا کینسر اور گردے ختم ہو چکے ہیں' مرض آخری اسٹیج پر ہے۔ عا۔۔۔صم۔۔۔ یہ کس کی رپورٹ لے آئے ہو۔"

اطہر نے بے یقینی سے عاصم سے پوچھا اور عاصم کی آنکھوں سے سفید موتی بہہ نکلے۔ بے بسی کی انتہا تھی۔ کمرے میں موجود سب ہی لوگ اک بار پھر پل صراط سے گزر رہے تھے۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ فارہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ اب اسے خوشیاں دیکھنی ہیں۔" فارہ کی ماں روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی جبکہ فارہ بمشکل اپنا سانس کھینچ رہی تھی بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ۔

"عاصم۔" اس نے عاصم کو پکارا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس آیا تھا۔

"فارہ! تم فکر مت کرو۔ یہ رپورٹس جھوٹ ہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ ہم نے رات ہی وعدہ کیا ہے ایک ساتھ رہنے کا۔ ساتھ چلنے کا۔" عاصم روتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیے بے تابی سے کہہ رہا تھا جب کہ فارہ کے ایک ہاتھ میں طاہرہ کا ہاتھ تھا۔

"طاہرہ۔۔۔ آپا۔ تمہاری امانت ہیں۔" طاہرہ جو عاصم کی تڑپ دیکھ کر بے جان ہو رہی تھی' چونکی۔

"نہیں! فارہ۔۔۔" اور فارہ کے پاس وقت ہی کب تھا۔ سب پکارتے رہ گئے اور وہ۔۔۔ چلی گئی۔ آنے والی نسلوں پر سے داغ مٹانے کے لیے کسی اک کو تو مٹنا ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

"فارہ۔۔۔ فارہ پلیز مت جاؤ! میں تمہیں کبھی نہیں ماروں گا۔ مجھے معاف کر دو میرے پاس آجاؤ۔ فارہ۔ فارہ۔" وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اچانک ڈر کے اٹھا۔

"عاصم۔۔۔ عاصم کیا ہوا؟" طاہرہ جو قریب ہی سوئی ہوئی تھی۔ اس کی آواز سن کر اٹھی عاصم نے اس کی آنکھوں کو چھوا تھا۔

"تم فارہ ہو! تم۔۔۔ جاؤ گی تو نہیں نا! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔"

وہ نیم اندھیرے میں طاہرہ کے دونوں ہاتھ تھامے کسی بچے کی طرح جیتی سہارا مانگ رہا تھا۔

فارہ کی موت کو کتنے سال بیت گئے تھے' لیکن عاصم آج تک اس کی موت کو قبول نہیں کر پایا تھا۔ فارہ سے کیا گیا آخری عہد تو پورا کر لیا تھا اور ان کی ایک چار سالہ بیٹی بھی تھی۔ مگر وہ جاتے ہوئے عاصم کا دل ساتھ لے گئی تھی۔ وہ دن بھر کتنا بھی مصروف رہتا' لیکن رات کو سوتے ہوئے وہ فارہ کو پکارنے لگتا' رونے لگتا اور پھر فارہ کی محبت میں اس طرح تڑپتا کہ طاہرہ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ طاہرہ نے بھی اس سے عشق کیا تھا۔ رشتوں پہ اتنی دھول کو طاہرہ نے آخری سانس تک جھاڑنا تھا۔ رانا آفتاب کے دونوں بیٹوں نے رانا آفاق کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ انتہائی سلوک کیا تھا۔

اور ان دونوں لڑکیوں نے ہی اپنی عزت اور جان پر کھیل کر خاندان کی لاج رکھی تھی۔ ایک اپنے حصے کا کام کر گئی۔ دوسری بھی خود کو امر کرنے کی کوشش میں تھی۔ دوسری طرف رانا آفتاب کے بیٹے بھی اپنی انتہا پسندی کا خمیازہ بھگت رہے تھے۔ ایک رشتوں سے جڑنے کے بعد بھی۔ ایک رشتوں سے کٹنے کے بعد بھی۔

نبیلہ عزیز

ماورا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔

منزہ' ثمینہ اور نیوہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیوہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ رضا حیدر' تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔

۲۰ بیسویں قسط

وہ زیر لب دہرا کے رہ گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں دادی بننے والی ہوں۔۔۔ میرے مالک نے مجھ پہ کرم کر دیا ہے۔ اپنی رحمت سے نواز دیا ہے مجھے۔۔۔ میری جھولی بھر دی ہے۔" ثمینہ یزدانی خوشی کی انتہا میں پاگل ہوئی جا رہی تھیں اور فارہ کے چہرے پہ زندگی سے بھرپور رنگ دوڑ گئے تھے۔

جبکہ آفاق کے چہرے کے تاثرات ہنوز وہی کے وہی تھے۔ عجیب گم صم سے۔۔۔ اور کھوئے ہوئے۔

"اب ہم نے رکنا ہے یا گھر جانا ہے؟" فارہ کو ایک نئی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ وہ جلد سے جلد گھر جانا چاہتی تھی۔

"ظاہر ہے بیٹا! رکنا پڑے گا۔ تمہیں ابھی مکمل ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔" ثمینہ یزدانی اس کی سمت پلٹتے ہوئے بولیں۔

"لیکن آنٹی۔۔۔ !میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ مجھے کوفت ہو رہی ہے اسپتال سے۔۔۔ میری طبیعت اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔" فارہ بےزار اور روہانسی سی ہو رہی تھی۔

"ارے نہیں میری جان۔۔۔ گھبراؤ مت۔۔۔ میں ابھی تمہاری ڈاکٹر سے مشورہ کرتی ہوں۔ اگر انہوں نے گھر جانے کی اجازت دے دی تو ہم ابھی گھر چلے جائیں گے۔ آؤ آفاق تم بھی میرے ساتھ آجاؤ۔"

ثمینہ یزدانی دوبارہ دروازے کی طرف مڑتے آفاق سے مخاطب ہوئی تھیں اور آفاق کسی روبوٹ کی طرح سر ہلا کر ان کے پیچھے چل دیا تھا' وہ دونوں ماں بیٹا آگے پیچھے چلتے راہداری میں نکل آئے تھے۔

"یہ خوش خبری تمہارے ڈیڈی نے سن لی تو سارے کام چھوڑ چھاڑ کے فوراً" اسپتال پہنچ جائیں گے۔۔۔ جانتے ہو کتنی خوشی ہوگی ان کو۔۔۔؟" ثمینہ یزدانی اپنے دھیان میں چلتے ہوئے بول رہی تھیں اور پھر اچانک چلتے چلتے رک گئی تھیں اور یک دم پلٹ کر اپنے پیچھے چلتے آفاق کو دیکھا تھا۔

ان کے اس طرح اچانک رکنے اور اچانک دیکھنے پہ وہ بھی رک کر دیکھنے لگا تھا۔ اسے ثمینہ یزدانی کی تنقیدی اور تشویش بھری نظریں سر سے پاؤں تک محسوس ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے آفاق۔۔۔ ؟میں کچھ غلط نوٹ کر رہی ہوں؟ یا تم خود کچھ غلط نوٹ کروا رہے ہو؟" ثمینہ یزدانی کافی کھوجنے والے انداز سے بولی تھیں۔ مگر وہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔ ؟میں کیا غلط نوٹ کروا رہا ہوں؟" اس کے انداز میں بھی ناسمجھی تھی۔

"یہی کہ تم یہ خوش خبری سن کر خوش نہیں ہوئے بلکہ گم صم ہو گئے ہو۔۔۔ ؟تمہاری ہوائیاں اڑ گئی ہیں؟" ثمینہ یزدانی نے جو محسوس کیا تھا وہ کہہ بھی دیا تھا اور آفاق ان کی بات سن کر چند ثانیے کے لیے خاموش سا ہو گیا تھا۔

"کبھی کبھی کوئی وقت کوئی سچویشن ایسی ہوتی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کی ہوائیاں اڑ جاتی ہیں' اور دیکھنے والوں کو صحیح بھی غلط نظر آتا ہے یوں سمجھ لیں کہ اس وقت مجھ پہ بھی ایسی ہی سچویشن ہے' میرے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہیں تو پتا نہیں کس وجہ سے اڑی ہیں؟ اور آپ کو پتا نہیں کیا وجہ نظر آ رہی ہے؟"

آفاق نے ذرا توقف سے بڑا ٹھہرا ہوا اور سنبھلا ہوا جواب دیا تھا اور ثمینہ یزدانی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی چپ ہو گئی تھیں۔

"مسز یزدانی۔۔۔ !آپ کو ڈاکٹر بلا رہی ہیں۔ پھر انہوں نے راؤنڈ پہ جانا ہے۔"

سامنے سے آتی نرس ان کے قریب آ کر رک گئی تھی اور وہ دونوں ماں بیٹا چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔

"ہوں۔۔۔ !میں ان ہی کی طرف جا رہی ہوں۔" ثمینہ یزدانی سر ہلا کر کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھیں اور آفاق بھی مجبوراً" ان کے پیچھے چل پڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

تیمور صبح آفس جانے کے لیے گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ رضا حیدر کی آواز پہ اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"آج ذرا جلدی گھر آجانا۔۔۔" ان کی بات پہ تیمور یکدم پلٹا تھا۔

"خیریت۔۔۔؟" اس کا لہجہ نجانے کیوں تیکھا ہو گیا تھا۔

"قیام مرزا کی فیملی آرہی ہے۔ عزت کو انگوٹھی پہنانے کے لیے۔" وہ بڑے سکون سے بولے تھے۔

"انگوٹھی۔۔۔؟" تیمور کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"ہاں۔۔۔ ابھی صرف انگوٹھی پہنانے آئیں گے' باقاعدہ انگیجمنٹ کی رسم چند دن بعد ارینج کریں گے اور ساتھ ہی نکاح کی رسم بھی ادا ہو جائے گی۔"

رضا حیدر بالا ہی بالا سب کچھ طے کر چکے تھے اور تیمور کو ان کے فیصلے پہ بے انتہا حیرت' اچنبھا اور دکھ ہوا تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہے ہیں؟

اپنے ہی بیٹے کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک رہے ہیں؟ اور بیٹی کا بھی ذرا خیال نہیں۔۔۔ وہ بھی وہ بیٹی جو ان کی بہت لاڈلی' چہیتی اور نازوں پلی تھی۔

"بابا جان۔۔۔! ایک بات پوچھوں آپ سے۔۔۔؟" تیمور نے کوئی بھی غصہ کرنے کے بجائے' بہت ہی مدھم اور دھیمے لہجے میں بڑا عاجزانہ سا سوال کیا تھا۔

"پوچھو۔۔۔!" انہوں نے بھی جوابا" کوئی رعایت نہیں بخشی تھی بڑا شاہانہ جواب دیا تھا۔

"آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا آپ کو عزت کی پسند ناپسند کا بھی خیال نہیں ہے؟ آخر وہ آپ کی لاڈلی بیٹی ہے' جس نے ہمیشہ ہر چیز اپنی پسند سے استعمال کی ہے۔ وہ آج یہ کام ناپسند ہوتے ہوئے بھی کیسے کر سکتی ہے؟" تیمور ان کے چہرے پہ نظریں جمائے پوچھ رہا تھا۔

"کر سکتی ہے۔۔۔ ضرور کر سکتی ہے۔ ہمیشہ ہم نے ہر کام اس کی پسند کے مطابق کیا ہے' ہمیشہ خیال رکھا ہے تو وہ کیوں نہیں کر سکتی؟ اسے بھی ہماری پسند کا خیال رکھنا پڑے گا۔ مونس مرزا ہماری پسند ہے اور اسے یہ پسند قبول کرنا ہوگی۔۔۔ ہر حال میں۔۔۔"

رضا حیدر کا لہجہ اٹل تھا اور تیمور نہ چاہتے ہوئے بھی اس اٹل چٹان سے ٹکرانے کا ارادہ باندھ بیٹھا تھا۔

"کبھی نہیں۔۔۔ میں اسے یہ پسند زبردستی قبول نہیں کروانے دوں گا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔" تیمور کا لہجہ ان سے بھی زیادہ اٹل ہو چکا تھا اور رضا حیدر پہلی بار تیمور کا یہ روپ دیکھ کر چونکے تھے۔

"تم میری ہی بیٹی کے لیے مجھے ہی چیلنج کر رہے ہو؟ مجھ سے ٹکرا رہے ہو؟"

ان کا انداز اور لہجہ رفتہ رفتہ تیکھا ہوتا جا رہا تھا۔ پل میں اتار چڑھاؤ آرہا تھا۔

"بات بیٹی کی نہیں ہے اور نہ ہی کسی ضد کی ہے۔ بس بات ایک انسانی دل کی ہے' جس پہ آپ بلاوجہ جبر کرنا چاہتے ہیں' لیکن میں کبھی جبر اور زور زبردستی کے حق میں نہیں رہا۔ نہ ہی ایسا کرنے دوں گا۔"

تیمور کے تیور زندگی میں پہلی بار سامنے آئے تھے اور وہ دونوں باپ بیٹا زندگی میں پہلی بار یوں دوبدو ہوئے تھے۔

"میں کسی انسانی دل کو نہیں جانتا۔ نہ ہی ان چیزوں پہ بھروسہ رکھتا ہوں۔ یہ دل وِل سب بے کار ہے۔ بس پریکٹیکل لائف ہی سب کچھ ہوتی ہے اور آج کل کی پریکٹیکل لائف پیسہ مانگتی ہے' دولت مانگتی ہے' دل نہیں مانگتی۔ دل کے قصیدے پڑھنا غریب اور بھوکے ننگے لوگوں کا کام ہے۔ ہماری کلاس میں یہ نہیں دیکھا جاتا اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ میں عزت کی زندگی سنوارنے کا سوچ رہا ہوں اور تم عزت کی زندگی بگاڑنے کا سوچ رہے ہو' اپنی سوچ کو بدلو اور وہ سوچو جو میں سوچ رہا ہوں۔"

رضا حیدر نے آخر میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ جس پہ تیمور بے ساختہ بدک گیا تھا۔

"واشے۔۔۔؟ میں کیا سوچوں؟ یہ کہ پریکٹیکل لائف کے لیے پیسہ ضروری ہے۔ فلاں نہیں؟ یہ بھوکے ننگے لوگوں کا مشغلہ ہے؟ ہونہہ۔۔۔ بابا۔۔۔ اگر آپ کی یہ سوچ درست ہے تو پھر مجھ سے زیادہ بھوکا ننگا تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جو اپنی بھوک اور غربت کا کشکول لیے روزنامہ وار امرتضیٰ کے در پہ پہنچا ہوا ہوتا ہوں۔"

تیمور نے رضا حیدر کے اعصاب پہ ایک اور بم پھوڑ دیا تھا اور رضا حیدر نے کسی زہریلے سانپ کی طرح پھنکار کر اسے دیکھا تھا۔

"یعنی کہ تم دونوں بہن بھائی ایک ہی لائن پہ چل رہے ہو؟"

"یہ لائن نہیں ہے بابا جان۔۔۔ یہ عطا ہے۔۔۔ اللہ کی عطا۔۔۔ تحفہ ہے، توفیق ہے، یہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔۔۔ ہم دونوں بہن بھائی خوش قسمت ہیں کہ اللہ نے یہ تحفہ ہمیں عطا کیا ہے۔۔۔ ہمیں توفیق دی ہے اس کی۔۔۔ اور اگر اللہ نے توفیق دی ہے تو ان شاء اللہ اس کو نبھانے کی ہمت بھی دے گا۔"

تیمور کہہ کر پلٹ گیا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔" رضا حیدر دھاڑ اٹھے تھے۔

"ایسا ہوگا۔۔۔ اور آج ہی ہوگا، اس کا نتیجہ رات کو ہی دیکھ لیجیے گا، جب قیام مرزا کی فیملی یہاں آئے گی۔"

اس نے جاتے جاتے پلٹ کر دوبارہ ان کو جواب دیا تھا۔

"تیمور۔۔۔! تم مجھ سے ٹکر لے رہے ہو۔۔۔؟"

"میں ٹکر نہیں لے رہا۔۔۔ اپنی بہن کی بھلائی سوچ رہا ہوں۔ اگر آپ بدمزگی نہیں چاہتے تو ان کی فیملی کو رنگ پہنانے سے روک دیں۔۔۔ منع کر دیں گھر آنے سے۔۔۔ ورنہ میرے ردعمل کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔"

تیمور نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اعلان کر دیا تھا۔

اور رضا حیدر نے چند سیکنڈز کے لیے ہونٹ اور مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ دیکھتا ہوں تمہارا ردعمل اور اس ردعمل کے بعد کا عمل بھی ذہن میں رکھ لینا، تم نے میرا پیار دیکھا ہے۔۔۔ میرا قہر نہیں دیکھا۔" رضا حیدر چبا کر بولے تھے۔

"زندگی رہی تو وہ بھی دیکھ لوں گا۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔" تیمور بھی کہہ کر باہر نکل گیا تھا اور یوں باپ اور بیٹے کی جنگ کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔

☆☆☆

تیمور بہت ہی تنے ہوئے اعصاب لے کر اپنے آفس میں داخل ہوا تھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا بیگ اور اپنا کوٹ انتہائی کوفت سے صوفے پہ اچھال دیے تھے اور اپنی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں یہ تھام لیا تھا یوں جیسے سر کے بال مٹھیوں میں بھینچ لیے ہوں۔

آج پہلی بار اس کے گھر کی ٹینشن اس کے آفس تک اس کے ساتھ آئی تھی، ورنہ ہمیشہ وہ اپنے آفس بڑے خوش گوار موڈ کے ساتھ آتا تھا۔

"اب کیا ہوگا۔۔۔؟ بابا جان جیسے پہاڑ سے ٹکرانا ہوگا؟" اس نے یونہی سوچتے ہوئے سر ذرا سا اونچا کیا تو نظریں اپنے سامنے ٹیبل پر رکھے سفید لفافے پہ جا پڑی تھیں۔

"نادر امرتضیٰ۔۔۔" لفافے پہ لکھا نام پڑھ کے تیمور کے اعصاب اور کھنچ گئے تھے اور ذہن مزید چوکنا ہو گیا تھا۔

"نادر کا لیٹر۔۔۔؟" اس نے زیر لب دہراتے ہوئے وہ لفافہ اٹھا لیا تھا اور فوراً "چاک" بھی کر ڈالا تھا۔

"مسٹر تیمور حیدر ... میں ... مس ماورا مرتضیٰ ... آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ تمام کاغذات تیار کروائیں ... میں نکاح نامے پہ سائن کروں گی ... مجھے یہ پروپوزل قبول ہے۔"

سفید کاغذ پہ لکھا ماورا کا یہ اقرار نامہ پڑھ کے تیمور سچ مچ تھوڑی دیر کے لیے ساری پریشانیاں بھول گیا تھا۔

اور اس کا دل بلیوں اچھلا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔

آج بڑی مدت اور بڑی ریاضت کے بعد یہ چند لفظ اس کے نصیب میں آئے تھے اور اس نے اپنے اندر کی شدت سے مجبور ہو کر بے اختیار وہ لفافہ اور وہ کاغذ ہاتھوں میں بھینچ لیے تھے۔

"آئی لو یو ماورا ... آئی لو یو سو مچ۔" اس کے منہ سے نکلے ایک ایک لفظ سے اس کی محبت کی شدت جھلک رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

حسب توقع ماورا کا موبائل گنگنایا تھا۔

اور حسب توقع کال کرنے والا تیمور حیدر ہی تھا۔

"السلام علیکم ...!" ماورا نے کال ریسیو کی۔

"وعلیکم السلام ... کیسی ہیں مس ماورا مرتضیٰ ...؟" اس کا لہجہ اندرونی خوشی کے احساس سے چہک بھی رہا تھا اور کھنک بھی رہا تھا۔ ماورا نے فوراً محسوس کیا تھا۔

"بالکل ٹھیک ... ہمیشہ کی طرح۔" اس نے البتہ اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح کنٹرول میں ہی رکھا تھا۔

"تھوڑی دیر کے لیے ملاقات ہو سکتی ہے؟" اس نے بڑے اطمینان سے پوچھا تھا۔

"ہاں ... کیوں نہیں۔" اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز سے جواب دیا۔

"نہیں ... یہاں نہیں ... کہیں باہر ... کسی ریسٹورنٹ میں ...۔" تیمور اس سے کچھ معاملات پر بات کرنا چاہتا تھا۔

"یہ ضروری ہے کیا؟" اس نے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"میرے خیال میں تو بہت زیادہ ضروری ہے۔" تیمور کے لہجے میں سنجیدگی اور شرارت کا ملا جلا تاثر تھا۔

"اوکے ... اگر اتنا ضروری ہے تو مل لیتے ہیں۔ آپ جگہ بتا دیجیے۔" ماورا نے زیادہ بحث و تکرار میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اسی لیے جگہ کا پوچھنے کے بعد کال بند کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼
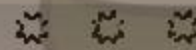
وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے کیوں کہ دونوں کے بیچ متواتر خاموشی حائل تھی۔

ماورا لاپروائی سے اپنے سامنے رکھے جوس کے گلاس میں اسٹرا ہلا رہی تھی اور وقفے وقفے سے کھڑکی سے باہر بھی دیکھ رہی تھی۔ تیمور کو پتا تھا کہ وہ بہت گہری لڑکی ہے، خود سے کبھی کچھ بھی نہیں کہے گی، اسی لیے اسے خود ہی بولنے میں پہل کرنا پڑی تھی۔

"میں آج بہت خوش ہوں۔" تیمور بمشکل اپنی خوشی کے اظہار کے لیے اپنے اندر ہمت مجتمع کر پایا تھا۔

"جانتی ہوں ...۔" ماورا نے بہت اعتماد سے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"مگر میں اپنی اس خوشی پہ پوری طرح سے خوش نہیں ہو پا رہا۔" تیمور کی اگلی بات پہ ماورا کو بے اختیار ٹھٹکنا پڑا تھا۔

"کیوں...؟" اس کا یہ "کیوں" بھی بہت بے ساختہ ادا ہوا تھا۔
"کیوں کہ گھر میں بابا جان نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر رکھا ہے؟" تیمور اس سے سب کچھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔
"مسئلہ...؟ کیسا مسئلہ...؟" ماورا کو اندر ہی اندر تشویش ہوئی تھی مگر اس نے کھل کے ظاہر نہیں کیا تھا۔
"عزت کے پرپوزل کا مسئلہ... وہ اپنے دوست قیام مرزا کے بیٹے مونس مرزا کا پرپوزل فائنل کرنا چاہتے ہیں... جبکہ عزت..." تیمور بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گیا۔
"کسی اور کو پسند کرتی ہے..." ماورا نے اس کا ادھورا جملہ پورا کر دیا تھا مگر تیمور نے چونک کر دیکھا تھا۔
"آپ جانتی ہیں...؟"
"پی جی کہتی ہیں کہ محبت خوشبو ہے اور خوشبو چھپ نہیں سکتی۔"
ماورا نے اتنے اچھے طریقے سے بات بیان کی کہ تیمور بھی دیکھتا رہ گیا تھا۔
"آپ عزت کے حوالے سے کیا ارادے رکھتے ہیں...؟ کیا سوچا ہے...؟" اس نے تیمور کی نظروں کی محویت توڑتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔
"میں اس کی پسند کا احترام کرتا ہوں اور مونس مرزا کے پرپوزل پہ عزت کی پسند کو ترجیح دیتا ہوں۔" وہ بھی سنجیدگی کے لبادے میں آ گیا تھا۔
"ہوں... دیٹس گریٹ... ولید رحمان واقعی بہت اچھا لڑکا ہے۔" ماورا نے سراہا تھا اور تیمور ایک بار پھر حیران ہوا کہ وہ واقعی سب کچھ جانتی ہے۔ اس کے بتانے سے بھی پہلے...؟
"لیکن یہ بات بابا جان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ولید رحمان اچھا ہے یا برا انہیں کوئی سروکار نہیں ہے۔" تیمور نے خفگی سے سر جھٹکا۔
"تو آپ کے بابا جان کے نزدیک کیا چیز اہمیت رکھتی ہے؟" ماورا کا سوال کافی تیکھا اور نپا تلا سا تھا۔
"کلاس..." تیمور نے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔
"دوسرے لفظوں میں دولت... ہے نا...؟" ماورا نے تصدیق چاہی۔
"ہاں..." اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"مگر وہ تو نہ میرے پاس ہے نہ ولید رحمان کے پاس... آپ کے بابا جان ہمیں قبول کیسے کریں گے؟" اب کی بار اس نے سوال تھوڑا بدل دیا تھا اور ولید رحمان کے ساتھ خود کو بھی شامل کر لیا تھا۔
"بابا جان قبول نہیں کریں گے تو ہمیں دوسرا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔" تیمور جیسے کچھ سوچ بیٹھا تھا۔
"دوسرا راستہ...؟" وہ چونکی۔
"کورٹ میرج..." اس نے مختصراً کہا۔
"کورٹ میرج...؟" ماورا نے بے اختیار زیر لب دہرایا تھا۔
"ہاں... اس مسئلے کا آخری حل یہی ہو گا کہ میں عزت اور ولید کی کورٹ میرج کروانے کے بعد خود بھی کورٹ میرج کر لوں گا۔ میرے ساتھ کورٹ میرج کرنے میں آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا نا...؟" اس نے ماورا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
وہ چند ثانیے چپ رہی تھی اور اس کی چپ پہ تیمور کو بے چینی ہوئی تھی۔
"ماورا...؟" تیمور کے اس طرح پکارنے پہ ماورا نے بے ساختہ اس کی سمت دیکھا تھا۔ دونوں کی نظروں کا بڑا نرم سا تصادم ہوا تھا۔
"مجھے اس نازک مرحلے پہ آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ ہماری شادی کبھی بھی دھوم دھام سے نہیں

ہو گی۔۔۔ اس لیے ہمیں کورٹ میرج ہی کرنا پڑے گی۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو۔۔۔؟"
وہ بہت نرمی سے تحمل سے بڑے ٹھہراؤ سے پوچھ رہا تھا۔ ماورا اس کی بات پہ گہری سانس کھینچ کے رہ گئی تھی۔
"او کے۔۔۔! جیسا آپ کو مناسب لگے۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے رضامندی دے دی تھی اور تیمور کے چہرے پہ خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔
"تھینک یو ماورا۔۔۔ تھینک یو سو مچ۔۔۔" تیمور نے میز پہ رکھا اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا تھا اور ماورا ایک دم بھڑک گئی تھی۔
"تیمور۔۔۔!" اس نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا اور تیمور نے اس کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔
"گستاخی معاف۔۔۔ بے اختیاری میں ایسا کر گیا۔۔۔" تیمور کے لہجے اور نظروں سے شرارت پھوٹ رہی تھی۔ ماورا کا چڑنا چاہتے ہوئے بھی سرخ پڑ گیا تھا۔
"آپ عزت اور ولید کی بات کر رہے تھے غالباً۔۔۔؟" اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔
"ہاں۔۔۔ آج قیام مرزا کی فیملی عزت کو رنگ پہنانے کے لیے ہمارے گھر آ رہی ہے اور میں فائنلی بات طے کرنے ولید کے گھر جا رہا ہوں۔ اس لیے اب دیکھتے ہیں کہ رزلٹ کیا آتا ہے۔۔۔؟"
تیمور بات ختم کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا کیونکہ ماورا بھی اپنا بیگ بند کر رہی تھی۔
"اچھی بات ہے۔۔۔ آپ کے ساتھ ساتھ میرا ووٹ بھی ولید رحمان کے حق میں ہے۔۔۔ اگر آپ میں یہ جنگ لڑنے کی ہمت ہے تو ضرور لڑیے۔۔۔ ان شاء اللہ جیت آپ کی ہی ہو گی۔"
ماورا بھی کہتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی اور تیمور اس کی ایسی حوصلہ افزائی پہ مزید مضبوط ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
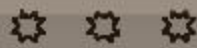
"ولید۔۔۔! سنبھل کے۔۔۔" وہ اپنے بستر سے اٹھ کر اسٹک کے سہارے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کمرے سے صحن میں نکل آیا تھا۔
"اب کافی بہتر ہوں امی۔۔۔! آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔" ولید آج بڑے فریش موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ کیوں کہ آج بڑے دنوں بعد اس نے زمین پہ قدم جمائے تھے۔
"ککو۔۔۔ وحید۔۔۔ باہر نکلو۔۔۔ بھائی کو سہارا دو۔۔۔" زبیدہ خاتون نے ولید کے پیچھے نکلتے ہوئے باقی دونوں کو آواز دی تھی اور وہ دونوں اپنا اپنا ہوم ورک چھوڑ کر باہر بھاگے آئے تھے۔
"واؤ۔۔۔ بھائی آج خود چل رہے ہیں۔۔۔؟" ککو اور وحید خوشی سے چیخ اٹھے تھے۔
"آئیے۔۔۔ ہم آپ کو واک کرواتے ہیں۔" ککو لپک کے اس کے قریب آئی تھی اور ولید کا بازو تھام لیا تھا۔
"ارے میری جان۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ مجھے چلنے دو۔۔۔ سہاروں کی عادت پڑ جائے تو اچھا بھلا آدمی بھی اپنے قدموں پہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔" ولید نے مسکراتے ہوئے چھوٹی بہن کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"بہن بھائی سہارا نہیں ہوتے۔۔۔ بازو ہوتے ہیں اور مشکل وقت میں انسان کے بازو ہی اسے سنبھالتے ہیں اور اس کے کام آتے ہیں۔" زبیدہ خاتون کام کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں سمجھا بھی رہی تھیں۔
"کیا صرف بہن بھائی ہی بازو ہوتے ہیں۔۔۔؟ کوئی اور بازو نہیں بن سکتا۔۔۔؟" تیمور حیدر کی آواز پہ وہ چاروں ہی چونک گئے تھے اور یک دم دروازے کی طرف پلٹ کر دیکھا تھا۔
ان کے گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا تھا اور ادھ کھلے دروازے سے ولید کو صحن میں آہستہ آہستہ چل

قدمی کرتے دیکھ کر تیمور بغیر اجازت کے ہی اندر آ گیا تھا۔
"میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے...؟" تیمور نے پھر انہیں متوجہ کیا۔
"ارے بیٹا... کیوں نہیں... کچھ رشتے تو بہن بھائیوں سے بھی بڑھ کر عزیز ہوتے ہیں۔" زبیدہ خاتون سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کی سمت بڑھی تھیں۔
"تو پھر آپ کے اس خوددار بیٹے کے لیے میں کیوں عزیز نہیں ہوں؟" تیمور کا اشارہ ولید کی طرف تھا' ولید بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
"ارے یار... میرے دوست ہو تو دوست ہی رہو... محبوبہ مت بنو... تم سے محبت کا اظہار میں ہیانگ دہل کرنے سے تو رہا۔"
"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" تیمور کے چہرے پہ ناراضگی کا عنصر تھا اور ولید کلکو کو پیچھے ہٹا کے اسٹک کا سہارا لیتے ہوئے اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔
"فرمایئے جناب خادم حاضر ہے...؟" ولید نے سر خم کرتے ہوئے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔
"نہیں یار...! سر خم کرنے تو میں آیا ہوں۔" تیمور کی بات ایسی تھی کہ ولید چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔
"کیا مطلب...؟ سر خم کرنے آئے ہو...؟" ولید کے دل کو کچھ ہوا تھا۔
"آؤ بیٹھو... بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" تیمور نے اسے اپنے بازو کا سہارا دیتے ہوئے کہا اور پھر آہستہ آہستہ چلتے اندر آ گئے تھے۔
"خیریت تو ہے نا تیمور...؟" ولید کی پریشانی دیدنی تھی۔
"فی الحال تو خیریت ہی ہے' لیکن آگے بھی خیریت ہی ہو گی اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔"
"پلیز تیمور... مجھے پہیلیاں مت بجھواؤ' صاف صاف بتاؤ... مسئلہ کیا ہے؟" ولید کی بے چینی حد سے سوا ہو چکی تھی کیوں کہ اسے اندازہ ہو چکا تھا... کہ معاملہ کس سے متعلق ہے؟
"دیکھو ولید...! میں جانتا ہوں کہ عزت تمہیں پسند کرتی ہے اور اس کی اس پسند پہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ولید کا سر خود بخود جھک گیا تھا... اسے امید نہیں تھی کہ تیمور اس طرح بلا جھجک اس سے بات کرے گا۔
"لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میں بھی عزت کا ساتھ نہ دے پاتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے تم پہ اعتبار ہے... میری نظر میں تم مجھ سے بھی زیادہ عزت دار' غیرت مند اور خوددار ہو... محنتی ہو... سمجھ دار ہو اور عزت کے لیے اس سے بہتر ہمسفر اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا... میں کسی دوسرے پہ بھروسا نہیں کر سکتا... تم پہ بھروسا ہے... بس یہی کافی ہے۔" تیمور خود ہی بات کر رہا تھا اور ولید سر جھکائے سب سن رہا تھا۔
"اور اسی بھروسے کے بل بوتے پہ میں چاہتا ہوں کہ تم سے پہلی اور آخری بار بات کروں اور کھل کے بات کروں...۔" ولید نے یکدم سر اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
"عزت سے کورٹ میرج کر سکتے ہو...؟" تیمور نے بڑے نپے تلے سے انداز میں ایک بم ولید کے سر پہ پھوڑ دیا تھا۔
"تیمور...؟ یہ... یہ کیا کہہ رہے ہو تم...؟" ولید ششدر رہ گیا تھا۔
"میں جو کہہ رہا ہوں بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں... کیوں کہ مجھے پتا ہے کہ ہمارے گھر میں ایک عظیم جنگ کا آغاز ہونے والا ہے اور اس جنگ کے نتیجے میں نقصان بھی عظیم ہی ہو گا۔"
تیمور کے لہجے کی سنجیدگی اور آواز کی گھمبیرتا ولید کے اردگرد خطرے کی گھنٹیاں بجانے کے لیے بہت تھے۔

"نقصان... ؟ کیسا نقصان...؟" وہ الجھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔" تیمور نے کندھے اچکائے۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو...؟" ولید نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اگر میں عزت کے لیے کوئی اسٹینڈ لوں تو تم میرا بازو بن کر میرا ساتھ دو۔" تیمور نے مسکرا کر دیکھا۔

"دوں گا یار... ضرور دوں گا۔" ولید نے اس کا ہاتھ زور سے تھپکتے ہوئے اپنے بھرپور قسم کے ساتھ کا اعلان کیا تھا۔

"صرف ساتھ ہی دینا ہو گا یا جان بھی دینی ہو گی...؟" ولید نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔

"میں تمہارا ساتھ مانگنے آیا ہوں' جان مانگنے نہیں آیا... جان دینے کی نوبت آئی تو اکیلا دوں گا... تم سے اس کام میں ساتھ نہیں مانگوں گا... اس کام کے لیے اکیلا ہی بہت ہوں۔"

تیمور نے بھی جواباً" اس کا کندھا تھپکا تھا۔

"اف... اللہ معافی دے... آپ لوگ کتنی دل دہلا دینے والی باتیں کر رہے ہیں۔" ککو ان کے لیے چائے لے کر آئی تھی اور کمرے میں آتے ہی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی تھی۔

ولید اور تیمور اس کے انداز پہ بیک وقت قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

"تیمور بھائی... ایک بات پوچھوں آپ سے...؟" ککو نے چائے کا کپ تیمور کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ضرور..." تیمور کا انداز لاپروا سا تھا۔

"آپ ماورا بجو کو دلہن کب بنا رہے ہیں...؟" ککو نے تو حد کر دی تھی' تیمور کو یکدم اچھو لگ گیا تھا۔

"ماورا بجو...؟" تیمور حیران پریشان رہ گیا۔

اور اس کی اس حیرانگی پہ ولید بھی ہنس پڑا تھا۔

"یار... یہ زمانہ بہت فاسٹ ہے... انسان کے اندر کی باتیں بھی شیشے کی طرح نظر آجاتی ہیں۔"

"بھائی... ! آپ کو برا لگا ہے میرا پوچھنا...؟" ککو نے منہ بسور کر پوچھا۔

"ارے نہیں سویٹ ہارٹ... ! تم بس ماورا بجو کو دلہن بنانے کی تیاری کرو... بہت جلد تمہاری خواہش پوری ہونے والی ہے۔" تیمور نے ککو کو اپنے قریب بٹھا لیا تھا۔

"اچھا... وہ کیسے...؟" اب کی بار ولید نے استفسار کیا۔

"وہ ایسے کہ اس نے اقرار کیا ہے کہ وہ اس کام کے لیے تیار ہے... میں جب چاہوں اسے دلہن بناؤں۔" تیمور نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بہت مزے سے بتایا تھا اور ولید اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔

"واٹ...؟ یہ کام بھی ہو چکا ہے...؟"

"ہاں جی... ! یہ کام بھی ہو چکا ہے۔" تیمور مسکرایا۔

"کب...؟" ولید کو حیرت پہ حیرت ہو رہی تھی۔

"آج ہی..." تیمور کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"اوہ تو یہ معاملہ ہے...؟" ولید نے بڑے ذومعنی انداز سے کہا تھا اور جواباً" تیمور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم بی گل... !" قارہ کال ریسیو ہوتے ہی پہچان گئی تھی کہ دوسری طرف بی گل ہیں۔

"وعلیکم السلام۔ کون فارہ بات کررہی ہے۔؟" بی گل نے پہچاننے کی کوشش کی۔
"جی ہاں۔ فارہ بات کررہی ہوں۔"
"کیسی ہو بیٹا۔؟" بی گل نے اس کا حال احوال پوچھا۔
"ٹھیک ہوں اللہ کا کرم ہے۔ ماورا کہاں ہے۔؟"
"ٹھہرو بیٹا۔ آرہی ہے وہ۔ شاور لے رہی تھی۔"
"اچھا۔! آنٹی کاسنائیں وہ کیسی ہیں؟" اس نے عافیہ بیگم کا پوچھا۔
"وہ تو ٹھیک ہے۔ تم اپنے میاں کا سناؤ۔ وہ کیسا ہے؟ کوئی خوش خبری وغیرہ نہیں ہے کیا؟"
بی گل کی بات پہ فارہ یکدم قہقہہ لگا کر ہنسی تھی اور اس کے اس طرح ہنسنے پر بی گل ٹھٹک گئی تھیں۔
"لگتا ہے کہ خوش خبری ہی ہے جو تمہیں اس طرح ہنسنے پہ مجبور کررہی ہے؟" انہوں نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔
"سو سویٹ بی گل۔ بہت ہی ذہین ہیں آپ۔" فارہ مسلسل ہنس رہی تھی۔
"ماشاءاللہ جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ گود ہری رکھے۔" انہوں نے ڈھیروں دعائیں دے ڈالی تھیں۔
"یہ لو ماورا آگئی ہے اس سے بات کرلو۔" انہوں نے قریب آتی ماورا کو موبائل تھمادیا تھا۔
"ہیلو۔!"
"ہائے کیسی ہو۔؟" فارہ کا لہجہ چہک رہا تھا۔
"بڑی کھنک ہے آج ایئرپیس میں۔" ماورا نے حیرت کا اظہار کیا۔
"آئی ہیو اے گڈ نیوز۔" فارہ کی آواز خوشی سے لبریز ہوئی جارہی تھی۔
"کیا۔؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔
"تم خالہ بننے والی ہو۔" فارہ نے بڑی ترنگ میں بتایا تھا۔
"رئیلی۔؟" ماورا کو بھی حقیقتاً سن کر خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔
"آف کورس یار۔ ابھی ہم لوگ آج ہی اسپتال سے گھر آئے ہیں۔" فارہ کی خوشی ماورا کی خوشی تھی۔
"مبارک ہو یار۔ بہت بہت مبارک ہو۔" ماورا بھی مسکرارہی تھی۔
"تم کہاں ہو۔؟" فارہ کو اس کے آفس کا خیال آیا۔
"گھر پہ۔!" ماورا پرسکون تھی۔
"کیوں۔؟"
"بس آج جلدی گھر آگئی تھی۔"
"خیریت۔؟" فارہ سوال پہ سوال کیے جارہی تھی۔
"ہاں۔ آئی ہیو اے گڈ نیوز۔" ماورا کے انداز میں سنجیدگی اتر آئی تھی۔
"گڈ نیوز۔؟" فارہ ٹھٹکی۔
"ہاں۔ گڈ نیوز۔"
"کیا۔؟"
"میں تیمور حیدر سے کورٹ میرج کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے ہامی بھرلی ہے۔" ماورا نے بڑے سکون سے انکشاف کیا تھا۔
"کورٹ میرج۔؟"

"ہاں۔۔۔ وہ کورٹ میرج چاہتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہے بھلا۔۔۔؟ کورٹ میرج ہی سہی۔۔۔ آخر میرج تو ہے نا۔۔۔؟" اس کے انداز میں لاپروائی تھی۔

"مگر کب۔۔۔؟" فارہ کو اپنی گدگدی ہی بھول گئی تھی۔

"یہ ابھی طے نہیں ہوا۔۔۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر مجھے دلہن بھی تو بننا ہے نا؟"

ماورا نے اسے چھیڑا تھا اور فارہ نے گم صم سے انداز میں فون بند کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دن بھر تمام کام نپٹانے کے بعد تیمور قیام مرزا کی فیملی سے پہلے ہی گھر پہنچ گیا تھا۔ شاور لے کر کپڑے تبدیل کیے تیار ہوا اور نیچے آگیا تھا۔

"السلام علیکم تیمور بھائی۔۔۔!" ساشا کی آواز پہ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے رک گیا تھا۔

"وعلیکم السلام کیسی ہو۔۔۔؟ آج اچانک کیسے۔۔۔؟"

تیمور ساشا کی بے وقت آمد پہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"ماموں نے بلایا تھا۔ عزت کی انگیجمنٹ کے لیے۔۔۔" ساشا نے قدرے دھیمے لہجے میں بتایا۔

"اوکے۔۔۔ تم جاؤ۔ عزت اپنے بیڈ روم میں ہی ہوگی۔" تیمور سر ہلا کر سامنے سے ہٹ گیا تھا اور ٹھیک آٹھ بجے مونس مرزا کی فیملی ان کے گھر پہنچ گئی تھی۔

رضا حیدر بڑے والہانہ انداز سے ان کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے۔ وہ لوگ باقاعدہ شگن لے کر آئے تھے ان کے ملازم فروٹ اور مٹھائی کے ٹوکرے لے کر اندر داخل ہوئے تھے اور تیمور ان لوگوں سے ملنے کے لیے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔۔۔!!!

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

سحرش خان بھٹہ

چاند میری چوکھٹ پر

ہمارے بس میں ہوتی جو زخم دل کی جھلک
ہم آئینے کو بھی اپنی طرح رلا دیتے!
ہمیں بھی جو روشنیوں پر دسترس ہوتی
کبھی چراغ جلاتے' کبھی بجھا دیتے!

"ہمارے بس میں ہوتی جو زخم دل کی جھلک۔۔۔"
اف کتنا درد تھا اس شخص کے لہجے میں "آخر آج اس درد کو الفاظ کی صورت دے ڈالی آپ نے زرار ارسلان ۔۔۔ وہی درد جو اکثر آپ کی آنکھوں میں نمی کی صورت ہلکورے لیتا دکھائی دیتا تھا۔ آج الفاظ کی شکل میں ڈھل کر اپنا اضطراب آشکار کر گیا۔

مشارب نے شام میں ہونے والی پارٹی کا وہ منظر یاد کرتے ہوئے سوچا پھر گلاس وال کے اس پار دیکھنے لگی۔ جہاں بارش کی بوندیں کن من کرتی لان کی گھاس پر برس رہی تھیں۔ لان میں پھیلی ہلکی سی روشنی میں بارش کی بوندیں ننھے منے موتیوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ ان سے نظر ہٹا کر اس نے اپنی مخروطی انگلیوں کی مدد سے چہرے پر پھیلی نمی کو صاف کیا اور ہٹ کر اپنے بیڈ پر آ گئی اور آنکھیں موندلیں مگر اگلے ہی پل ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ وہ مضطرب سا چہرہ اور روئی روئی سی بے خواب آنکھیں ایک بار پھر اس کے تصور کے پردے پر لہرا رہی تھیں۔

وہ اس شخص یعنی زرار ارسلان شاہ کے لیے آج سے نہیں بلکہ پچھلے سات سالوں سے یونہی مضطرب ہوتی آ رہی تھی۔ اس شخص کی اداس آنکھیں اور اضطراب میں لپٹا ہوا ہر ایک انداز مشارب کو اکثر ہی ڈسٹرب کر دیا کرتا تھا۔ لیکن آج شام ڈاکٹر زرار

مکمل ناول

ارسلان نے اپنی برتھ ڈے پارٹی میں وہ غزل گنگنا کر اسے ایک نئے اضطراب سے آشنا کر دیا تھا۔ زرار شاہ کے لہجے میں چھپے درد نے اس کو وہ رات یاد دلا دی تھی۔ جس نے آج سے سات سال پہلے مشارب سلطان کو زرار ارسلان کے کرب سے آگاہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں وہ سی ایم سی (چانڈکا میڈیکل کالج) کی اسٹوڈنٹ تھی۔ جب خاندان میں معاذ بھائی اور حرا آپی کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا تھا' یہ اطلاع اسریٰ نے فون پر مشارب کو دی تھی اور وہ حیران رہ گئی تھی۔

"بٹ اسریٰ! حرا آپی تو زرار لالہ سے انگیجڈ ہیں ناں۔۔۔؟"

"ارے۔۔۔ تمہیں نہیں پتا!" اسریٰ اس کی بے خبری پہ ہنس پڑی۔

"حرا آپی معاذ لالہ میں انٹرسٹڈ تھیں اور انہوں نے پچھلے دنوں خودکشی کی کوشش کی تھی نا جس کی وجہ سے دادی جان اور بڑے بابا وغیرہ کو اپنا برسوں پرانا فیصلہ بدلنا پڑا۔"

"او تو یہ بات ہے۔۔۔ یار کمال ہے۔ اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں۔۔۔" اس نے شکوہ کیا۔

"سوری مشی! اصل میں حالات ایسے تھے کہ تمہیں فون پر کیا بتاتی میں کہ کیا ہوا ہے!" اسریٰ نے معذرت خواہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" اس نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"پھر تم کب آرہی ہو؟" اسریٰ نے پرجوش لہجے میں استفسار کیا۔

"دراصل ان دنوں اسٹڈیز کا بہت برڈن ہو گیا ہے اس لیے شاید شادی سے ایک دو دن پہلے ہی پہنچ پاؤں گی۔"

"کیا! مشارب کی بچی! یہ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟ رومیل لالہ تو یہ سن کر ہی تمہارے پیچھے لاڑکانہ پہنچ جائیں گے۔۔۔ تمہیں پتا بھی ہے ان کا۔۔۔ وہ تو چھٹیاں لے کر کل ہی پہنچ رہے ہیں۔" وہ شروع ہو گئی تو مشارب اس کے انداز پہ ہنس پڑی تھی۔

"اُفوہ۔۔۔ ذرا رک کر سانس تو لے لیا کرو مجھے پتا ہے رومیل کا۔۔۔ میں سمجھا لوں گی۔ کیا کروں مجبوری ہے ڈاکٹر بننے کے لیے قربانی تو دینی پڑتی ہے ناں۔"

"ہاں بالکل کیوں نہیں۔۔۔" اسریٰ نے غصے سے کہہ کر کال کاٹ دی تھی اور وہ دھیمے سروں میں ہنس دی۔

جس دن اس نے قصر سلطان میں قدم رکھا تھا اس رات حرا آپی کی مہندی تھی۔ قصر سلطان کی رونقیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہاں۔ اسریٰ اور مشارب کچھ زیادہ ہی پرجوش نظر آرہی تھیں کیوں کہ یہ ان کے شعور میں خاندان میں ہونے والی پہلی شادی تھی۔ سو مہندی کے فنکشن کے لیے اپنی باقی تینوں کزنز کی طرح مشارب سلطان بھی خوب جی لگا کر تیار ہوئی تھی۔ اس کے لیے شاپنگ مما نے کی تھی چونکہ وہ بیٹی کی پسند جانتی تھیں' سو یہ ہی وجہ تھی مشارب کو اپنے لیے خریدی ہوئی ان کی ہر چیز پسند آئی تھی اور اس وقت بھی وہ مما کے لائے گئے سفید غرارہ سوٹ میں نفیس سی جیولری کے ساتھ کلائیوں میں ڈھیر ساری چوڑیاں چڑھائے بے حد معصوم و خوب صورت لگ رہی تھی۔

"اوہ ہو! یہ آج وائٹ فیری قصر شاہ کا رستہ کیسے بھول گئی۔۔۔؟" وہ سیڑھیاں اتر کر جیسے ہی نیچے آئی۔ رومیل نے اس کا رستہ روک لیا۔ وہ صرف اس کا کزن ہی نہیں بیسٹ فرینڈ بھی تھا۔ اس کے تعریف کرنے پر وہ کھل کر مسکرائی۔

"تھینک یو مسٹر کزن!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئی تھی۔ جبکہ اس کی اس درجہ بے نیازی پر رومیل اس کی پشت کو تکتا رہ گیا تھا۔

مما کی رشتہ دار خواتین سے ملنے کے بعد وہ منال اور اسریٰ کی طرف آگئی تھی جو اس وقت مہندی کی پلیٹیں

سجانے میں مصروف تھیں۔

"مشارب! تم ذرا دادی کے کمرے سے کینڈلز اور شانضو وغیرہ کے پیکٹس تو اٹھا لاؤ۔" بڑے سے تھال میں سے مہندی نکال کر ننھی سی بجی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے منال نے اس سے کہا۔ وہ "او کے میں ابھی آئی" کہتی وہیں سے پلٹ گئی مگر جب دادی کے کمرے سے مطلوبہ چیزیں اٹھانے کے بعد وہ باہر نکل رہی تھی تو گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی دادی جان نے اسے نیا حکم دے ڈالا تھا۔

"مشارب! ذرا زرار کو تو بھیجنا میرے پاس!"

"جی بہتر دادی جان" اس نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے جھٹ سے سر ہلا دیا تھا اور منال کو موم بتیاں پکڑانے کے بعد وہ زرار لالہ کے کمرے میں پہنچی تو ساکت رہ گئی۔

کمرے کے بیچوں بیچ قالین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھے وہ مکمل خود فراموشی کے عالم میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب تھے۔ شکوہ کر رہے تھے۔

کیوں اے اللہ! کیوں میرے ساتھ ہی کیوں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے؟

میرے نصیب کا تارہ ہی کیوں ہمیشہ ٹوٹ کر خاک میں جا ملتا ہے۔

"یہ اداسی یہ اضطراب میرے لیے ہی کیوں؟" پہلے مما چھین لیں آپ نے۔۔۔ اب حرا بھی۔"

"میں دیوانگی کی سرحدوں پہ کھڑا تھا۔ میں نے بھی تو حرا کو ہی چاہا تھا۔۔۔ تمام تر شدتوں کے ساتھ میں نے اس کا ساتھ مانگا تھا۔

"مگر ہوا کیا؟ ملا کیا؟ میری ہر دعا رائیگاں چلی گئی' ٹھکرا دیا اس نے مجھے سب کے سامنے۔ میرا سر جھکا دیا اس نے۔ ہر نگاہ طنزیہ انداز میں میری طرف اٹھتی ہے۔ میری شخصیت کا غرور' میرا سارا وقار حرا شاہ کے انکار نے خاک میں ملا دیا۔

دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں سر کے بال جکڑے وہ پوری شدت سے کہہ رہے تھے۔

مشارب کا پورا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے کب آنسو رواں ہوئے اسے پتا نہ چل سکا اور پھر وہ دبے پاؤں اس شکست خوردہ شخص کے کمرے سے نکل آئی تھی۔ نیچے لان سے آتی تیز میوزک کی آواز اسے زہر لگ رہی تھی۔ زرار ارسلان کے آنسو اور سسکیاں اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی مشارب کی سماعتوں میں گونج رہی تھیں۔ بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے دونوں گھٹنوں پہ اپنی پیشانی ٹکا کر وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

زرار لالہ کے غم پہ اس کا حساس سا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس سارے عرصے میں پہلی بار اسے حرا آپی پر

غصہ آیا تھا۔ جو اپنی خوشی کے حصول کے لیے اک شخص کو اس قدر اذیت میں مبتلا کر چکی تھیں۔

وہ فطرتاً" بے حد حساس لڑکی تھی بچپن سے دوسروں کی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والی مشارب کے سامنے اب اس کے اپنے تایا زاد تھے۔ وہ ان کے غم پر کس طرح نہ تڑپتی جو بچپن سے لے کر اب تک محرومیوں کا شکار ہوتے آرہے تھے۔

اپنی مما کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی بہنوں کی نفرتوں کا شکار ہوتے آئے تھے' مشارب کو زرار شاہ پر بے حد دکھ ہو رہا تھا وہ اس کا دکھ نہیں بانٹ سکتی تھی۔ ایک تو عمروں کا فرق تھا اور کچھ زرار ارسلان کا رویہ اپنے تمام کزنز کے ساتھ ہمیشہ سے ہی لیا دیا سا تھا۔ جس کی وجہ سے کبھی مشارب کی ان سے بے تکلفانہ انداز میں بات نہ ہوئی تھی۔

پھر شادی والے دن بھی وہ بے چین تھی کیوں کہ اسے اسریٰ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ زرار لالہ کو بہت تیز بخار ہو گیا ہے اور وہ نیم بے ہوشی میں پڑے ہیں۔ قصر سلطان سے سب لوگ شادی ہال میں آگئے تھے۔

"وہ قصر سلطان کی تنہا فضاؤں میں ماتم منا رہے ہوں گے۔" اس نے تصور کی آنکھ سے زرار ارسلان کو لان کے بیچوں بیچ تنہا کھڑے روتے ہوئے دیکھا تو دو اشک اس کی پلک کناروں سے ٹوٹ گرے اسے کچھ خبر ہی نہ ہو سکی۔

چونکی تب جب رومیل ارسلان کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"خیریت ؟ خصتی آج حرا آپی کی ہونے والی ہے اور آنسو آپ بہا رہی ہیں۔ میرے خدا یہ ماجرا کیا ہے۔"

"رومیل! مجھے گھر جانا ہے۔!" مشارب نے فرمائش کی۔

"ایں! یہ کیا فرمان جاری کر دیا۔؟" رومیل نے حیرت سے آنسو پونچھتی مشارب کو دیکھا تو وہ نروٹھے انداز سے بولی۔

"بس میں کچھ نہیں جانتی رومی! مجھے گھر واپس جانا ہے۔"

"لیکن مشی ہوا کیا؟" وہ اس کی ضد پر حیران ہوا۔

"اف!" مشارب ۔ اپنی دونوں کنپٹیاں دباتے ہوئے بہانہ کیا تھا۔

"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے رومیل۔ اس شور و ہنگامے میں تکلیف زیادہ ہو رہی ہے۔ سو پلیز یو آر مائی بیسٹ فرینڈ۔ تم مہربانی کر کے مجھے گھر چھوڑ آؤ۔" اس نے توجیہ بیان کی۔

"کہیں تمہیں بخار تو نہیں ہے۔؟" اس کے لجاجت بھرے انداز میں کہنے پہ وہ متفکر سا ہو کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

"ہاں' مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اوکے تو ایک منٹ یہیں ویٹ کرو میں شعیب لالہ سے ان کی گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ شعیب لالہ کی تلاش میں چل دیا تو وہ وہیں پر کھڑی ہو کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن صرف چند منٹ بعد ہی وہ بجھا چہرہ لیے واپس آگیا تھا۔

"کیا ہوا لالہ نے چابی نہیں دی کیا؟" مشارب نے اس کا اترا چہرا دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"نہیں۔" رومیل کا لہجہ سرد تھا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں دی؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تمہارے لالہ صاحب یہاں پہ ہوں گے تو دیں گے نا گاڑی کی چابی۔ وہ کب کے اپنی گاڑی لے کر یہاں سے نکل چکے ہیں کیونکہ زرار صاحب نے بخار کا ڈراما کیا ہے۔"

ہمیشہ کی طرح اپنے سوتیلے بھائی کا ذکر کرتے ہوئے رومیل کا لہجہ زہریلا ہو چکا تھا۔

"اٹس اوکے رومیل" اس نے اس کا اشتعال کم کرنا چاہا اور دل ہی دل میں یہ سن کر مطمئن ہو گئی تھی کہ شعیب لالہ اس وقت زرار لالہ کے پاس تھے۔

"چلو مشارب! میں چاچو کی گاڑی میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" رومیل نے سوچوں میں گھری مشارب

سلطان کا ہاتھ تھام لیا تو وہ اس کے ساتھ ہولی۔

"ارے! مشارب تم کہاں تھیں اور یہ تم میرے معصوم بھائی کو لے کر کہاں غائب ہونے کے چکر میں ہو؟" منال اور اسریٰ سے سامنا ہوا تو اسریٰ نے شریر انداز میں اس کو چھیڑا تھا۔

"ہا۔۔۔ ہا!" رومیل بہن کی بات سن کر ہنس پڑا مگر مشارب خاصے سنجیدہ موڈ میں تھی۔ اس لیے مسکرا بھی نہ سکی۔

"ارے یہ مشی کی شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں خیریت ہے نا؟" منال نے اس کی سنجیدگی نوٹ کرتے ہوئے ٹوکا تھا۔

"ایکچوئلی منال اس کے سر میں درد ہے۔" جواب مشارب کے بجائے رومیل کی طرف سے آیا تھا۔

"اوہ!" اسریٰ نے ہنستے ہوئے بھائی کو دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے آپ نے میری دوست کو نظر لگائی ہے۔"

"ارے نہیں بھئی۔ یہ خوامخواہ کا الزام ہے مجھ پر۔" رومیل جھینپ کر بولا۔ مشارب کو اس وقت ان تینوں کی نوک جھونک میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاتی۔

"رومیل پلیز' جلدی کرونا۔" مشارب نے بےزاری سے کہا۔

"ارے۔۔۔ ہاں بابا! بس ابھی چلتے ہیں" وہ فوراً اس کی جانب متوجہ ہوا۔ پھر منال اور اسریٰ کو مخاطب کرتے بولا۔

"تم لوگ مما اور آنٹی کو بتا دینا مشی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں اس لیے اسے قصر سلطان چھوڑنے جا رہا ہوں۔ میں اس کو ڈراپ کر کے فوراً واپس آجاؤں گا۔"

"اوکے فائن لالہ! میں کہہ دوں گی۔۔۔" مشارب کی طبیعت کے پیش نظر اسریٰ نے جھٹ سے سر ہلا کر بھائی کو اطمینان دلایا دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے پارکنگ ایریا کی طرف آگئے' رومیل اسے وہاں چھوڑنے کے بعد آرام کرنے کا مشورہ دے کر خود واپس چلا گیا تھا۔

مشارب سلطان نے قصر سلطان کے لان سے لاؤنج تک کا سفر بہت تیزی سے طے کیا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر باقر کاکا پہ پڑی تھی۔

"باقر کاکا! شعیب لالہ کہاں ہیں۔۔۔؟" اس نے شعیب لالہ کے متعلق استفسار کیا۔

"بی بی جی! وہ تو جی زرار سائیں کو لے کر اسپتال گئے ہیں انہیں بہت تیز بخار تھا نا جی اس لیے۔۔۔"

"اچھا کب گئے وہ؟" مشارب کے لہجے سے اضطراب جھلکا۔

"جی بی بی! دو گھنٹے ہوگئے ہیں ان کو گئے ہوئے۔ اب تو آنے والے ہوں گے۔۔۔"

"اوکے۔ ایک کپ چائے بنادیں میرے لیے اور ہاں کوئی پین کلر بھی چائے کے ساتھ ضرور لائیے گا۔۔۔ میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔" جو بہانا وہاں رومیل کے سامنے جھوٹ موٹ میں تراش بیٹھی تھی' وہ سچ ہو گیا تھا اس کے سر میں واقعی بہت شدید درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"اف میرا سر۔۔۔" مخروطی انگلیوں سے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے اس نے سرعت سے سیڑھیاں طے کیں اور اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ بھاری کپڑوں سے خود کو آزاد کرنے کے بعد اس نے ایک ہلکا پھلکا سوٹ زیب تن کیا تھا۔ چائے کے ساتھ سر درد کی گولی لے کر وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ کھڑکی کے اس پار نظر آتے گیٹ کو نظروں کی گرفت میں لیے مشارب شدت سے شعیب لالہ کی آمد کی منتظر تھی۔
تب اچانک ہی گیٹ کھلا تھا اور ڈھول تاشوں کی گونج میں قصر سلطان میں معاذ شاہ کی بارات داخل ہوئی تھی۔ محض چند منٹوں میں ہی پھولوں کی بارش اور مووی کیمرے کی روشنیوں کی زد میں آکر قصر سلطان کا لان یکایک مہک اٹھا تھا۔ ہر سمت رنگ برنگے آنچل لہراتے نظر آرہے تھے۔ ہر نظر دولہا دلہن کی جوڑی کو سراہ رہی تھی مگر مشارب بہت جلد اس سارے منظر

سے اُٹھا کر کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتے ہوئے اس نے شدت سے نیند کی خواہش کی تھی۔ تب وہ ستارے اس کی بند آنکھوں سے ٹوٹ کر رخساروں کو نم کر گئے تھے۔ اسے رہ رہ کر زرار ذلہ کی فکر ستا رہی تھی یقیناً "ان کی حالت مزید بگڑ گئی ہو گی تب ہی انہیں ایڈمٹ کر دیا گیا ہو گا۔ اس نے متفکر ہوتے سوچا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح مشارب کی لاڑکانہ کے لیے فلائٹ تھی اس لیے رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دادی جان کو خدا حافظ کہنے کے لیے ان کے کمرے میں آ گئی تھی۔

تب اس نے پورے چار دن بعد وہاں زرار ارسلان کو دیکھا تھا۔ سرمئی رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں سفید شال کندھوں پہ لیے سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ نیچے کارپٹ۔۔ دادی جان کے پلنگ کے بالکل قریب گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے۔

مشارب کے قدم وہیں چوکھٹ پر جم گئے تھے اور آنکھوں کی سطح تیزی سے گیلی ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ جھٹکے سے وہاں سے پلٹ جانا چاہتی تھی مگر زرار ارسلان کی لرزتی آواز نے اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

"میں ہار گیا دادو۔۔۔ میں ہار گیا۔ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔۔۔ وہ نکل گئی میری زندگی سے دادو! آپ کے زرار کو ٹھکرا کر چلی گئی وہ۔"

"میں۔۔۔ میں یہ اذیت نہیں سہ پاؤں گا دادو! میں مر جاؤں گا۔"

"زرار میرے بیٹے۔۔۔ خود کو سنبھالو۔ مجھے اس طرح اذیت مت دو۔" دادی نے التجائیہ انداز میں کہا تھا اور پھر تڑپ کر انہیں اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ وہ ان کی چھاتی میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔

"دنیا حرا پر ختم تھوڑی ہوئی ہے میری جان۔۔۔ دیکھنا میں اپنے سوہنے کے لیے کتنی پیاری دلہن لاؤں گی۔"

"دادو! انہیں اب نہیں۔۔۔ حرا نہیں تو کوئی اور ہرگز نہیں۔"

"آپ دوبارہ یہ بات کیجئے گا بھی مت۔۔۔ میں اب کبھی شادی نہیں کروں گا۔۔۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔"

"ارے باؤلا ہو گیا ہے کیا؟" دادی جان کی آنکھیں صدمے سے پھٹنے کو تھیں۔

"ہاں دادو! یہ میرا خود سے کیا گیا عہد ہے۔" آپ پلیز مجھے فورس مت کیجئے گا نہ ابھی نہ پھر کبھی۔"

"زرار! مجھے یہ دکھ بھی دے گا اب تو؟" وہ بہت دیر بعد کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھیں، جس کو محسوس کرتے ہوئے زرار شاہ کے لب تلخی سے مسکرا اٹھے۔ مگر وہ بولے کچھ نہیں تب بہت اچانک دادی جان کی نظر دروازے میں ساکت کھڑی مشارب پر پڑ گئی تھی۔

"ارے مشارب، میری بچی آؤ نا اندر، وہاں کیوں کھڑی ہو۔۔۔؟"

"وہ، جی دادی۔۔۔" دادی کے اپنی طرف متوجہ ہونے پر وہ دفعتاً ہڑبڑا سی گئی تھی۔ پھر مرے مرے قدم اٹھاتی دادی کے قریب آ گئی۔

"وہ دراصل دادی جان! میں کل صبح کی فلائیٹ سے لاڑکانہ جا رہی تھی۔۔۔ اس لیے سوچا آپ کو خدا حافظ کہہ دوں۔" ان کے بیڈ کے قریب رک کر اس نے اپنی آمد کی وجہ بتائی اور کن اکھیوں سے زرار شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

جانے وہ واقعی اتنے خوبرو تھے یا پھر اداس ہو کر ایسے دکھائی دیے تھے۔ مشارب سمجھ نہ پائی تھی۔

"تو میری بچی جا رہی ہے؟" انہوں نے مشارب کی پیشانی چومتے ہوئے الوداعی بوسہ دیا تو وہ مسکرائی۔

"جی دادی! پانچ دن کی چھٹی لے کر آئی تھی میں۔۔۔ پہلے ہی اسٹڈیز کا کافی حرج ہو چکا ہے۔" اس نے بتایا تو دادی جان مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"ہاں میری جان! خوب دل لگا کر پڑھو اور کامیاب ڈاکٹر بنو بالکل میرے زرار کی طرح۔" انہوں نے قریب بیٹھے زرار ارسلان کی جانب دیکھا جو بھیگی پلکیں

جھکائے جانے کیا کارپٹ پہ ڈھونڈ رہے تھے۔

کوئی تعویذ ہو رد بلا کا
میرے پیچھے محبت پڑ گئی ہے

☼ ☼ ☼

اور یوں وہ زرار لالہ کی وجہ سے اپنے دل میں ڈھیروں اداسیاں سمیٹے لاڑکانہ واپس چلی آئی تھی۔ اور پھر یہاں آنے کے محض چند ماہ بعد ہی اسے اسری کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ زرار شاہ ہائیر اسٹڈیز کی غرض سے لندن روانہ ہو چکے ہیں اور وہاں سے واپس لوٹنے کے بعد ان کا ارادہ دادا جان کا تعمیر کردہ پرائیوٹ ہسپتال دار الشفاء سنبھالنے کا تھا۔ زرار ارسلان کا ارادہ جان کر مشارب کو بے حد خوشی ہوئی تھی اور اس نے بھی اپنی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد وہیں جاب کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اور پھر وقت کی گاڑی اتنی تیزی سے آگے بڑھتی گئی تھی کہ اگر کبھی وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتی تو گزرے ہوئے سالوں پہ جمی وقت کی دبیز تہہ دیکھ حیران رہ جاتی۔ جس سال وہ اپنی اسٹڈیز مکمل کر کے ہاؤس جاب کر رہی تھی اس سال زرار ارسلان بھی لندن سے واپس آ گئے تھے پھر پاکستان آنے کے فوراً بعد ہی انہوں نے اپنے پلان کے مطابق دار الشفاء کو سنبھال لیا تھا۔ اور پھر ماہر سرجن زرار ارسلان کی توجہ و محبت نے محض ڈیڑھ دو سال کے عرصے میں دار الشفاء کو شہر کے مشہور پرائیوٹ اسپتالوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اپنی ہاؤس جاب مکمل کر چکنے کے بعد سلطان شاہ سے اجازت لے کر مشارب نے بھی دار الشفاء جوائن کر لیا تھا۔ جبکہ رومیل ارسلان نواب شاہ میڈیکل کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک روانہ ہو چکا تھا۔ اس دوران شعیب سلطان کو بھی اپنی پسند کی لڑکی مل گئی تھی۔ جس سے منگنی ہو جانے کے بعد عنقریب وہ شادی کا ارادہ رکھتے تھے۔ منال اور اسری اپنے ایم اے انگلش کے بعد پڑھائی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ خاندان میں ہی دونوں کی نسبتیں طے

تھیں۔ جلد ہی ان کی شادیاں ہونے والی تھیں۔

لندن جانے کے بعد رومیل مشارب کو بھولا نہیں تھا۔ اس کی جانب سے ڈھیر سارے کارڈز، چاکلیٹس اور دوسرے چھوٹے موٹے گفٹس اسے اکثر ملتے رہتے تھے۔ ہر ویک اینڈ پر وہ اس کو کال ضرور کرتا تھا۔ اور وہ کال گھنٹہ گھنٹہ بھر کی ہوتی۔ اس کی اتنی طویل کال پر مشارب چڑ جاتی تھی۔ مگر وہ بغیر برا مانے ہنستا چلا جاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

دار الشفاء جوائن کرنے کے بعد مشارب کو زرار ارسلان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اس پانچ سال کے عرصے میں پہلے سے زیادہ ہینڈسم اور گریس فل ہو چکے تھے۔ مگر ہمہ وقت آنکھوں میں ہلکورے لیتی اداسی اور وجیہہ چہرے پہ چھایا اضطراب مشارب کو آج بھی بے چین کر دیتا تھا۔

دار الشفاء میں ڈاکٹر رجا، ڈاکٹر فہد، ڈاکٹر اریب اور ڈاکٹر آصف کے ساتھ اس کی اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ ان کا پورا اسٹاف ذمہ دار اور اپنے پیشے سے مخلص نظر آتا۔ مشارب بھی اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کی پوری کوشش کرتی تھی مگر جانے کیا بات تھی زرار ارسلان کے سامنے ہمیشہ ایسی کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی جس پر وہ اس کو سرد نظروں سے گھورتے ہوئے پیشے سے مخلصی پر وہ لیکچر سناتے کہ جسے سننے کے بعد مشارب کے چودہ طبق روشن ہو جاتے تھے۔

"یس سر، یس سر" کی گردان اس کے ہونٹوں پر رہتی تھی۔

"آخر مجھے ہو کیا جاتا ہے زرار لالہ کے سامنے؟ میں اس قدر بوکھلا کیوں جاتی ہوں۔ اگر وہ مجھے غائب دماغ سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہی سمجھتے ہیں۔ مجھ جیسی اسٹوپڈ لڑکی ہے ہی اس قابل۔" کتنی ہی دیر خود پہ غصہ کرنے کے بعد وہ اگلی بار زرار سر کے سامنے پر اعتماد رہنے کا حتمی فیصلہ کرتی مگر اس فیصلے پر وہ ڈاکٹر زرار کے سامنے کبھی عمل نہ کر پائی تھی۔

اب جب کبھی ان سے سامنا ہوتا یا وہ کچھ استفسار کرتے' وہ اخلاق کے ساتھ جواب دینے کے بجائے "سر یہ سر وہ سر۔" کی رٹ لگائے رکھتی۔

اسپتال میں ڈاکٹر مشارب اور ڈاکٹر زرار کے رشتے سے فقط ڈاکٹر اریب ہی واقف تھے۔ اس بات کا کسی اور کو علم نہیں تھا ایک تو وہ دونوں اسپتال اپنی اپنی گاڑیوں میں آتے تھے' دوسرا ان کے بیچ کزنز والی کوئی بے تکلفی کبھی نظر ہی نہیں آئی تھی۔ اب تو مشارب کو دارالشفاء میں جاب کرتے ہوئے سات ماہ سے زائد عرصہ ہونے کو تھا۔ مگر وہ ڈاکٹر زرار کی نظروں میں ایک قابل ڈاکٹر بننے کی خاطر دن رات محنت کرتی جاتی۔

اس کا رویہ اپنے تمام مریضوں کے ساتھ بہت ہی دوستانہ سا تھا۔ وی آئی پی وارڈ میں ایڈمٹ بنٹی اور ننھی سی روا سے اس کی پکی دوستی ہو چکی تھی۔

"نہیں مجھے نہیں پینی دوا' میں نہیں پیوں گا۔" بنٹی نے تیسری بار سر نفی میں ہلاتے ہوئے سیرپ پینے سے انکار کیا تھا۔

"اف!" ڈاکٹر رجا نے زچ ہوتے ہوئے قریب کھڑے ڈاکٹر اریب کی جانب دیکھا جو دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے پہ باندھے خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"دیکھ رہے ہیں نا ڈاکٹر آپ! بنٹی کتنا ضدی ہو رہا ہے؟"

"دس از ناٹ فیئر بنٹی بیٹا! اگر آپ دوا نہیں پئیں گے تو پھر ٹھیک کیسے ہوں گے؟" بیڈ نمبر سی کے مریض کا حال دریافت کرنے کے بعد ڈاکٹر زرار نے مسکراتے ہوئے بنٹی سے کہا۔ وہ کل شام ہی بیرون ملک سے واپس ہوئے تھے اور اس وقت دارالشفاء کے راؤنڈ پر نکلے ہوئے تھے' ڈاکٹر رجا اور ڈاکٹر اریب دونوں ہی اس کے ساتھ تھے۔

"نو ڈاکٹر... مجھے ڈاکٹر رجا کے ہاتھ سے دوائی نہیں پینی... یہ بہت کڑوی دوا پلاتی ہیں۔" منہ بسورتے ہوئے بنٹی نے کہا تو ڈاکٹر اریب مسکرا دیا۔

"پھر کس کے ہاتھ سے پینی ہے؟" ڈاکٹر رجا کے خجل ہوتے چہرے کو اپنی شوخ نگاہوں کی گرفت میں لیتے ہوئے ڈاکٹر اریب نے استفسار کیا تھا۔

جبکہ ڈاکٹر رجا اسے گھور کر رہ گئی تھی اور پھر خود کو مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے جھٹ سے گویا ہوئی۔

"سر! یہ چھوٹی بنٹی روز ڈاکٹر مشارب کے ہاتھ سے دوا پیتے ہیں۔"

"میں' میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔" رجا یہ کہتے وارڈ سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر زرار ارسلان کی آنکھوں میں استعجاب کے رنگ اتر آئے۔ انہوں نے استفہامیہ نظروں سے ڈاکٹر اریب کو دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔

"یار میرے' حیران نہ ہو' دراصل تمہارے پیچھے ڈاکٹر مشارب سلطان نے دارالشفاء کے مریضوں پر جادو سا کر دیا ہے' جسے دیکھو انہیں کا دم بھرتا نظر آتا ہے۔

وی آئی پی وارڈ کی مسز شاہین سے لے کر چلڈرن وارڈ کی بنٹی اور روا تک سب ڈاکٹر مشارب کے ہاتھ سے ہی میڈیسن لیتے ہیں... کیونکہ وہ دوائی میں محبت کے ساتھ اپنے شیریں لہجے کی مٹھاس بھی گھول دیتی ہیں' اس لیے کڑوے سیرپ کا ذائقہ بھی جام شیریں جیسا ہو جاتا ہے۔" ڈاکٹر اریب مصطفیٰ یونیورسٹی فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ زرار شاہ کا قریبی دوست بھی تھا اس نے ہنستے ہوئے ان کو ساری روداد بتائی۔

"اور تو اور تمہاری غیر موجودگی میں میں نے دو آپریشن میں انہیں اسسٹنٹ کے طور پر اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ماشاء اللہ بہت ایکٹو ہیں۔" ڈاکٹر اریب نے مسکراتے ہوئے مزید بتایا تو اک بے اختیار مسکراہٹ نے زرار ارسلان کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ تب ہی گھبرائی ہوئی مشارب اندر داخل ہوئی۔

"سر! آپ... نے بلایا تھا؟" مشارب سلطان کی لرزتی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تو اریب پر سے نگاہ ہٹا کر وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

سفید رنگ کے اسٹائلش سوٹ' جس کی لمبی شرٹ کے دامن پر کڑھائی کی گئی تھی سفید اوور آل پہنے' لمبے بالوں کی چوٹی اپنی نازک پشت پر ڈالے' وہ کچھ فاصلے پر

کھڑی کافی دلکش لگ رہی تھی۔

"یس ڈاکٹر' آپ بنی کو دوا پلادیں۔۔۔ پلیز۔" زرار نے اس سے کہا تھا۔

"جی سر۔" مشارب سن کر قدرے حیران ہوئی تھی۔

"ہاؤ آر یو لٹل فرینڈ۔۔۔؟" مشارب نے بنی کے چہرے پر ایک پیار بھری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آئی ایم فائن' بٹ آج آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی۔ میں کب سے آپ کا ویٹ کر رہا تھا۔" بنی اس کو دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

"ڈیر سوئیٹ فرینڈ! آپ کو تو پتا ہے کہ آپ کی دوست کتنی اچھی ہے۔ سب ہی لوگ اس کے ہاتھ سے دوا لینا پسند کرتے ہیں۔ ابھی میں مسز شاہان کو دوا پلا رہی تھی' اس لیے تھوڑی سی دیر ہو گئی۔"

پھر جب وہ بنی کو دوا پلانے کے بعد وارڈ سے باہر نکل رہی تھی' زرار ارسلان نے اچانک اسے پکار لیا۔

"یس سر۔۔۔" غلافی آنکھوں میں اٹھنے والی استعجاب کی لہریں بہت نمایاں تھیں۔ وہ ان آنکھوں میں حیرت کے رنگ دیکھ کر مسکرائے اور ان کے لب دھیرے سے ہلے تھے۔

"ویل ڈن ڈاکٹر مشارب! آپ کو ایک ذمہ دار ڈاکٹر کے روپ میں دیکھ کر بہت اچھا فیل ہو رہا ہے۔۔۔ امید ہے' آئندہ بھی آپ اسی طرح سے اپنے پیشے سے مخلص ہونے کا ثبوت دیں گی۔" نرم لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ اس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئے تھے۔

گم صم سی وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے کیا سنا تھا؟

* * *

"مشارب! تم ہمارے ساتھ چل رہی ہو بس۔" اسریٰ نے دو ٹوک لہجے میں کہتے ہوئے اس کے اوپر سے کمبل کھینچ لیا تھا۔

"اف او کیا مصیبت ہے یار۔۔۔؟" مشارب نے نیند بھری آنکھوں کو بڑی مشکل سے وا کرتے ہوئے بیزاری سے پوچھا۔

"ایڈیٹ لڑکی! ابھی تو ہمارے ساتھ بھی وقت گزار لیا کرو؟" دونوں نے اس کی کھنچائی کی۔

"ایک دن ہی ملتا ہے چھٹی کا' اس دن بھی آرام نہیں کرنے دیتیں۔۔۔" وہ غصے سے بولتی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں اس کی حالت دیکھ کر ہنس دیں۔

اور پھر تینوں آدھے گھنٹے میں مارکیٹ میں تھیں۔ کپڑے اور جیولری وغیرہ خریدنے کے بعد منال اور اسریٰ کو کاسمیٹکس کی شاپ پر مصروف چھوڑ کر وہ قریبی بک اسٹال کی طرف آگئی تھی۔

یہ ہمیشہ سے اس کا معمول رہا تھا کہ شاپنگ کے بعد وہ اپنے لیے ایک کتاب ضرور خریدا کرتی۔ اس وقت بھی اس نے اعتبار ساجد کی کتاب "یہ تنہائی مجھے دے دو" خریدی تھی۔ پھر کاؤنٹر پر بل پے کرنے کے بعد پلٹی ہی تھی کہ گلاس ڈور کھول کر ڈاکٹر اریب کے ساتھ ڈاکٹر رجا اور ڈاکٹر آصفہ شاپ میں داخل ہوئیں۔

"ارے ڈاکٹر مشارب آپ یہاں پر؟" اس پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر رجا نے خوش گوار لہجے میں استفسار کیا تھا۔ ڈاکٹر اریب اور ڈاکٹر آصفہ بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

"یقیناً" آپ بھی زرار کے لیے برتھ ڈے پریزنٹ خریدنے آئی ہوں گی نا رائٹ۔۔۔؟"

"برتھ ڈے پریزنٹ؟ زرار سر کے لیے؟" مشارب نے تعجب کے ساتھ ڈاکٹر اریب کی بات دہرائی تھی۔ پھر قدرے حیران ہوتے ہوئے ان تینوں کی طرف دیکھا۔

"کل ڈاکٹر زرار کا برتھ ڈے ہے' آپ کو نہیں معلوم؟" ڈاکٹر کے کہنے پر وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔

"نہیں وہ۔۔۔ دراصل مجھے معلوم تو تھا مگر شاید میں بھول گئی تھی۔" کچھ نروس سے انداز میں اس نے کہا۔

پھر ڈاکٹر اریب اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولے۔

"ٹھیک ہے۔" آپ آج بھول گئی ہیں تو کوئی بات نہیں مگر پلیز کل مت بھولیے گا کیونکہ ہم لوگوں نے کل دارالشفا میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا انتظام کر رکھا ہے... سو آپ ایک عدد تحفے کے ساتھ کچھ تیار شیار ہو کر ضرور آیئے گا۔"

اپنے پروگرام سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے مشارب کو پارٹی میں آنے کی دعوت دی تو وہ مسکرا کر سرہلا گئی۔

***

وہ ایک بہت ہی اہم آپریشن کرنے کے بعد آپریشن تھیٹر سے باہر نکلے تھے۔

تھکے تھکے انداز میں کاریڈور کراس کرنے کے بعد جونہی انہوں نے ریسپشن ہال میں قدم رکھا۔ دارالشفا کے تمام اسٹاف کو وہاں پا کر حیران رہ گئے۔ تب وہ سب یک زباں ہو کر گنگنانے لگے۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔"

ہیپی برتھ ڈے ٹو یو سر۔" ڈاکٹر اریب نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگا لیا۔

"جنم دن بہت بہت مبارک ہو میرے دوست۔"

"تھینکس یار" ڈاکٹر اریب کے گرد اپنا حصار تنگ کرتے ہوئے انہوں نے دھیمے لہجے میں شکریہ ادا کیا تھا۔

پھر اس کے بعد ڈاکٹر فہد' ڈاکٹر آصف اور ڈاکٹر رجا نے بھی باری باری اسے وش کیا تھا۔

بس صرف اک وہ ہی تھی جو اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے کچھ فاصلے پر خاموش کھڑی دیکھ رہی تھی۔

زرار ارسلان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مشارب سلطان کے لیے کتنی قیمتی تھی' یہ بات فقط وہی جانتی تھی۔

کیک کاٹنے کے بعد وہ لوگ دارالشفا کے لان میں آ بیٹھے تھے۔ تب ڈاکٹر زرار شاہ نے ڈاکٹر اریب کے بے حد مجبور کرنے پر وہ غزل چھیڑی تھی۔ جس نے مشارب کے اندر تہلکہ مچا دیا تھا۔ غلافی آنکھوں کی گہری ہوتی نمی کو چھپانے کی خاطر وہ غزل ختم ہونے سے پہلے ہی دارالشفا سے اٹھ آئی تھی۔

***

رات گیارہ بجے کے قریب پارٹی ختم ہونے کے بعد زرار کی واپسی ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی حسب عادت انہوں نے ریموٹ اٹھا کر میوزک سسٹم آن کر دیا تھا۔ یکایک کمرے کی خاموش فضا میں نصرت فتح علی خان کی آواز رقص کرنے لگی۔

رات کو چاندنی جب کھلے' دل کو ناشاد کرتا ہوں میں۔

ایک بھولی ہوئی خوشی کے لیے' لاکھ غم یاد کرتا ہوں میں۔

غزل کے بول ان کی سماعتوں سے ٹکرائے تو وہ تلخی سے مسکرانے لگے۔

تجھ سے نظریں بدلنے کے بعد' کچھ تو ہوگی ندامت تجھے

جا وفاؤں کی زنجیر سے' تجھ کو آزاد کرتا ہوں میں

خان صاحب نے تان لگائی تھی۔

زرار ارسلان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

پھر میوزک سسٹم آف کرنے کے ارادے سے انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا ریموٹ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ان کی نظر گفٹ پیپر میں لپٹے بکس پر آ کے رک گئی تھی۔ ذرا سا جھک کر وہ پیکٹ اٹھا لیا۔

کچھ حیرت سے وہ نچلا لب بھینچتے ہوئے کارڈ کھول کر پڑھنے لگے۔

"آ سویٹ گفٹ فار گریس فل سر۔

فرام مشارب سلطان۔"

کارڈ کے اندر لکھا مشارب کا نام پڑھ کر زرار حقیقتاً" حیران ہوئے تھے۔ اسپتال میں اس نے انہیں وش تک نہیں کیا تھا اور اب یہ گفٹ؟ وہ گفٹ کھولنے لگے۔ نفاست کے ساتھ ٹیپ اور پیپر کی گرفت سے پیکٹ کو آزاد کرنے کے بعد انہوں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ بکس کے اندر موجود گفٹ کو باہر نکالا تھا اور

جیسے دنگ رہ گئے۔

ثقافت کے تمام زاویوں کو اجاگر کرتا وہ تاریخ کے سنہری کردار سوہنی کا مجسمہ تھا۔ کرسٹل کا نازک گھڑا کمر پہ اٹھائے وہ سر سے لے کر پاؤں تک جگمگا رہی تھی۔

"مائی گاڈ! اتنا مکمل حسن!"

زرار ارسلان نے بے اختیار اس شاہکار کو سراہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یا وحشت" مشارب نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے اپنے اندر چھڑی جنگ سے دامن بچانا چاہا تھا۔

قصر سلطان کے تمام مکین اس وقت شعیب سلطان کی دلہن کی طرف مایوں کا شگن لے کر گئے ہوئے تھے۔ اور وہ جو دولہا کی اکلوتی بہن تھی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہ جا سکی تھی۔ دراصل اس رات زرار کی پارٹی سے آنے کے بعد مشارب کو شدید بخار ہو گیا تھا۔ تین دن مسلسل بخار میں پھنکتے رہنے کے بعد جس دن اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی اس دن صبح صبح ہی رومیل ارسلان کا فون آ گیا تھا۔

"ہیلو لڑکی! کیا کر رہی تھیں؟" رومیل نے بڑی دلکشی سے استفسار کیا تھا۔ مگر وہ اس کے لہجے کی دلکشی کو نظر انداز کرتے ہوئے تھکے تھکے سے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

"کچھ خاص نہیں۔" وہ اس کا جواب سن کر ہنسا تھا۔

"کتنی ظالم لڑکی ہو مشی قسم سے تم! کم از کم میرا دل رکھنے کو ہی کہہ دیتیں کہ مجھے یاد کر رہی تھیں۔"

"تم جانتے ہو رومیل میں یونہی دل نہیں رکھا کرتی۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"آئی نو! میں تمہارے مزاج کے ہر رنگ سے واقف ہوں تم ایک بہت ہی سچی اور کھری لڑکی ہو اور تمہاری یہی ادا تو مجھے اپیل کرتی ہے۔ اس لیے تو میں نے سوچا ہے واپس آنے کے بعد منگنی شنگنی کے جھنجٹ میں پڑنے کے بجائے ڈائریکٹ تم سے نکاح کر لوں گا۔"

"رومیل بس!" مشارب کے قریب دھماکہ سا ہوا۔

"کیوں ہو گئیں نا سرپرائز؟" وہ اس کی خاموشی کو کوئی اور ہی رنگ دے کر ہنسا۔

"اسٹاپ اٹ رومیل' میری نظر میں یہ ایک نہایت گھٹیا مذاق ہے۔" رومیل ارسلان کی خوش فہمیوں کو ختم کرنے کی خاطر وہ بہت تیز انداز میں چیخی۔

"مذاق؟" رومیل کی ہنسی کو بریک لگا تھا۔

"مذاق؟ کیسا مذاق مشارب سلطان؟ تم میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی کو مذاق کہہ کر میری فیلنگز کی توہین کر رہی ہو۔ تمہیں اندازہ ہے تمہارے یہ الفاظ مجھے کتنا دکھ پہنچا گئے ہیں۔"

"دکھ؟ دکھ تو مجھے پہنچا ہے رومیل تمہاری بات سن کر۔"

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا مشارب! کہ تم دکھی ہو گئی ہو؟" رومیل مشتعل ہوتے گویا ہوا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں مشارب اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں برا کیا ہے؟"

"برا یہ ہے رومیل! کہ میں تمہیں اس نظر سے نہیں دیکھتی۔ تم، تم میرے ایک بہت ہی اچھے دوست ہو اور بس۔" مشارب نے جو کہا تھا' سچ تھا۔ وہ رومیل کو صرف ایک دوست کی حیثیت سے ہی دیکھتی تھی۔ اس کے حوالے سے کبھی کوئی جذبہ اس کے دل میں نہیں جاگا تھا۔ مگر یہ بات اس وقت رومیل کو سمجھانا ایک دشوار ترین عمل تھا۔

ایک لمحے کو وہ مشارب کی بات سن کر چپ سا رہ گیا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اک ٹھنڈی سانس کھینچ کر مضبوط لہجے میں کہنے لگا۔

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو مشارب! مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرے لیے اتنا کافی ہے اور رہا تمہارا سوال تو شادی کے بعد تمہیں بھی مجھ سے محبت ہو ہی جائے گی۔ اور دیکھنا رومیل ارسلان تمہیں خود سے محبت کرنے پر مجبور کر دے گا۔ یہ اس کا تم سے وعدہ ہے۔" ایک ایک لفظ کو

ٹھوس لہجے میں ادا کرنے کے بعد وہ سلسلہ منقطع کر گیا تھا۔

مشارب نے ہاتھ میں پکڑا سیل فون بیڈ پر اچھال دیا اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تھی۔

"رومیل ارسلان! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ مشارب سلطان تم سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اسے کسی اور ہی لگن نے گھیر رکھا ہے۔" وہ زیر لب رومیل کے تصور سے مخاطب ہوتے بڑبڑائی تھی۔

پھر اس دن کے بعد مشارب سلطان کے روز و شب عجیب طرح کے اضطراب میں گھر گئے تھے۔ اس کا دل ہر پل اندیشوں میں گھرا رہتا۔ وہ ہر وقت بولائی بولائی رہنے لگی۔ پھر ان ہی دنوں قصر سلطان میں شعیب شاہ کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے سارا قصر شاہ مہمانوں سے بھر گیا۔

حرا شاہ اور معاذ شاہ بھی کینیڈا سے آچکے تھے۔ جس دن ان لوگوں کی آمد تھی اس روز زرار ارسلان کو کسی سیمینار کے سلسلے میں آؤٹ آف کنٹری جانا تھا۔

وہ دادی جان کے کمرے میں آگئی تھی۔ دادی جان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

"چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے میری بچی۔ کہیں نظر نہ لگ جائے میری بچی کو کسی کی۔" انہوں نے دعائیں پڑھ کر اس کے اوپر پھونکیں۔

"تھینک یو دادی جان۔" مشارب ان کے منہ سے اپنی تعریف سن کر کھل اٹھی۔ اور پھر واقعی اس رات ہر کسی نے اسے سراہا تھا سوائے ایک شخص کے اس نے تو شاید ایک نظر بھی اس پر نہ ڈالی تھی۔

"مشارب صاحبہ! جلدی کرو۔" ورنہ میں جا رہی ہوں۔" معاذ شاہ کے تیسری بار ہارن دینے پر منال نے غصے میں آکر مشارب کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

"یار! کیا مصیبت ہے تم ڈھنگ سے تیار بھی نہیں ہونے دے رہیں۔" مشارب کی جھنجلائی آواز پر منال کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے تم ہوتی رہو تیار میں جا رہی ہوں۔ سب لوگ ہوٹل روانہ ہو چکے ہیں میں نے تمہاری وجہ سے معاذ لالہ کو روک رکھا تھا مگر تمہاری تیاری تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے اور معاذ لالہ کی ڈانٹ سننے کا مجھ میں حوصلہ نہیں اس لیے میں تو چلی۔" یہ کہنے کے ساتھ ہی منال نے اپنے قدم سیڑھیوں کی جانب بڑھائے تھے۔

"منال پلیز۔ میں بس پانچ منٹ میں آرہی ہوں۔" مشارب نے تیز آواز میں کہا۔

"سوری" اس نے با آواز بلند کہا پھر سیڑھیاں طے کرتی پورچ میں کھڑی معاذ شاہ کی گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز مشارب تک بھی آئی تھی۔

"غدار لڑکی۔" اس نے کھولتے دماغ کے ساتھ کہا پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ تیار ہونے کے بعد شعیب لالہ کو میسج کر کے وہاں سے گاڑی منگوا لے گی۔

"ناٹ بیڈ۔" تیار ہونے کے بعد قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے مسکرا اٹھی تھی۔ نفاست کے ساتھ کیے گئے میک اپ نے اس کی شخصیت کو جیسے چونکا دینے والا نکھار بخش ڈالا تھا۔

دوپٹے کے بل سیٹ کرتی وہ پلٹنے لگی تھی کہ اچانک نگاہ چوڑیوں کے ریک تک گئی اور پھر فوراً سوٹ کی ہم رنگ چوڑیوں کا سیٹ نکال کر اپنی کلائی میں سجا لیا پھر پلٹ کر بیڈ پہ رکھا اپنا سیل فون اٹھایا۔

سیڑھیاں اترنے کے ساتھ ساتھ وہ شعیب لالہ کے نمبر پر میسج ٹائپ کر رہی تھی۔ تب۔ اچانک شاید اونچی ہیل کی وجہ سے اس کا پاؤں پھسلا تھا اور سنبھلتے سنبھلتے اس کا بازو ریلنگ سے جا ٹکرایا اور اس کی ساری چوڑیاں ٹوٹ کر سیڑھیوں پر بکھر گئی تھیں۔ تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

وہ جو اپنا سیل فون اور والٹ بھول گئے تھے اس

لیے ہوٹل سے واپس قصر سلطان آنا پڑا تھا اپنا والٹ اور سیل اٹھاتے ہوئے وہ پلٹ ہی رہے تھے جب کسی نسوانی چیخ نے انہیں چونکا دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے کمرے سے باہر آئے مشارب گھٹنوں کے بل سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" زرار ارسلان تیز قدم اٹھاتے اس کے قریب پہنچے۔

مشارب نے بھیگی پلکیں اٹھا کر کچھ حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر بنا کچھ کہے اپنی زخمی کلائی سامنے کر دی تھی۔

"اوہ! یہ چوٹ کیسے لگ گئی؟" مشارب کی خون میں تر بتر کلائی دیکھ کر متفکر لہجے میں کہتے وہ اس کے قریب ہی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئے۔

زرار شاہ کو اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ آنسو اب بھی اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"مجھے دیکھنے دو۔" وہ اس کی کلائی تھام کر زخم کا جائزہ لینے لگے پھر قدرے برہم لہجے میں اس کو ڈانٹا تھا۔

"کیا آنکھیں بند کر کے چل رہی تھیں۔" "کم از کم سیڑھیاں اترتے وقت تو آنکھوں کو کھلا رکھتیں...؟" شکل سے تو بے وقوف ہیں ہی عادتیں بھی ساری بے وقوفوں والی ہیں۔" اس کی کلائی سے کانچ کے ٹکڑے نکالتے ہوئے وہ مسلسل ڈانٹ رہے تھے۔

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی انہیں بولتا ہوا سن رہی تھی۔ اپنے لیے اس شخص کا یہ اپنائیت بھرا انداز اسے اچھا لگ رہا تھا۔

انہوں نے اپنے کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس منگوایا تھا۔

کاٹن کو ڈیٹول میں بھگو کر وہ اس کا زخم صاف کرنے لگے۔ مشارب نے کن اکھیوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ سفید رنگ کے کلف شدہ کاٹن کے کڑکڑاتے شلوار قمیص میں کف فونڈ کے ساتھ خوشبو میں بسے وہ اس لمحے بہت ہینڈسم لگ رہے تھے۔

خوبرو مغرور مشارب شاہ کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اپنا جھکا سر اٹھایا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی ایک دم ہنس پڑے۔ رونے کی وجہ سے آنکھوں پر لگا مسکارا اور کاجل پھیل چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں مشارب کے گلابی رخساروں پر سیاہ لکیریں سی بن گئی تھیں۔

"کیا بات ہے سر؟ آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟"

انہیں ہنستا دیکھ کر مشارب نے معصومیت سے استفسار کیا تھا۔

"نتھنگ!" اس کے استفسار پر بمشکل اپنی ہنسی روکتے ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ دفعتاً ان کا سیل فون بج اٹھا۔

"ایکس کیوزمی!" مشارب سے معذرت کر کے وہ کال سننے لگے۔

"ہیلو ہاں یار..."

"قصر شاہ میں ہوں۔ وہ میں اپنا سیل اور والٹ لینا بھول گیا تھا' ہاں بس وہی لینے کے لیے آیا تھا... اوکے ابھی نکل رہا ہوں۔"

"شعیب کا فون تھا نکاح ہونے والا ہے' آئی تھنک ہمیں بھی اب نکلنا چاہیے۔"

شعیب سلطان سے بات کرنے کے بعد وہ اپنا سیل آف کر کے سیڑھیوں سے اٹھتے ہوئے بولے۔

اس کے چہرے پر ابھرنے والے تکلیف کے آثار اتنے نمایاں اور واضح تھے کہ انہوں نے سہارا دینے کے لیے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا جسے جھکی نگاہ سمیت مشارب سلطان نے تھام لیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی زرار ارسلان کے پرفیوم کی مہک نے ماحول کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ مشارب نے لرزتی پلکیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا تو وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

نظروں کے تصادم پر زرار شاہ نے مسکرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"لیڈیز فرسٹ!" گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا اور تب مشارب سلطان نے

غیر محسوس انداز میں اپنے قدم آگے بڑھانے کے بجائے زرار ارسلان کے قدموں کے ساتھ ملا لیے تھے۔

☆ ☆ ☆

شعیب شاہ کے شادی کے ہنگامے سرد پڑنے کے ساتھ ہی قصر سلطان کے مکینوں کی زندگی معمول پہ لوٹ آئی۔

شادی کے تیسرے روز ہی شعیب سلطان اپنی نئی نویلی دلہن کو ساتھ لیے ہنی مون منانے کے لیے سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ حرا اور معاذ شاہ بھی واپس کینیڈا لوٹ گئے تو مشارب نے بھی اپنی تمام توجہ و محبت دارالشفاء کے مریضوں کی طرف مبذول کرلی۔ وہ خود کو بے حد مصروف رکھنے لگی تھی مگر باوجود اس قدر مصروفیت کے اس کا دھیان بھی کبھار رومیل کی گفتگو کی طرف چلا جاتا تو اندیشوں کے سانپ اس کے دل میں سر اٹھانے لگتے۔

اس روز وہ اپنے آپ کو بہت بکھرا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ مسلسل ذہنی انتشار نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ گو اس دن کے بعد رومیل کا فون دوبارہ نہیں آیا تھا۔ مگر اس کی جانب سے خاموشی کے طویل وقفے نے مشارب کو چونکا دیا تھا۔ وہ رومیل ارسلان کو بہت ہی اچھی طرح سے جانتی تھی۔ وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے ہرگز نہیں تھا اور اس روز اس نے جو کچھ فون پر مشارب سے کہا تھا۔ وہ اس کے ارادوں کی پختگی کا پتا دے رہا تھا۔ ایسے میں رومیل ارسلان کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔

ڈیوٹی آورز ختم ہونے کے بعد وہ اسی بارے میں سوچتی اپنے کمرے سے گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر آگئی۔

"ایکسکیوزمی مشارب۔۔۔" سست قدموں سے باہر نکلتی مشارب زرار ارسلان کی پکار پر رک گئی۔

"یس سر؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

جو اس سے دس گیارہ قدموں کے فاصلے پہ کھڑے بڑی عجلت میں دکھائی دے رہے تھے۔ اپنے قریب کھڑی نرس کو کچھ ہدایت دے کر فارغ کرنے کے بعد وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

"مشارب! دراصل ایمرجنسی میں مجھے فوری طور پہ آپریشن کرنا پڑ رہا ہے۔ یو نو ڈاکٹر اریب اس وقت اسپتال میں موجود نہیں ہیں اور ڈاکٹر فہد اور ڈاکٹر رجا بھی چھٹی پر ہیں۔ سو آپ میرے ساتھ آیئے پلیز۔"

تحکمانہ انداز میں اسے حکم دینے کے بعد وہ پلٹ گئے۔

ذہنی تھکن اس قدر تھی کہ بس گھر جا کر آرام کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر فرض تو آخر فرض ہوتا ہے نا' اس سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ کسی کی زندگی سے زیادہ قیمتی اس کا آرام نہیں تھا۔ سو اس نے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا اور اپنی چیزیں واپس روم میں رکھ کر آپریشن تھیٹر میں آگئی۔

دو گھنٹے کے آپریشن کے بعد وہ دونوں تھکے قدموں کے ساتھ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے تھے۔

تب وہ سندر چہرے والی کانچ سی نازک لڑکی تقریباً دوڑتی ہوئی زرار کے قریب آئی تھی۔

"ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر کیسی طبیعت ہے اب میرے شوہر کی؟ ڈاکٹر پلیز آپ۔۔۔ آپ اسے بچا لیجیے۔ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔۔۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔"

وہ ان کے پاؤں پکڑ کر رونے لگی۔

زرار شاہ کو اس کی اس حرکت پر جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"دیکھیں، بہن پلیز آپ اس طرح مت کریں۔ ہم لوگ بھی آپ ہی کی طرح کے انسان ہیں اور اللہ کے فیصلوں کے آگے بے بس بھی۔۔۔ اس لیے ہم صرف کوشش کر سکتے ہیں۔ میں نے پوری کوشش کی ہے انہیں بچانے کی' خون بہت بہہ چکا ہے' آپ بس دعا کریں کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر انہیں ہوش آجائے۔"

سنجیدہ لہجے میں تسلی دینے کے بعد انہوں نے اپنا

ہاتھ لڑکی کے سر پر رکھا تھا اور پھر وہاں سے ہٹ گئے۔
مشارب، بھیگی پلکیں جھپک کر ڈاکٹر زرار کی پشت کو تکنے لگی تھی جو شکستہ قدموں سے چلتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

٭ ٭ ٭

"ڈاکٹر پلیز! اسے بچا لیجئے۔" میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں" میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔۔۔" اس لڑکی کا سسکتا لہجہ سماعتوں میں گونجا تو اک تلخ مسکراہٹ نے ڈاکٹر زرار کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔
"واہ رے محبت تیرے ڈھونگ۔۔۔!"
"سر! چائے لیجئے۔"
جانے اور کتنی دیر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اپنے اندر چھڑی سوچوں سے جنگ کرتے رہتے۔ اگر ان کے قریب وہ مانوس سی آواز نہ ابھری ہوتی۔
لمبے بالوں کی چوٹی پشت پر ڈالے معصومیت سے ان کا چہرہ تکتی دونوں ہاتھوں میں مگ تھامے وہ ان کی کرسی سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔
"اوہ تھینک یو مشارب۔" لمحے کے ہزارویں حصے میں اپنے آپ کو کمپوز کرتے وہ سیدھے ہو بیٹھے پھر مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور اس کے ہاتھ سے چائے کا بھاپ اڑاتا ہوا مگ تھام لیا تھا۔
"مان گئے مسٹر زرار ارسلان آپ کو۔۔۔ خود کو چھپانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔۔۔!" ان کی جلتی آنکھوں کو تکتے ہوئے مشارب نے دل میں سوچا تھا۔ پھر زرار کو اپنا مگ تھمانے کے بعد ان کی اجازت کی پروا کیے بغیر میز کی دوسری طرف رکھی کرسی پر براجمان ہو گئی تھی۔
جبکہ اس بے تکلفی پر وہ چونک کر رہ گئے تھے۔
اس نے آرام سے چائے کا مگ ٹیبل پر رکھا پھر اوور آل کی پاکٹ میں سے بیسن سینڈوچ کا ہاف رول نکالا اور سامنے بیٹھے شخص کے تاثرات کی پروا کیے بغیر بسکٹ چائے میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگی۔ زرار شاہ حیرت سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔
جو اس طرح بسکٹس کے ساتھ انصاف کر رہی تھی۔ جیسے اس دنیا میں صرف بسکٹس کھانے کے لیے ہی آئی ہو۔ خود پر مرکوز کسی کی گہری نگاہوں کی تپش کا احساس ہوا تو آہستگی سے گھنیری پلکیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ اور جیسے منہ کے اندر موجود بسکٹ اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔
"سو۔۔۔ ری۔۔۔ ایم۔۔۔ سوری۔" اٹک اٹک کر اس نے معذرت کی تھی۔
"ارے غضب کر رہی ہیں آپ، سوری تو مجھے کرنا چاہیے آخر میں نے آپ کو کھانے میں ڈسٹرب کیا ہے۔" ہونٹوں کی تراش میں ابھرنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کو دباتے ہوئے وہ نرمی سے گویا ہوئے پھر سامنے رکھے رول میں سے آخری بسکٹ اٹھا کر چائے میں ڈبونے لگے۔
مشارب سلطان اپنی مسکراہٹ چھپانے کی خاطر سر جھکا گئی تھی۔

٭ ٭ ٭

وہی ہوا تھا جس کا اسے ڈر تھا۔ دیار غیر میں بیٹھے رومیل ارسلان نے اپنا پرپوزل بھیج کر اس کی زندگی میں طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ ارسلان شاہ نے بڑی چاہت کے ساتھ سلطان صاحب سے مشارب کا رشتہ مانگا تھا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ بھائی کی خواہش سن کر کھل اٹھے۔
یوں بھی ذاتی طور پر انہیں رومیل بہت پسند تھا۔ بیٹی کے روشن مستقبل کو دیکھتے ہوئے انہوں نے فوراً ارسلان شاہ کے سامنے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی اور مطمئن ہو گئے تھے۔ مگر ان کا اطمینان اس وقت بکھر کر رہ گیا۔
جب رافعہ بیگم ان کی شریک حیات نے مشارب کے انکار کی خبر انہیں سنائی تھی۔
"یہ کیا بکواس ہے رافعہ بیگم؟ مشارب کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ رومیل میں کیا کمی ہے جو وہ شادی سے انکار کر رہی ہے۔" بے حد غضب ناک ہوتے ہوئے انہوں نے اپنی شریک سفر کی جانب دیکھا

تھا۔ جوان کے سامنے شرمندگی سے سر جھکائے کھڑی تھیں۔

"سلطان! میں کیا کہہ سکتی ہوں، میں تو خود حیران ہوں۔ مشارب نے زندگی میں ہمیشہ ہماری چھوٹی سے چھوٹی خواہش کا بھرپور احترام کیا ہے۔ مگر اس معاملے میں اس کی ضد میری سمجھ سے باہر ہے اس کا کہنا ہے وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"تو کیا میں اسے ساری زندگی بٹھائے رکھوں گا۔" وہ بھڑک کر بولے تھے۔

"وہ ایک زرار کیا ہمارے لیے کم تھا جو یہ بھی اس کے نقش قدم پر چل نکلی ہے۔ میں آج رات اس سے خود بات کروں گا۔"

☼ ☼ ☼
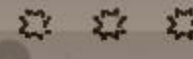
"بابا آپ۔۔۔؟" وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی جب ہلکی سی دستک کے بعد بابا اس کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

مشارب ان کو اس وقت اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ہاں میں! کیا آپ کو اعتراض ہے میرے یہاں آنے پر؟"

"نہ نہیں بابا۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" ان کے سنجیدہ چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

تب سلطان صاحب نے آگے بڑھ کر اسے دونوں شانوں سے تھام لیا تھا پھر آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

"آپ نے اپنی مما سے کیا کہا ہے؟" ان کے استفسار میں چھپی سرد مہری نے مشارب کے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے یوں بابا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

"میں اس خاموشی سے مطمئن نہیں ہوں مشارب۔۔۔ میں آپ کے منہ سے سننا چاہتا ہوں وہی سب جو آپ نے اپنی مما کے سامنے کہا تھا۔" وہ شرم سے سر جھکا گئی تھی۔

"بابا میں۔۔۔ میں وہ۔۔" بمشکل اتنا ہی کہہ پائی پھر جھجک کر خاموش ہو گئی۔

"آپ شادی نہیں کرنا چاہتیں فقط یہ کہنا چاہ رہی ہیں ناں؟"

"بابا۔۔۔ آپ پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔" ایک دم ہی جانے اسے کیا ہوا کہ آگے بڑھ کر ان کے سینے سے سر ٹکا کر رو پڑی تھی۔

اس کے اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نرم پڑ گئے تھے پھر مشارب کے سر کو سہلاتے ہوئے خود ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

"کیوں کر رہی ہیں ایسا بابا کی جان؟" سلطان صاحب نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے نرمی سے پوچھا تھا۔ مشارب نے اپنے لب دانتوں تلے کچلتے ہوئے سر جھکا لیا اور جب بولی تو بے بسی کا رنگ اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔

"بابا! مجھے لگتا ہے۔ میں آپ پر، مما پر اور شعیب لالہ پر بوجھ بن چکی ہوں۔ جسے آپ جلد سے جلد اپنے کندھوں سے اتار کر پھینک دینا چاہتے ہیں۔" بلیک میلنگ کے اس انداز پر وہ اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

"لیکن اگر آپ نے زبردستی اپنے اس فیصلے کو میرے اوپر مسلط کرنے کی کوشش کی تو یقین مانیے بابا! آپ کی مشارب بکھر کر رہ جائے گی۔۔۔ وہ مر جائے گی بابا۔۔ مر جائے گی۔" ڈوبتے لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک بار پھر ان کے سینے سے جا لگی تھی اور اس بار ایسا تڑپ کر روئی کہ مجبوراً سلطان شاہ کو ہتھیار پھینکنے پڑے تھے، وہ اس کے کمرے سے شکست خوردہ سے لوٹ آئے۔

☼ ☼ ☼

اس کے بعد منال سے لے کر دادی جان، شعیب

بھنک لیا تھا۔ ارسلان شاہ مزاجاً نرم خو واقع ہوئے تھے اس لیے اس وقت بھی بجائے اس معاملے کو انا کا مسئلہ بنانے کے انہوں نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ مگر یہ انکار سن کر رومیل شاہ خاموش نہیں رہ سکا تھا۔

"بابا! مشارب سلطان نے مجھے ریجیکٹ کرکے اچھا نہیں کیا۔۔۔! اس نے شادی سے انکار کرکے جو طمانچہ میرے منہ پر مارا ہے۔ اس کی جلن میں زندگی بھر محسوس کرتا رہوں گا۔۔۔ آپ اسے بتادیجئے گا رومیل ارسلان واپس آرہا ہے۔"

یہ کہہ کر رومیل سلسلہ منقطع کرگیا تھا۔ جبکہ ارسلان شاہ سناٹے میں آکر ریسیور ہاتھوں میں لیے وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔ قصر سلطان کی فضا میں ان دنوں عجیب سی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ گھر کے تمام فرد ہی اس مسئلے کو لے کر بے حد ڈسٹرب ہو رہے تھے۔ صرف ایک زرار ارسلان ہی تھے جو قصر سلطان میں رونما ہونے والے ان تمام واقعات و معاملات سے یکسر بے خبر تھے ان کو تو اب بھی پتا نہ چلتا اگر وہ ویک اینڈ والے روز کلب میں شعیب سلطان کی خاموشی اور مسلسل غائب دماغی کو محسوس کرتے ہوئے چونک نہ گئے ہوتے۔

"کیا بات ہے یار شعیب! تم کچھ ڈسٹرب سے دکھائی دے رہے ہو؟" سگریٹ سلگاتے ہوئے زرار نے استفسار کیا تھا۔

تب لمحے بھر کے تذبذب کے بعد شعیب ان سے اپنا مسئلہ شیئر کرنے لگا۔

رومیل کے پرپوزل کے بارے میں سن کر وہ حیران رہ گئے۔ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود وہ ان تمام معاملات سے کس قدر لاعلم تھے۔ رومیل ان کا بھائی تھا؟ اور کسی نے انہیں بتانے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی۔

بھی ہے۔ اسے شادی نہیں کرنی۔ پیار سے سمجھا کر دیکھ لیا۔ سختی سے سمجھا کر دیکھ لیا پر جیسے کوئی اثر نہیں ہوتا۔۔۔ بجائے ہماری بات ماننے کے الٹا رونے بیٹھ جاتی ہے۔" افسردہ لہجے میں وہ یہ سب کہتا چلا گیا تو زرار اپنے ہونٹ کاٹنے لگے۔ پھر انگلیوں کے بیچ دبے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولے۔

"ٹیک اٹ ایزی یار۔۔۔ تمہیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے مشارب کو وقت کے ساتھ اپنا فیصلہ بدلنا پڑے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔۔۔ ورنہ تو وہ بھی تمہاری ہی کزن ہے اتنا وقت گزر جانے کے بعد تم سدھرے ہو جو وہ سدھرے گی۔۔۔؟" شعیب نے خاصے تیکھے انداز میں کہا تھا اس کی بات پر زرار کے چہرے پہ اک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ تلخ انداز میں مسکراتے آنکھوں میں امڈ آنے والی نمی کو چھپانے کی خاطر دوسرے ہی لمحے سر جھکا گئے تھے۔

"یار زرار! ویسے ایک بات ہے۔" شعیب جوان کی آنکھوں میں چمکتی نمی نہ دیکھ پایا تھا۔ اپنے کسی خیال کے تحت بولا۔

"میں نے نوٹ کیا ہے مشارب تمہاری بہت عزت کرتی ہے۔۔۔ تم اسے سمجھا کر دیکھ لو۔ کیا پتا وہ مان جائے۔۔۔ آخر تم اس کے سر بھی تو ہو۔" شعیب نے لفظ سر کو کچھ کھینچتے ہوئے ادا کیا تو زرار ارسلان نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

کئی دن مسلسل ٹینشن میں گزارنے کے بعد مشارب آج خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ ورنہ تو رومیل ارسلان کے اس پرپوزل کی وجہ سے اس کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔ مگر آج جیسے ہی مما نے یہ گڈ

نیوز سنائی تھی کہ بابا نے بڑے بابا کو انکار کر دیا ہے۔ وہ جھوم اٹھی تھی دل پر سے اداسی کا بوجھ سرکا تو وہ گزرے دن کے واقعات کو قلم بند کرنے کی خاطر اپنی ڈائری لے کر بیٹھ گئی۔

گولڈن کور والی یہ ڈائری مشارب کے دل کی تمام باتیں جانتی تھی۔ کئی سالوں سے وہ اپنے دل کی تمام باتیں تمام راز اسی ڈائری کو سونپتی آ رہی تھی۔ اس وقت بھی اپنے دل کا سارا غبار ڈائری کے اوراق پہ رقم کرنے کے بعد وہ شاور لینے کے ارادے سے واش روم میں گھس گئی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد کاہی رنگ کے دیدہ زیب سوٹ میں وہ بھیگے بالوں کو تولیے سے رگڑتی واش روم سے باہر نکلی تھی ٹھیک اسی وقت بیڈ پر رکھا اس کا سیل جگمگا اٹھا۔ ذرا سا جھجک کر موبائل ہاتھ میں اٹھالیا تھا۔

"مشارب! کیا آپ کچھ دیر کے لیے میرے بیڈ روم میں آسکتی ہیں!۔۔۔ زرار میر۔"

وہ ساکت پلکوں سے اسکرین پر روشن زرار کے نام کو تک رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر پھیلی حیرت کی جگہ طنزیہ مسکراہٹ نے لے لی۔

"تو کیا زرار صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں سمجھانے کی خاطر بلایا ہے؟ اگر یہ بات ہے تو میں بھی آج اپنے تمام حساب بے باق کر کے لوٹوں گی۔" اس کا دمکتا چہرا ایک ثانیے کو بجھ سا گیا تھا۔

نازک ہتھیلی کی پشت سے غلافی آنکھوں میں امڈ آنے والی نمی کو رگڑتے ہوئے اس نے پرعزم انداز میں سوچا تھا پھر بالوں کے گیلے آبشار کو تولیے کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے پشت پہ کھلا چھوڑ دیا اور صوفے پر رکھا سوٹ کا ہم رنگ دوپٹہ اٹھا کر زرار شاہ کے بیڈ روم کی طرف آگئی تھی۔ انگلیوں کی مدد سے دروازے پر ہلکی آواز سے دستک دی اور پھر اجازت ملنے پر دوسرے ہی پل کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔

سامنے ہی بلیو کلر کی جینز پینٹ اینڈ وائیٹ شرٹ میں ملبوس وہ جہازی سائز بیڈ پر لیٹے تھے اسے دیکھ کر ہاتھ میں پکڑی کتاب سائیڈ پر رکھ کر اور خود اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"مشارب! آپ جانتی ہیں میں نے آپ کو اس وقت اپنے کمرے میں کیوں بلایا ہے؟" کمرے کی خاموشی کو زرار کی دلکش و بھاری آواز نے توڑا تھا۔

"تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے سر! آپ مجھے ڈائریکٹ — وہ بات کہہ سکتے ہیں جسے کہنے کے لیے آپ نے اس وقت مجھے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔" نہایت جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تلخ لہجے میں یہ سب کہتی وہ زرار ارسلان کو حیران کر گئی تھی۔ جھٹکے کے ساتھ بیڈ سے اٹھ کر وہ مشارب کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"یو آر رائٹ مشارب سلطان! مجھے کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے اور میں تمہید باندھوں گا بھی نہیں — نہایت ہی سیدھے انداز سے پوچھ رہا ہوں؟"

"آپ نے روحیل ارسلان کے پروپوزل کو ریجیکٹ کیوں کیا؟"

"آپ نے غلط خبر سنی ہے سر! میں نے روحیل ارسلان کے پرپوزل کو رد نہیں کیا بلکہ شادی کرنے سے انکار کیا ہے۔" زرار شاہ کے تپتے چہرے کو محظوظ نظروں سے تکتی وہ ایک اور جرات کا مظاہرہ کر گئی تھی۔

"لیکن کیوں؟ آپ انکار کیوں کر رہی ہیں۔ شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟" ایک ایک لفظ کو کھینچ کر ادا کرنے کے بعد وہ سامنے کھڑی مشارب کو دیکھنے لگے۔

یک لخت ہی مشارب کی ہتھیلیاں پسینے میں تر بتر ہو گئیں۔ اس نے اس وقت خود کو بڑی مشکل میں محسوس کیا۔ وہ سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں زیادہ دیر نہیں دیکھ پائی تھی۔

"آپ خاموش کیوں ہیں مشارب؟ میں وجہ جاننا چاہتا ہوں؟ آپ کے انکار کی وجہ کیا ہے؟" اک لمحے کو اس کا دل چاہا تھا کہ (وجہ کیا ہے) انہیں بتا دے مگر پھر دوسرے ہی لمحے عزت نفس آڑے آگئی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

اسے خاموش دیکھ کر قدرے ترش انداز میں گویا

ہوئے۔

"میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے ڈاکٹر مشارب! مجھے اس کا جواب دیں۔"

"آپ کے انکار کی وجہ کیا ہے زرار سر؟" زرار کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ الٹا ان سے سوال کر گئی تھی۔

اس چھوٹی سی لڑکی کی اس درجہ جرات پر وہ حیران کھڑے اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"آپ نے بتایا نہیں آپ کے انکار کی وجہ کیا ہے؟ اور آپ بھی شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے؟" مشارب نے لفظ "آپ بھی" کو کھینچ کر ادا کیا تو اس کے انداز پر وہ غصہ ضبط کر کے بولے۔

"میں خود کو مشارب سلطان کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں سمجھتا۔" لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔

"آپ بھلے نہ بتائیں سر، میں آپ کے بغیر بتائے بھی جانتی ہوں۔ آپ کے انکار کی وجہ یہی ہے نا مسٹر زرار شاہ کہ آپ اب تک حرا شاہ سے محبت کرتے ہیں۔ اسی لیے شادی نہیں کرنا چاہتے۔"

"مشارب!" زرار ارسلان کا ہاتھ بہت اچانک اٹھا تھا اور اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔

باقی کے الفاظ مشارب کے منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ گال پہ ہاتھ رکھے وہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

"بکواس بند کرو اور نکل جاؤ میرے کمرے سے۔" اسے تھپڑ مارنے کے بعد زرار نے بائیں ہاتھ میں تھاما سیل فون دیوار پر دے مارا تھا۔ مشارب پھیکی ہنسی ہنس دی۔

"شاید سب لوگ آپ کی طرح ہی ری ایکٹ کرتے ہوں گے جب ان کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا جاتا ہوگا؟" زرار کے سرخ پڑتے چہرے کو لمحہ بھر کے لیے اپنی چبھتی نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے اس نے طنز کا آخری تیر چلایا تھا اور پھر وہاں رکی نہیں تھی۔

الفاظ کیا تھے، زہر میں بجھے تیر تھے جو ان کی روح میں پیوست ہو کر رہ گئے۔ مشارب سلطان کے اس آخری وار پر زرار شاہ کا دل کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔ بھیگتی پلکیں جھکا کر وہ بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر سجے سوہنی کے مجسمے کو دیکھتے رہ گئے۔

وقف حرماں و یاس رہتا ہے
دل ہے کہ اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کر بھول جاتے ہو
مجھ کو احساس کا پاس رہتا ہے

☼ ☼ ☼

"مشارب بی بی! یہ کارڈ زرار صاحب نے آپ کے لیے دیا ہے۔" وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ایف ایم سن رہی تھی جب کارڈ ہاتھوں میں تھامے عابدہ وہاں چلی آئی۔

مشارب نے استعجابیہ نگاہوں سے عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا پھر عابدہ کو جانے کا کہہ کر وہ کارڈ کھول کر دیکھنے لگی۔ کارڈ پر لکھی عبارت پڑھ کر اس نے بے اختیار اپنی خوش فہمی کو ملامت کی۔ وہ سمجھی تھی کہ شاید زرار نے اس دن کے رویے پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف سوری کا کارڈ بھیجا ہے۔ جبکہ یہ کارڈ تو ڈاکٹر اریب اور ڈاکٹر رجا کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔

"میں کون سا شادی پہ جاؤں گی جو موصوف زرار صاحب نے اسے میری طرف بھجوانے کی زحمت کی ہے؟" بے زاری سے کارڈ کو ایک طرف ڈالتے ہوئے اس نے دل میں سوچا تھا پھر اپنے گرد لپٹی شال کو درست کرتے ہوئے اس نے خود کو جیسے سردی کی شدت سے بچانے کی کوشش کی تھی اور پھر دوبارہ اپنی توجہ کانوں میں لگی ہینڈز فری سے ابھرتی پرینتو کی دلکش آواز کی جانب مبذول کر لی تھی۔ جو پروین شاکر کا شعر گنگنا رہا تھا۔

کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا تیرا خیال بھی!
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ، ہوتا رہا ملال بھی

☼ ☼ ☼

وہ دسمبر کی ایک سرد رات تھی۔ چاند پوری آب و

تاب کے ساتھ آسماں پر چمک رہا تھا کمرے کے گلاس ونڈو سے جھانکتی چاندنی کی میٹھی میٹھی روشنی بھی ان کی طبیعت پر چھائی اداسی کو دور نہیں کرپائی تھی۔

چبھتی ہے قلب و جاں کو ستاروں کی روشنی
اے چاند ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے

کمبل شانوں تک تانے تکیہ پہلو میں لیے وہ کروٹ کے بل لیٹے نیند کو منانے کی کوشش کر رہے تھے جو کئی راتوں سے زرار ارسلان کی آنکھوں سے روٹھی ہوئی تھی۔

چاند پر سے نگاہ ہٹا کر وہ سامنے والی دیوار پر لگے وال کلاک کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ رت جگوں سے سوجی آنکھیں وال کلاک سے ہٹ کر اب بیڈ کے بائیں طرف سائیڈ ٹیبل پر سجے سوہنی کے مجسمے پر آکر ٹک گئی تھیں۔

لب بھینچ کر وہ مشارب کے بارے میں سوچنے لگے۔ اس رات اس پر ہاتھ اٹھانے کے بعد زرار اس سے سخت شرمندہ تھے اور وہ معذرت کرنا چاہتے تھے مگر مشارب نے تو جیسے ان کے سامنے نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ان دنوں اس نے دارالشفا جانا بھی چھوڑ رکھا تھا۔ وہ جب شام کو اسپتال سے لوٹتے مشارب اپنے روم میں بند ہو جاتی۔ صبح وہ جب زرار دوبارہ ہاسپٹل جانے لگتے تو وہ ناشتے کی ٹیبل پر موجود نہ ہوتی۔ زرار ارسلان زچ ہو کر رہ جاتے۔ کل شاہ ڈاکٹر اریب اور ڈاکٹر رجا کا ویڈنگ کارڈ لے کر وہ اس کے کمرے تک گئے تھے مگر پھر اک عجیب سی جھجک نے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے وہ کارڈ ملازمہ کے ہاتھوں مشارب کے کمرے میں پہنچا دیا تھا اور خود مضطرب سے ہو کر واپس اپنے کمرے میں آگئے تھے اس وقت بھی بے نام سے اضطراب نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ سوچوں کے جال میں جکڑے وہ جانے کتنی دیر سے نیند کو منانے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ تھی کہ ان کی آنکھوں سے کوسوں دور کھڑی تھی۔

"رت جگے تمہارا مقدر ہیں زرار ارسلان یوں روٹھی نیند کو منانے کی کوشش میں خود کو مزید مضطرب نہ کرو۔" زیر لب خود کو باور کراتے ہوئے انہوں نے بستر چھوڑ دیا تھا۔ پھر جانے دل میں کیا سمائی کہ صوفہ پر رکھی شال اٹھائی اور کندھوں پہ ڈال کر باہر آگئے۔

باہر سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے باہر لان میں نکل آئے تھے اور لان میں آتے ہی زرار کے قدم جم کے رہ گئے تھے۔ بلیک شال اوڑھے وہ لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی۔ وقفے وقفے سے اس کی سسکیاں لان کی خاموش فضا میں ابھرتی اور مدھم ہو جاتی تھیں۔

مشارب کی دبی دبی سسکیوں کی آواز سن کر وہ بے چین سے ہو کر آگے بڑھ آئے پھر آہستگی سے اس کے قریب آکر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

وہ ان کی موجودگی سے بے خبر سر جھکائے بیٹھی آنسو بہائے جا رہی تھی دفعتاً" ہوا کے سرد جھونکے نے جہاں مشارب کے بالوں کی چند لٹوں کو چہرے کے آگے کر دیا تھا وہیں زرار کے وجود سے پھوٹتی (Hugoboss) پرفیوم کی دلفریب مہک نے اسے ساکت کر دیا۔ سانس روک کر اس نے سر اٹھایا تھا۔

سیاہ رنگ کی جینز پینٹ اور لیمن کلر کی شرٹ میں گرے شال کاندھوں پہ ڈالے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھے وہ اداس نگاہوں سے اس کو دیکھ رہے تھے۔

زرار کو اس وقت وہاں پا کر لمحہ بھر کے لیے مشارب کی آنکھوں میں استعجاب جاگا تھا۔ مگر دوسرے ہی پل وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے سر جھکا گئی تھی۔

تب افق کی آغوش میں جگمگاتے چاند کی بھرپور روشنی میں بھیگی پلکوں والی اس لڑکی کو دیکھ کر زرار شاہ کا دل چاہا' ہاتھ بڑھا کر وہ اس کی آنکھوں کے سارے آنسو سمیٹ لیں۔ جو خود ان کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آئے تھے۔ مگر اس وقت اپنی اس خواہش کو دبا کر انہوں نے اپنا ہاتھ مشارب کے سر پر رکھ دیا تھا۔

زرار ارسلان کے ہاتھ کا بھاری لمس اپنے سر پہ محسوس کرتے اس کے آنسوؤں میں کچھ اور بھی تیزی آگئی تھی تب اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹاتے ہوئے وہ نہایت نادم لہجے میں گویا ہوئے۔

"مشارب! اس رات آپ کے ساتھ جو مس بی ہیو کیا۔ اس کے لیے اگر اس وقت معذرت کروں تو ۔۔۔؟"

"تو میں یہ معذرت قبول نہیں کروں گی۔۔۔" ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس نے کہا تو وہ مشارب کے لہجے کی بے رخی محسوس کرکے خفت سے مسکرا دیے۔ مشارب نے کن اکھیوں سے اداس آنکھوں کے ساتھ مسکراتے اس شخص کی جانب دیکھا تھا۔ پھر قدرے روٹھے پن سے بولی تھی۔

"مجھے باسی معذرت نہیں چاہیے۔۔۔ تھپڑ چار روز پہلے مارا تھا اور سوری اب کررہے ہیں؟" زرار پہلے تو سمجھ ہی نہ پائے کہ وہ کیا کہہ گئی ہے مگر جونہی سمجھ میں آیا تھا' وہ کھل کر ہنس دیے تھے۔

انہیں ہنستا دیکھ کر مشارب کے چہرے پر روشنی بکھر گئی تھی۔ بہرحال کچھ بھی تھا' مشارب کو سامنے بیٹھے شخص کی ہنسی بہت عزیز تھی۔ چند ثانیے ہنستے رہنے کے بعد وہ مسکراتے لہجے میں گویا ہوئے۔

"مشارب سلطان! تم ایک بہت مشکل لڑکی ہو۔"

"تھینک یو سر۔" اس تبصرے پر اس نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور جب بولی تو لہجہ شوخ تھا۔

"ویسے ایک بات ہے سر! آپ بھی کچھ کم مشکل نہیں ہیں۔۔۔ اس دن میرے معصوم گال پر اتنی زور سے تھپڑ مارا تھا کہ مجھ مسکین کے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔" مشارب کے "معصوم گال" کہنے پر وہ خاصے محظوظ ہوئے پھر سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔

"دراصل اس رات غصے کی شدت نے مجھے پاگل بنا دیا تھا بہرحال' جو کچھ ہوا' اس کے لیے میں سخت شرمندہ ہوں۔"

"ارے نہیں۔" وہ ایک دم سے ان کی بات کاٹ گئی۔ "اس طرح تو آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔ سوری تو مجھے کہنا چاہیے میں نے آپ کو ہرٹ کیا تھا ۔۔۔" وہ دھیرے سے اپنے دل کی بات کہہ گئی۔ تب زرار اس کی بات پر سر جھکا کر رہ گئے تھے۔ مشارب نے ایک بے چین نگاہ ان کے جھکے ہوئے سر پر ڈالی تھی پھر جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ اپنا ہاتھ ان کے سامنے کردیا۔

"فرینڈز؟" زرار چند لمحوں کے لیے حیرت بھری نظروں سے اپنے سامنے پھیلی گلابی ہتھیلی کو تکتے رہے پھر اگلے ہی پل مسکراتے ہوئے اس کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

"تھینک یو۔" زرار ارسلان کے مضبوط ہاتھ کا لمس محسوس کرتے وہ دلکشی سے مسکرادی تھی۔

اور تب بھیگی نکھری چاندنی میں مشارب سلطان کے مسکراتے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں لے کر وہ بھی مسکرا دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

مکمل تیار ہونے کے بعد وہ قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا روپ آج غضب ڈھا رہا تھا۔ بے اختیار ایک فاتحانہ مسکراہٹ نے مشارب کے لبوں کو چھو لیا۔ ٹھیک اس وقت اس کے سیل پر میسج ٹون بجی تھی۔ دائیں کان میں پڑے جھمکے کو درست کرتی وہ جھٹکے سے صوفے پر رکھے سیل کی طرف پلٹی تو اس کے لیے اسٹیپ کٹ بال بکھر کر رہ گئے۔

عجلت میں سیل اٹھایا اور میسج پڑھنے لگی۔ زرار ارسلان کا میسج تھا۔ وہ نیچے گاڑی کے پاس کھڑے اس کا انتظار کررہے تھے۔ ان دونوں کو آج ڈاکٹر رجا اور ڈاکٹر اریب کی شادی میں جانا تھا۔

ایک مرتبہ پھر خود کو آئینے میں بھرپور نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی اونچی ہیل کی سینڈل کے ساتھ احتیاط سے چلتی نیچے آئی تھی۔

بلیک ڈنر سوٹ میں سیتے سے بال ایک طرف جمائے وہ اپنی بلیک پراڈو کے قریب کھڑے کسی کے ساتھ فون پر بات کررہے تھے جونہی لیڈیز پرفیوم کی دل فریب مہک سانسوں سے ٹکرائی تھی وہ چونک کر پلٹے

اور جیسے ہی اس پر نظر پڑی پلک جھپکنا بھول گئے۔

بلیک کلر کی سلک کی ساڑھی، جس کے باڈر پہ وائٹ اینڈ پرپل موتیوں کا بے حد نفیس سا کام کیا گیا تھا۔ اسٹیپ کٹ کمر سے نیچے آتے بالوں کے ساتھ آنکھوں میں ہیرونا کی سی چمک والے بلیو لینس لگائے نفاست کے ساتھ کیے گئے میک اپ اور نازک سی جیولری میں مشارب سلطان، اس وقت زرار ارسلان کے ہوش اڑا گئی تھی۔

سیل فون کان سے لگائے وہ بنا پلک جھپکے ساکت کھڑے اسے تک رہے تھے۔

اور تب وہ ان کی ساکت نگاہوں کی زد میں بڑے ہی فاتحانہ انداز سے مسکرائی تھی، اور اس مسکراہٹ کی دلکشی نے بت بنے کھڑے زرار کو جیسے کسی خواب سے جگا ڈالا تھا۔

"لیٹس گو" حواسوں میں لوٹنے کے فوراً بعد زرار نے سیل فون کان سے ہٹاتے ہوئے اس سے کہا تھا اور پھر آگے بڑھ کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا وہ سج سج قدم اٹھاتی بڑی نزاکت کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

مشارب کے بیٹھنے کے بعد انہوں نے فرنٹ ڈور بند کیا اور خود بھی آکر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گئے۔ یوں کچھ ہی دیر بعد رات کے اس پہر میں ان کی بیک پراڈو سیاہ تارکول کی سڑک پر بھاگ نکلی تھی۔

مردانہ کلون اور لیڈیز پرفیوم کی ملی جلی مہک نے گاڑی کی اندرونی فضا کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ پراڈو کے اندر چھائی معنی خیز خاموشی کو توڑنے کی خاطر زرار نے ہاتھ بڑھا کر میوزک پلیئر آن کر دیا اور اس کے ساتھ ہی جیسے نصرت فتح علی خان گنگنا اٹھے تھے۔

فیصلہ ہے یہی بات ہے یہ اٹل۔۔۔

حسن والوں میں تیرا نہیں ہے بدل

"ارے خان صاحب تو میری تعریف کرنے لگے۔۔۔!" وہ خوامخواہ خوش فہم ہوئی اور کن انکھیوں سے اپنے برابر بیٹھے شخص کی طرف دیکھا تھا۔ جو ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس سے خاصے بے نیاز نظر آ رہے تھے۔

"خود کو جانے کیا سمجھتے ہیں؟" مشارب نے ان کی بے نیازی پر جھنجلا کر سوچا تھا۔ ٹھیک اس وقت ہوا کی شرارت سے اڑتے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے جھٹکتے ہوئے اس کی کلائی میں پڑی کانچ کی سلور چوڑیاں بج اٹھیں۔

اس جلترنگ پہ زرار چونک سے گئے۔ ونڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ نظروں کے تصادم پر مشارب دلکشی سے مسکرا دی تھی۔ جواباً ایک ہلکا سا تبسم اس کی جانب اچھال کر وہ دوبارہ ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

مشارب خوامخواہ ہی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

گاڑی سگنل پر رکی تو زرار نے میوزک سسٹم بھی آف کر دیا۔

"جل ککڑے ہیں پورے! خود تو ایک لفظ بھی تعریف نہیں کی۔۔۔ دوسرا اگر رہا تھا اس کی بھی بولتی بند کر دی۔" ان کے میوزک پلیئر آف کرنے پر مشارب نے جل کر سوچا تھا۔

"صاحب۔۔۔ لے لیجیے نا۔ تازہ پھولوں کے گہنے ہیں!" وہ چھوٹا سا بچہ ہاتھوں میں پھولوں کے کنگن اٹھائے زرار شاہ سے اصرار کر رہا تھا۔ مشارب رخ پھیر کر بچے کی طرف دیکھنے لگی۔

"صاحب! لے لیجیے نا؟" اس بچے نے پھر اصرار کیا۔

"یار! کہا نا نہیں چاہئیں۔۔۔ میں کیا کروں گا ان کا؟"

"صاحب! بیگم صاحبہ کو دے دیجیے گا نا، وہ خوش ہو جائیں گی۔"

"سو سوئیٹ۔" مشارب کو بے اختیار اس بچے پر پیار آنے لگا۔

"کتنے کے ہیں؟" لمبا سانس کھینچتے ہوئے زرار نے آخر جان چھڑانے کی خاطر کنگن خریدنے کا فیصلہ کر لیا، بچہ ایک دم کھل اٹھا اور خوشی خوشی کنگنوں کی قیمت بتانے لگا۔ زرار شاہ نے مطلوبہ رقم اسے تھمائی اور کنگن اس کے ہاتھ سے لے لیے۔ مشارب کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں۔

"یہ لو۔" زرار نے کنگن اس کی طرف بڑھائے تھے تب مشارب نے کنگن ان کے ہاتھ سے لینے کے بجائے اپنی سنہری کلائی ان کے آگے کردی تھی۔

اس کی اس حرکت پر لمحہ بھر ٹھٹھکنے کے بعد زرار نے مشارب کا نازک ہاتھ تھام کر دونوں کنگن دھیرے سے اس کی کلائی میں پہنا دیے۔

"تھینکس۔" شکریہ ادا کرتے مشارب سلطان کی پلکیں لرز گئی تھیں۔

"یو آر ویلکم۔" دھیمے لہجے میں کہنے کے بعد انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی۔

ہوٹل پہنچنے پر ڈاکٹر اریب نے بے اختیار ان دونوں کے کپل کو سراہا تھا۔

"تھینک یو یار!" زرار نے سادہ سے لہجے میں شکریہ ادا کیا تھا۔

"میرے ساتھ رہیں گے تو ایسی ہی تعریفیں سننے کو ملیں گی۔" ڈاکٹر اریب کے کسی اور کی طرف متوجہ ہونے کے بعد مشارب نے ان کے قریب ہو کر سرگوشی کی تو وہ اس کی اس درجہ خود اعتمادی پر اپنی بے ساختہ امڈتی مسکراہٹ چھپانے کے خاطر سر جھکا گئے۔

✲ ✲ ✲

وہ دارالشفا کے آئی سی یو سے نکل رہی تھی جب سامنے سے آتے شخص پر نظر پڑتے ہی بت بن گئی۔

بلیو کلر کی جینز پینٹ اور ریڈ شرٹ میں ملبوس تازہ سرخ گلابوں کا بوکے ہاتھوں میں تھامے وہ سیدھا اس کی جانب آرہا تھا۔

دیار غیر میں کیسے تجھے صدا دیتے
تو مل بھی جاتا تو آخر تجھے گنوا دیتے
تمہیں بھولنا ہی اول تو میری دسترس میں نہیں
جو یہ اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے

اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔

"تم کیا سمجھی تھیں' تمہارے انکار کے بعد میں تمہیں بھول کر وہاں بیٹھ جاؤں گا۔۔۔؟ نہیں مشارب سلطان! تم بھولنے والی چیز ہرگز نہیں ہو۔" وہ والہانہ انداز میں اس کا چہرہ تکتے ہوئے مسکرایا تھا۔

اور مشارب سلطان پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی برا سپنا دیکھ رہی ہو۔

"رومیل۔۔۔ تم کب آئے؟" وہ تھوک نگلتے ہوئے بمشکل اتنا کہہ پائی تھی جب کہ وہ ہنس پڑا تھا۔

"صبح ہی پہنچا ہوں جب قصر سلطان میں قدم رکھا تھا تو منال اور اسری بھی مجھے دیکھ کر تمہاری طرح اچنبھو بن گئی تھیں۔"

"لیکن رومیل! یوں اچانک۔۔۔ کل میں تم نے بتایا ہوتا کہ تم آرہے ہو۔" اپنی حیرت چھپا کر سنبھلتے ہوئے اس نے کہا تو وہ گہری نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

"میں ضدی لڑکی کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ کہو کیسا لگا میرا سرپرائز۔۔۔؟"

"نائس!" اس کے استفسار پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

"تمہارے انکار نے اس قدر بے چین کیا مشارب سلطان کہ میں اپنی ہائر اسٹڈیز کی خواہش کو لات مار کر لندن کی فضاؤں کو خیرباد کہہ آیا۔"

"مگر لگتا ہے جیسے تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی۔" اپنی اچانک آمد کی وجہ بتانے کے بعد رومیل نے آخر چبھتے لہجے میں کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"ارے۔۔۔ رومیل! تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ تمہاری آمد پر مجھے خوشی نہیں ہوگی۔۔۔"

"اویار! یہ ہوئی نا دل خوش کرنے والی بات۔۔۔ ورنہ تو تمہارا یہ زرد زرد سا چہرہ دیکھ کر' میرا دل زخم زخم ہوا جا رہا تھا۔" کھلے کھلے لہجے میں کہتا وہ اچانک رک سا گیا تھا پھر جیسے کچھ یاد آنے پر سر پر ہاتھ مارتے ہوئے سرخ گلابوں کا بوکے اس کی جانب بڑھایا۔

"یہ لو مشارب سلطان اکس اوٹلی فار یو۔" تازہ گلابوں کے گلدستے پر نظریں جمائے مشارب نے اس وقت خود کو خاصا بے بس محسوس کیا تھا پھر بدقت ہاتھ

بڑھا کر رومیل سے وہ گلابوں کا گل دستہ لے لیا۔

"ڈیٹس لائیک اے گڈ گرل۔ اب چلو، تمہیں اک بڑھیا سا لنچ کراتا ہوں۔" پھول مشارب کے ہاتھ میں تھمانے کے بعد رومیل نے اسے لنچ کی آفر دی تو وہ متذبذب سی ہو گئی۔

"مگر رومیل! یہ میرے ڈیوٹی آورز ہیں۔ اور پہلے سے دارالشفا کے دو ڈاکٹرز لیو پر ہیں۔ سو ایسے میں، میں تمہارے ساتھ کیسے چل سکتی ہوں۔" اس کے انکار پر رومیل کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس کا ہاتھ تھام کر گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔

"رومیل ٹرائی ٹو انڈراسٹینڈ می۔ میرا اس وقت ڈیوٹی پہ ہونا بے حد ضروری ہے۔" وہ چلا کر رہ گئی۔

"اوں ہوں! اس وقت تمہارا صرف میرے ساتھ رہنا بے حد ضروری ہے۔" وہ اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولا تھا۔ پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیل دیا۔ مشارب ہاتھ مسل کر رہ گئی۔

اور یوں چند لمحوں بعد ہی دارالشفا کی حدوں سے نکل کر رومیل کی گاڑی سیاہ تارکول کی سڑک پر فل اسپیڈ سے بھاگنے لگی۔

"اب کہو ضدی لڑکی۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" گاڑی کے اندر چھائی خاموشی کو رومیل کی بھاری آواز نے توڑا تھا۔ اس کے سوال پر وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی تھی۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی وہ کس فیصلے کے بارے میں استفسار کر رہا تھا مگر قصداً خاموش رہی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔ مشارب! تم نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟" اسے خاموش دیکھ کر اس نے دوبارہ استفسار کیا تو وہ تپ کر بولی۔

"فیصلہ تو ہو چکا ہے رومیل۔ شاید تم جانتے نہیں ہو میرے بابا۔ بڑے بابا کو انکار کر چکے ہیں۔" مشارب کے الفاظ رومیل کے چہرے پر تھپڑ کی طرح پڑے تھے۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

"او مشارب سلطان سلی گرل۔ بہتر تھا تم اپنا فیصلہ بدل لیتیں۔ کچھ اور نہیں تو تمہیں کم از کم یہ یقین ہو جاتا کہ میں نے تمہیں خود سے محبت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مگر خیر اب مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم مجھے چاہتی ہو یا نہیں۔ تمہارا فیصلہ میں سن چکا ہوں۔ اور اپنا فیصلہ میں تمہیں سنا رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر رومیل نے ایک ساعت کے لیے مشارب کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جو زرد ہو رہا تھا۔ پھر اسی طرح اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے وہ مزید بولا تھا۔

"میں لندن سے پاکستان صرف اور صرف تمہارے حصول کے لیے آیا ہوں۔ اور یہاں سے میں تمہیں حاصل کرنے کے بعد ہی جاؤں گا۔" وہ رومیل کے ضدی لہجے پر خاموش نہ رہ سکی تھی۔

"رومیل! رومیل! اس وقت تم مجھے ایک نفسیاتی کیس لگ رہے ہو۔"

ہا۔ ہا۔ ہا۔" وہ اس کی بات پر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"لگ رہا ہوں کیا جان میں تو نفسیاتی کیس ہوں۔ اور ابھی تم نے میری نفسیات کے کرشمے دیکھے ہی کہاں ہیں۔" اس کے انداز میں کچھ تو ایسا تھا کہ مشارب لرز اٹھی تھی۔ بے ساختہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف دیکھا پھر ہراساں انداز میں رومیل ارسلان کی جانب دیکھنے لگی۔ جو کار ڈرائیو کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ پر مشارب کا دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزا تھا۔

"رومیل! ہم کہاں جا رہے ہیں۔" اپنے اندر اٹھنے والے اندیشے سے گھبرا کر وہ اس سے پوچھ گئی تھی۔ مشارب کے لہجے میں چھپے خوف کو محسوس کر کے رومیل کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"رومیل۔ جواب دو؟" اس کی خاموشی پر وہ چیخ ہی تو پڑی۔

"جانم! چلاؤ مت۔ جہاں بھی لے جا رہا ہوں۔ محبت کرنے کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔"

"شٹ اپ نان سینس..." وہ اس کی بے ہودہ گفتگو سن کر دبے انداز میں چیخی تھی۔

رومیل اس کے تپتے چہرے کو اپنی مسکراتی نظروں کے حصار میں لے کر ہنس کر بولا۔

"سوئیٹ ہارٹ۔۔۔ اس وقت اس ڈرے سہمے روپ میں بھی اتنی خوب صورت لگ رہی ہو۔ اگر گالیاں بھی دو گی تو مجھے ہرگز برا نہیں لگے گا۔"

"تم اس حد تک گر سکتے ہو۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کم از کم مجھے کڈنیپ کرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے یہی سوچ لیا ہوتا کہ میں تمہارے ہی خاندان کی عزت ہوں۔۔۔" وہ شاک کی کیفیت میں بولتی چلی گئی تھی مگر جب رکی تو رومیل نے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

"اس تھپڑ کو یاد رکھنا۔ اور آئندہ مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرنا۔۔۔ کیونکہ جب تک تم میری محبت تھیں۔ تب تک تو ٹھیک تھا۔ مگر اب اپنی اوقات میں رہا کرو۔ کیونکہ اب تم فقط رومیل ارسلان کی ضد ہو جسے حاصل کرنے کا عہد وہ خود سے کر چکا ہے۔ اور ہاں زیادہ خوش فہم نہ ہونا مشارب سلطان ایک بار تمہارا یہ غرور توڑ دوں پھر میں یہ تک بھول جاؤں گا کہ تم میری زندگی میں کہاں پر ہو۔" وہ نہایت ہی ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے اسے اپنی اوقات بتا گیا تھا۔

اور مشارب اپنے گال پر ہاتھ رکھے ساکت نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کا چہرہ تک رہی تھی جو اس رومیل ارسلان سے قطعاً "مختلف لگ رہا تھا جسے آج سے قبل وہ جانتی تھی۔

"رومیل پلیز، مجھے معاف کر دو۔" دس منٹ بعد اس کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی تھی وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے وہ اس شخص کی منتیں کرنے لگی۔ جو اس کے بے بس روپ سے حظ اٹھاتے ہوئے مسلسل قہقہے لگائے جا رہا تھا۔ بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے رومیل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے جنہیں ڈیش بورڈ پر رکھے ٹشو بکس میں سے ایک ٹشو نکال کر وہ پونچھنے لگا۔ پھر بولا تو اس کا لہجہ طنز کی گری لیے ہوئے تھا۔

"کیوں ستا رہی ہو یار۔۔۔ تمہارا یہ منت بھرا روپ مجھے ہرٹ کر رہا ہے۔۔۔ تم تو بس ضد کرتی اکڑ دکھاتی ہی اچھی لگتی ہو۔۔۔ سو پلیز یہ نازک سے ہاتھ جوڑ کر اپنے رومیل کو شرمندہ مت کرو۔"

"رومیل! تم پچھتاؤ گے۔۔۔ اور بہت پچھتاؤ گے۔"

رومیل کی اس درجہ کمینگی پر وہ بھڑک کر بولی تھی۔

ہونٹوں میں دبے سگریٹ کو آگ کا شعلہ دکھاتے ہوئے وہ اس کی بات پر زور سے ہنسا تھا۔

تمہیں چاہ کر پچھتا رہا ہوں۔

اس زخم کا کوئی مرہم نہیں ہے!

"مشارب صاحبہ آپ کو چاہ کر جتنا پچھتا چکا ہوں وہی عمر بھر کے لیے کافی ہے۔"

سگریٹ کا کش لیتے ہوئے وہ بولا تو مشارب کے آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے۔۔۔ مگر یہ اشک اس وقت خشک ہو گئے تھے جب رومیل کی گاڑی ایک بڑے سے بنگلے کے گیٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد رک گئی تھی۔

"چلو سوئٹی اب شرماؤ نہیں باہر نکلو۔" وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر اس کی طرف آیا تھا۔ پھر فرنٹ ڈور کھول کر اسے باہر کھینچا اور اسی طرح گھسیٹتے ہوئے وہ اسے ایک ہال نما کمرے میں لے آیا تھا۔ جہاں پر رومیل کے چار دوستوں کے ساتھ ساتھ قاضی صاحب بھی موجود تھے۔ اندر آنے کے بعد رومیل نے مشارب کو صوفہ پر دھکیل دیا اور پلٹ کر قاضی سے مخاطب ہوا۔

"بسم اللہ کیجئے قاضی صاحب۔۔۔" رومیل کے منہ سے الفاظ کیا ادا ہوئے۔ مشارب کو اپنے پاؤں تلے زمین کھسکتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ ٹکر ٹکر رومیل شاہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

جہاں فاتحانہ مسکراہٹ کا رقص جاری تھا۔

☆ ☆ ☆

گولڈن اینڈ میرون کلر کے کمبینشن والے

راجستھانی شرارہ سوٹ میں ڈھیر ساری بھاری جیولری اور فل میک اپ کے ساتھ دلہن بنی وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ منال اور اسریٰ تیار کرنے کے بعد ابھی کچھ دیر قبل ہی اسے اکیلا چھوڑ کر گئی تھیں۔

آج رومیل کے ساتھ اس کا دوبارہ نکاح ہونے جا رہا تھا۔ مشارب کی روح بین کر رہی تھی۔ اس کے دل میں نوحے چل رہے تھے۔ مگر قصر سلطان کے لان میں ڈھولک بج رہی تھی۔ تیز تیز تالیاں پیٹتے ہوئے اس کی ساری کزنز شوخ گیت گا رہی تھیں۔

سسکتے لبوں کے سنگ دونوں ہتھیلیاں پھیلا کر اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ وہ بے آواز انداز میں دعا مانگنے لگی۔

دعا مانگتے ہوئے اس نے رومیل شاہ کو بددعا نہیں دی تھی مگر اپنے لیے روشنی کا استعارہ ضرور مانگ لیا۔ اس ایک ذات سے جہان بھر کے سلطان سے مدد ضرور مانگ لی تھی۔ اس دن زبردستی نکاح پڑھوانے کے بعد رومیل اسے واپس قصر سلطان لے آیا تھا۔ وہ اپنے خیال میں مشارب کو قصر سلطان واپس لے آیا تھا مگر یہ رومیل کی بھول تھی۔ اس دن اس کے ساتھ مشارب کی لاش آئی تھی اور پھر اس کے بعد سب کچھ رومیل ارسلان کی مرضی کے مطابق طے پایا تھا۔ ارسلان صاحب نے اس کے بے حد اصرار کرنے پر سلطان شاہ سے دوبارہ مشارب کا رشتہ مانگا تھا اور ایک بار پھر رابعہ بیگم سلطان صاحب کے کہنے پر مشارب سے اس کی مرضی پوچھنے آئیں تو مشارب نے اس بار فرماں برداری سے اپنا سر جھکا دیا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ مشارب کے ہاں کی دیر تھی۔ قصر سلطان کے در و دیوار جیسے کھل اٹھے۔ رومیل ایک ماہ کے اندر شادی کر کے واپس لندن جانا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے سب کچھ بہت جلد طے پایا تھا۔ عجلت بھرے انداز میں شادی کی تمام تیاریاں مکمل کی گئی تھیں اور آج وہ دن آ گیا تھا۔

مگر آج جانے کیوں اسے وہ شخص بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا جس کی مسکراہٹ مشارب کو بے حد عزیز تھی اور جو بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے بہت دلکش نظر آتا تھا۔

اس رات ڈاکٹر اریب کی شادی اٹینڈ کرنے کے بعد رات چار بجے کی فلائٹ سے زرار کو ایک سیمینار کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑا تھا۔ اس لیے مشارب پر گزرنے والی اس قیامت سے وہ بے خبر تھے۔

مگر مایوں والی رات منال نے بتایا تھا کہ پورے ایک ماہ کے بعد وہ شخص قصر سلطان لوٹ آیا ہے۔

یہ خبر سن کر وہ منال کا چہرہ تکنے لگی۔ مشارب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی اور کی ہونے جا رہی تھی یہ اطلاع سننے کے بعد زرار کے تاثرات کیا تھے... وہ یہ جاننا چاہتی تھی۔ مگر اس شخص کے دل کی بات جاننا اتنا آسان کہاں تھا یہ ہی سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ کر رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"لیڈیز اینڈ جنٹل مین پلیز لسن ٹو می...!"

تمام رسومات اور فوٹو سیشن سے فارغ ہونے کے بعد جب دلہن کے سجے سجائے وجود کو لا کر رومیل کے پہلو میں بٹھایا گیا۔ تب بھاری آواز میں کی گئی دولہا کی اناؤنسمنٹ نے اس وقت وہاں پر موجود تمام افراد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ان سب کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ مشارب کے پہلو سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

رومیل کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ میں کچھ ایسا تھا کہ سب لوگ چونک کر رہ گئے۔

"اس سے پہلے کہ آپ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں، میں اس رات کو یادگار بنانے کی خاطر اپنی نئی نویلی دلہن کو آپ سب کی موجودگی میں رونمائی کا گفٹ پیش کرنا چاہوں گا۔" اس کی بات سن کر جہاں سب ہی کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی وہیں مشارب نے بھی شکر کا سانس لیا تھا پھر جھکی پلکیں ذرا سی اوپر کو اٹھائیں اور رومیل کی جانب دیکھنے لگی۔

جو آگے بڑھ کر سامنے ٹیبل پر رکھا وہ پیکٹ اٹھا رہا

تھا جو ابھی کچھ دیر قبل ہی اس نے اپنے بیڈ روم سے منگوایا تھا۔

"اس گفٹ کو اپنی کیوٹ سی دلہن کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے میں اسے آپ سب کے سامنے کھولنا چاہوں گا۔" یہ کہہ کر رومیل نے ہاتھ میں موجود پیکٹ پر لپٹا گفٹ پیپر پھاڑ ڈالا تھا۔

اس کے ساتھ ہی کاؤچ پر دلہن بنی بیٹھی مشارب سلطان کی آنکھیں بھی پھٹ گئی تھیں۔ وہ ساکت نظروں سے رومیل کے ہاتھ میں موجود اپنی گولڈن کور والی ڈائری کو دیکھ رہی تھی۔

جس میں اس نے اپنے دل کی وہ تمام باتیں لکھ ڈالی تھیں جو آج تک کبھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کی تھیں۔ اس نے تو اس حقیقت کو خود سے بھی چھپا کر رکھا تھا اور آج کیا ہو گیا تھا۔ رومیل کی آنکھوں سے نکلتے شعلوں کی تپش نے مشارب کا چہرہ زرد کر دیا تھا۔ آگے کیا ہونے والا تھا وہ اس کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

"ارے ہماری مسز کے چہرے کا رنگ تو رونمائی کا گفٹ دیکھتے ہی اڑ گیا۔ کہیں آپ اس ڈائری کو پہچان تو نہیں گئیں؟" اس کے چہرے کا رنگ اڑتا دیکھ کر وہ بڑے ہی استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا پھر سب کے سوالیہ چہروں پر اک سرسری نگاہ ڈال کر بولا۔

"خواتین و حضرات! آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہو گی کہ یہ ڈائری جو اس وقت میں مشارب کو گفٹ کر رہا ہوں' یہ انہیں کی ہے۔" رومیل نے ڈائری مشارب کی گود میں پھینکی تھی۔

"رومیل! یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اس کی اس حرکت پر ارسلان شاہ خاموش نہ رہ سکے تھے۔

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟" انہوں نے الجھے ہوئے انداز میں استفسار کیا تو وہ سرد لہجے میں یہ کہتا انہیں حیران کر گیا۔

"بابا! میں اپنا حساب برابر کر رہا ہوں۔۔ اور پلیز مجھے ڈسٹرب مت کیجئے۔" اس کے اس جملے نے ارسلان صاحب کے ساتھ ساتھ شعیب اور سلطان شاہ کے چہرے بھی سرخ کر ڈالے تھے۔

ضبط کی کوشش میں مٹھیاں بھینچتے شعیب سلطان تلملا کر رہ گیا تھا۔

تب شعیب سلطان کی نظر سیاہ جینز شرٹ میں سیاہ شال کاندھوں پر ڈالے سیڑھیوں کی ریلنگ تھامے کھڑے زرار پر پڑی تھی۔

وہ اس وقت رومیل کے تیز تیز بولنے کی آوازیں سن کر اپنے کمرے سے اٹھ کر نیچے آئے تھے۔ اور اب یہ تمام صورت حال دیکھ کر ششدر کھڑے تھے۔

"ارے اچھا ہوا مسٹر زرار ارسلان! آپ آ گئے' میں بھی بس آپ کو بلانے ہی والا تھا۔" زرار کو سیڑھیوں پر کھڑا دیکھ کر رومیل بڑے ڈرامائی انداز میں گویا ہوا تھا۔

اس کی بات پر سب کی طرح مشارب کی نظریں بھی زرار کی طرف اٹھی تھیں جو رومیل کی بات سن کر چونک گئے تھے۔

"کیا خیال ہے مسز! سب کو بتا دوں؟" زرار شاہ کی طرف سے توجہ ہٹا کر وہ مشارب کی سمت پلٹا۔

جس کی حالت کاٹو تو لہو نہیں جیسی تھی۔ وہ گھٹیا شخص آگے کیا کہنے والا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ مہندی سے سجے اپنے مخروطی انگلیوں والے ہاتھ مسلتے ہوئے وہ اس پل شدت سے اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگی۔

مگر نہ موت کو اس پر ترس آیا نہ ہی اس شخص کو وہ اس کے ہوائیاں اڑتے چہرے کو دیکھ کر اپنے دل میں عجیب سی تسکین اترتی محسوس کر رہا تھا۔ مگر جب بولا تو لہجہ کاٹ لیے ہوئے تھا۔

"ارے میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ تم سے پوچھ رہا ہوں۔۔ بھلا تم کیسے کہو گی کہ میں یہ سب کچھ ان لوگوں کو بتا دوں۔۔ تمہیں تو شرم آئے گی نا۔۔ آخر تم دلہن ہو۔۔۔ چلو میں خود ہی سب کو بتا دیتا ہوں۔ اوکے۔۔؟"

یہ کہہ کر وہ لمحے بھر کے لیے رکا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے وہ دھماکا کر دیا جس نے مشارب سلطان کے ساتھ زرار ارسلان کی ذات کے بھی پرخچے اڑا

لیے۔

"آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ ڈائری جو اس وقت ہماری مسز کی گود میں رکھی ہے۔ اس میں انہوں نے اداس آنکھوں والے جس شخص کی محبت کے راگ الاپے ہیں۔ وہ شخص میں یعنی رومیل ارسلان ہرگز نہیں۔"

"رومیل! گھٹیا انسان تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم مشارب جیسی معصوم لڑکی کے کردار پر کیچڑ اچھالو۔"

زرار بپھرے انداز میں سیڑھیوں سے اتر کر اس تک پہنچے تھے اور اپنے دونوں ہاتھوں میں رومیل کا گریبان تھام لیا۔

"کام ڈاؤن بگ برادر کام ڈاؤن۔" رومیل اپنا گریبان ان کے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے طنزیہ انداز میں ہنسا تھا۔ پھر زرار شاہ کے چہرے کو اپنی چبھتی نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔

"میں جانتا تھا' آپ اپنے تعارف کے لیے خود ہی آگے بڑھیں گے۔ مجھے آپ کا نام لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔۔۔ اشارہ ہی کافی ہے۔" وہ مکاری سے ہنسا۔

"آئی ہوپ آپ سب لوگ جان گئے ہوں گے کہ میں تھوڑی دیر پہلے جس اداس آنکھوں والے شخص کا ذکر کر رہا تھا' وہ کون ہے۔" نارمل انداز میں ادا کیے گئے رومیل کے وہ الفاظ کسی ایٹم بم کی طرح زرار ارسلان کی سماعتوں کے قریب پھٹے تھے۔

وہ اس انکشاف پر پھٹی پھٹی آنکھوں سے رخ موڑ کر مشارب کی طرف دیکھنے لگے۔ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ وہ بھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی نظریں ملنے پر مشارب کا دل چاہا تھا' زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اسے نظریں جھکاتے دیکھ کر زرار کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں' وہ بے یقین انداز میں سر ہلانے لگے۔

"کیا ہوا؟" شاکڈ ہو گئے یا خوشی کی وجہ سے قوت گویائی سلب ہو گئی مسٹر زرار صاحب۔۔۔؟" تلخی سے

رومیل کے لب مسکرائے تھے۔ تب ساکت کھڑے ارسلان شاہ نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

"اگر تم نے ایک لفظ بھی اور کہا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ ابھی اور اسی وقت قصر سلطان سے نکل جاؤ۔" ان کا لہجہ بے لچک تھا۔ وہ بغیر چونکے ہنس پڑا۔ پھر اسی طرح ہنستے ہوئے زہرخند لہجے میں بولا تھا۔

"چلا جاؤں گا۔۔۔ چلا جاؤں گا قصر سلطان سے تو کیا میں یہ شہر یہ ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔۔۔ مگر اپنا حساب چکتا کرنے کے بعد۔۔۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پلٹا تھا اور مشارب کے روبرو جا کھڑا ہوا۔

تب عروسی لباس میں کسی گڑیا کی طرح دمکتی مشارب سلطان کا دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ اس نے جھکی پلکیں اٹھا کر سہمے ہوئے انداز سے سامنے کھڑے شخص کی جانب دیکھا تھا۔ اور اس شخص کے بے تاثر چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

"مشارب سلطان! تم نے مجھے ریجیکٹ کر کے جو تھپڑ میرے منہ پر مارا تھا۔۔۔ آج اسے ان تین الفاظ کی صورت میں تمہیں لوٹا رہا ہوں۔۔۔ میں رومیل ارسلان بقائمی ہوش و حواس مشارب سلطان کو۔"

"رومیل۔۔۔ پلیز۔۔۔ پلیز یہ ظلم مت کرو۔ میری بہن مر جائے گی۔" باقی کے الفاظ ابھی رومیل کے منہ میں ہی تھے جب شعیب سلطان نے آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

قصر سلطان کے تمام افراد اس وقت ساکت کھڑے رومیل کو دیکھ رہے تھے۔ جو شعیب شاہ کی اس حرکت پر لمحہ بھر کے لیے تھم سا گیا تھا۔

مگر پھر دوسرے ہی پل وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ذرا سا پیچھے ہٹا۔۔۔ مسکرایا اور بڑی سفاکی کے ساتھ الفاظ مکمل کر گیا۔

"مشارب سلطان میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔۔۔ طلاق دیتا ہوں۔"

"رومیل خبردار! ایک اور لفظ آگے مت کہنا۔۔۔"

ورنہ میں تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کر دوں گا۔" ارسلان شاہ نے آخری حربے کے طور پر آگے بڑھ کر اسے دھمکی دی تھی۔

پر وہ ذرا بھی نہ گھبرایا تھا اور بڑی آسانی سے تیسری بار بھی وہ الفاظ ادا کر دیے تھے۔ جس نے مشارب سلطان کے نسوانی وقار کے پرخچے اڑا ڈالے تھے۔

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں... مشارب سلطان۔" وہ بے یقینی میں کھڑی رہ گئی تھی۔

وہاں موجود تمام نفوس کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ جبکہ اپنا حساب بے باق کرنے کے بعد رومیل ارسلان وہاں رکا نہیں تھا۔ پلٹ کر زرار شاہ کی ساکت نگاہوں میں جھانکتے ہوئے زہریلے انداز میں مسکرایا اور قصر سلطان کی حدوں سے نکلتا چلا گیا۔

اس کے وہاں سے جانے کے بعد چند ثانیے وہ بت بنی کھڑی رہی تھی پھر جب دوبارہ اس کے وجود نے حرکت کی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ چکرا کر گرتی قریب کھڑے شعیب سلطان نے آنسو برساتی آنکھوں سمیت آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ کتنے ہی ان گنت موتی رافعہ بیگم کی آنکھوں سے ٹوٹ گرے تھے۔ جبکہ سلطان صاحب دل پر ہاتھ رکھے دیوار سے جا لگے تھے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

☆ ☆ ☆

کہتے ہیں وقت ہر زخم کا علاج ہوا کرتا ہے۔ مگر یہ وقت مشارب سلطان کے زخموں کا علاج نہ بن سکا تھا۔ اس حادثے کو گزرے آٹھ ماہ سے زائد عرصہ ہونے کو آیا تھا۔ مگر اب تک مشارب کے وہ زخم مندمل نہ ہو پائے تھے، جو رومیل ارسلان اس کی روح پر سجا چکا تھا۔ اس رات اس کی زندگی میں تاریکیوں کی سیاہی گھول کر وہ خود ہمیشہ کے لیے لندن روانہ ہو گیا تھا۔

مشارب ماتھے پر طلاق کا کلنک سجائے قصر سلطان میں تنہا رہ گئی تھی۔ اس رات کی بد صورتی نے اس سے اس کا ہنسنا بولنا سب چھین لیا تھا وہ اپنے کمرے کی چار دیواری میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے وار شفا جانا تک چھوڑ رکھا تھا۔

بابا، بڑے بابا، مما شعیب لالہ، منال اور اسری سب ہی اس کا خیال رکھ رہے تھے، مگر ان سب کی محبتوں کے باوجود وہ خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ رومیل نے جس طرح اس کا تماشا بنایا تھا وہ دکھ اس کے اندر کو مار رہا تھا۔ مشارب حیران ہو کر سوچتی کیا محبت کرنے کی اتنی بڑی سزا ملا کرتی ہے؟ جتنی بڑی سزا رومیل شاہ نے اسے دی تھی۔

مشارب سلطان نے تو زرار ارسلان سے بہت پاکیزہ محبت کی تھی۔ جس کی خوشبو کو اس نے ہمیشہ اپنے سینے میں چھپائے رکھا تھا۔ مگر ہوا کیا۔ اس کی محبت کی نیلامی سر بازار ہو گئی تھی۔ مشارب کو اچھی طرح یاد تھا۔

رومیل کے انکشاف پر زرار شاہ نے کیسی نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا مشارب سلطان اس پل کٹ کر رہ گئی تھی۔ کتنی حیرت اور کیسا شاک بھرا تاثر تھا اس وقت اس شخص کی نگاہوں میں جیسے اسے اس بات پر یقین ہی نہ آیا ہو۔ اس دن کے بعد وہ زرار کے سامنے نہیں آئی تھی شاید اس میں اس شخص کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ مگر اس وقت وہ تڑپ کر رہ گئی جب اس واقعے کے صرف پانچ ماہ بعد مما نے اسے زرار ارسلان کے پرپوزل کے بارے میں بتایا تھا۔ تب اس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر انکار کر ڈالا تھا۔

"وہ شخص شاید ترس کھا کر مجھے اپنانا چاہتا ہے... پر مما! آپ اس کو بتا دیجئے گا کہ مشارب سلطان کو زرار ارسلان کی یہ بھیک نہیں چاہیے" مما اس کا جواب سن کر رو پڑیں۔

"نہیں میری جان تم غلط سمجھ رہی ہو... وہ تو اپنی خوشی سے تمہارا ہاتھ مانگ رہا ہے... اس نے خود ہی ارسلان بھائی سے کہا تھا ہم سے تمہارا رشتہ مانگنے کے لیے۔"

"مما! میں دوبارہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتی...

"آپ پلیز' بڑے بابا کو انکار کر دیجیے گا۔" رافعہ شاہ کو اپنا آخری فیصلہ سناتے ہوئے کوئی لچک کوئی گنجائش اس کے لہجے میں موجود نہیں تھی۔ رافعہ شاہ تب ناکام لوٹ گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد مشارب ایک طویل سانس کھینچتے ہوئے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی' مگر شاید اطمینان و سکون نام کی کوئی چیز اس کے مقدر میں نہیں تھی۔

تب ہی تو اچانک وہ کچھ ہو گیا تھا جس نے اس کے سکون کو ایک بار پھر منتشر کر ڈالا تھا۔ "مشارب نے زرار کے پرپوزل سے انکار کر دیا ہے" یہ خبر سننے کے بعد سلطان شاہ کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ زرار انہیں اندھیرے میں روشنی کی کرن محسوس ہوا تھا۔ اور ایسے میں مشارب کا انکار سن کر وہ بری طرح سے ٹوٹ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

بابا کے ہارٹ اٹیک کی خبر مشارب پر بجلی بن کر ٹوٹی تھی۔ اس وقت بابا آئی سی یو میں تھے اور وہ شعیب لالہ کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ دارالشفا کے در و دیوار اس کی سسکیوں سے گونج اٹھے تھے اور پھر دوسری صبح ہی بابا کے ہوش میں آنے کے بعد ان کی خواہش پر دارالشفا کے لان میں سادگی کے ساتھ اس نے اپنے تمام حقوق زرار شاہ کے نام کر دیے تھے۔ نکاح نامے پر سائن کرنے کے بعد وہ روتی سسکتی قصر سلطان واپس آئی تھی۔

شعیب لالہ اسے قصر سلطان چھوڑنے کے بعد خود واپس دارالشفا لوٹ گئے تھے۔

مسلسل ذہنی تناؤ کے باعث وہ خود کو بہت تھکا سا محسوس کر رہی تھی۔ ذہنی انتشار کو کم کرنے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔ گھنٹہ بھر ٹھنڈے پانی سے شاور لینے کے بعد بیڈ روم میں واپس آ کر گیلے بال سلجھائے پھر دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر اپنا سیل اٹھایا اور ٹیرس پر آ گئی۔

چودھویں کا چاند پورے آب و تاب کے ساتھ افق پر جگمگا رہا تھا۔ ٹیرس کی ریلنگ تھام کر وہ نیچے جھانکنے لگی۔

پورے لان کو چاندنی کی دل آویز روشنی نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ مشارب نے سیل فون میں وقت دیکھا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ قصر سلطان کے مکین اس وقت نیند کی آغوش میں محو خواب تھے۔

کچھ سوچ کر اس نے شعیب لالہ کا نمبر ڈائل کیا پھر ان سے بات کر کے بابا کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے کے بعد مطمئن سی ہو کر وہ نظر اٹھا کر چاند کو تکنے لگی۔ جو اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا' جواباً" ایک اداس مسکراہٹ چمکتے چاند کی جانب اچھال کر وہ زرار شاہ کے بارے میں سوچنے لگی۔

اپنے اور ان کے مابین نکاح کے بندھن کا خیال آتے ہی مشارب کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بمشکل بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتی وہ چاند سے نظر ہٹا کر پورچ پر نظریں دوڑانے لگی۔

دفعتاً" بڑے بابا کی گاڑی کے پیچھے کھڑی زرار ارسلان کی بلیک پراڈو پر نگاہ پڑتے ہی وہ حیران رہ گئی تھی۔

"ارے۔ یہ کب آئے دارالشفا سے؟" کچھ حیران سا ہو کر اس نے خود سے استفسار کیا تھا۔

ٹھیک اس وقت اس کے موبائل پر میسج ٹون ہوئی تھی۔ میسج ریسیو کرنے کے بعد وہ پڑھنے لگی۔

"آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک ہو مسز مشارب زرار! مٹھائی کب کھلا رہی ہیں۔۔۔ زرار شاہ۔"

"ہونہہ! بڑے آئے مبارک باد دینے والے۔" میسج پڑھ کر وہ بری طرح سے تپ گئی "جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں؟" دھیرے سے بڑبڑاتی مشارب اس وقت چونک گئی تھی جب Hogo boss کی دلفریب مہک نے اس کے حواسوں کو جکڑنا شروع کیا تھا۔

ہوا سے منتشر ہوتے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کی طرف دھکیلتی وہ سرعت سے پلٹی تھی اور اس کوشش

میں اس کے خوب صورت لمبے اسٹیپ کٹ بال جھٹکا کھا کر نازک سی پشت پر بکھر کررہ گئے تھے۔

"بیوٹی فل..." ستائش کی زیادتی سے زرار ارسلان کے لب ہلے تھے۔ سفید رنگ کے کڑکڑاتے شلوار قمیص میں وہ دونوں بازو اپنے سینے پہ باندھے اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

ایک پل کو مشارب کی دھڑکنیں اس شخص کو اپنے روبرو پا کر تھم سی گئی تھیں۔ لرزتی پلکیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

نظروں کے تصادم پر وہ مشارب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دلکشی سے گویا ہوا۔

آنگن میں آؤں گا میں چاندنی لیے...
اس انتظار میں رات بھر جاگا تو مت کرو
کہتے ہیں لوگ مجھ سے 'تم ہو بجھی بجھی...
یہ کیا غضب ہے عشق کو رسوا تو مت کرو...

زرار ارسلان کی دلکش و بھاری آواز نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ شعر مکمل کر کے خاموش ہوئے مشارب نے وہاں سے جانے کا قصد کیا اور قدم آگے کی جانب بڑھا دیے۔

"جسٹ آمنٹ!" وہ ان کے پاس سے گزر کر جانے لگی تھی جب زرار نے اس کی کلائی تھام لی۔

"پلیز... مجھے جانے دیں۔" ان کی جرأت پر وہ دبے دبے انداز میں چیخی تھی۔

"اس طرح نہیں پہلے مجھے مبارک باد دیں... آخر آپ کی طرح میرا بھی آج نکاح ہوا ہے..." وہ شوخ انداز میں فرمائش کر رہے تھے۔ مشارب ان کے شوخ انداز پر لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گئی تھی۔ مگر پھر اگلے ہی پل غصے میں آ کر زرار کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے لگی۔

"چھوڑ دیں میرا ہاتھ ورنہ..." اپنی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ بھڑک کر بولی تو وہ ہنس پڑے۔

"ورنہ کیا؟ اگر میں نے ہاتھ نہیں چھوڑا تو کیا شور مچا دو گی...؟" اس کے تپے تپے چہرے کو اپنی محظوظ نگاہوں کے حصار میں لیے وہ اس کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے بولے۔

وہ سر جھکا کر اپنے لب کاٹنے لگی اور اس ادا پر زرار کو اتنا پیار آیا کہ دھیرے سے مسکراتے انہوں نے مشارب کا ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

تب گھنیری پلکیں جھپک کر وہ استعجابیہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس معصوم سی لڑکی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر زرار کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

ان کو مسکراتا دیکھ کر مشارب کی آنکھیں خواہ مخواہ بھیگ گئیں۔

"آپ بہت خراب ہیں!" وہ نروٹھے پن سے بولی تھی۔

"آئی نو!" زرار نے جھٹ سے اعتراف کر لیا۔

وہ ان کے یوں فوراً "مان جانے پر مطمئن نہ ہوئی تھی تب ہی اپنے دل کی مزید بھڑاس نکالنے کی خاطر ایک دم بھڑک کر بولی۔

"خراب ہیں تو پھر یہاں کیوں آگئے میرے پاس... جائیں جا کر اپنے کمرے میں حرا آپی کو یاد کریں۔"

"لو مائی گڈنیس..." مشارب کی بات پر زرار کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ انہیں اس کی خفگی کی وجہ اب سمجھ میں آئی تھی۔

"اوہ تو ڈاکٹر مشارب جیلس... بھی ہوتی ہیں؟" اس کو چھیڑنے کی خاطر زرار نے لفظ جیلس کو خاصا کھینچا تھا۔ جس پر وہ حسب توقع تپ گئی تھی اور جب بولی تو لہجہ غصے کی وجہ سے لرز رہا تھا۔

"فار یور کائنڈ انفارمیشن مسٹر زرار ارسلان... میں معمولی لوگوں سے ہر گز جیلس نہیں ہوا کرتی۔" بڑی صاف گوئی سے کہتی وہ انہیں حیران کر گئی تھی۔

اور اس وقت زرار کا دل بے اختیار ہی نکاح کی طاقت پر ایمان لے آیا تھا۔ جس نے محض چند گھنٹوں میں ان کے سامنے ہمیشہ "سر سر" کی رٹ لگائے رکھنے والی نروس سی لڑکی کو ایک دم سے شیرنی بنا ڈالا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا مشارب کا یہ نیا روپ زرار شاہ کو اس وقت بہت اچھا لگ رہا تھا۔

غصہ کرتے ہوئے تمہارا یہ روپ زیادہ اپیل کرتا ہے۔" ان کے گمبھیر لہجے پر وہ سر جھکا گئی تھی۔
اور اس کے بعد بڑی ہی معنی خیز خاموشی ان دونوں کے درمیان چھا گئی۔ رات کی رانی اور Hugo کی ملی جلی مہک کو اپنی سانسوں میں اتارتے ہوئے وہ یک ٹک کھڑے اسے دیکھے جا رہے تھے۔
وہ جو فرش پر گھنیری پلکیں جھکائے جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی ناک میں پڑی ننھی سی لونگ رات کی چاندنی میں کچھ زیادہ ہی نکھر کر چمک رہی تھی۔ اور مشارب کی ناک میں بھی وہ لونگ ہی تو تھی جو زرار کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔
"میں کتاب زیست تمہارے سامنے کھول تو دوں مگر اسے کہاں سے پڑھنا شروع کروں...؟" درمیاں میں چھائی خاموشی کو زرار کی بھاری آواز نے توڑا تھا۔
وہ سر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی جہاں اداسی ڈیرا ڈال چکی تھی۔ اسے اپنی جانب تکتا پا کر وہ لحہ بھر کو رک کر مسکرائے تھے پھر مزید گویا ہوئے۔
"وہاں سے جہاں حرا نے مجھے ٹھکرا دیا تھا... اور میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا...؟ یا پھر وہاں سے شروع کروں... جہاں حراشاہ کے انکار کا دکھ اپنے سینے سے لگائے میں لندن چلا گیا تھا... یا پھر وہاں سے؟ جس رات میں نے تمہیں تھپڑ مارا تھا اور تمام رات تمہارے آنسوؤں نے مجھے سونے نہیں دیا تھا۔ یا پھر وہاں سے جب... ڈاکٹر اریب کی شادی پر جانے سے قبل تم بلیک ساڑھی میں ملبوس، آنکھوں میں بلیو لینسز لگائے میرے سامنے آئی تھیں؟
اس رات مشارب... میں تمام رات مضطرب رہا تھا... مجھے کیا چیز ڈسٹرب کر رہی تھی میں جان نہیں پایا تھا بہر حال میں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ وہ رات میری زندگی میں آنے والی پہلی رات تھی جب میں حراشاہ کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کو سوچ رہا تھا۔"

ان انکشافات پر مشارب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

یہ شخص بھی اسیر محبت تھا وہ اس سفر میں تنہا نہیں تھی۔ اس پر شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ جبکہ وہ اس کی حالت سے بے نیاز کہے جا رہے تھے۔

"اس رات مشارب۔۔۔ اس رات میں نے آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔۔۔ پر جانے کیوں اس پل میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ رومیل ارسلان کو ریجیکٹ کرنے والی ضدی لڑکی کے میرے بارے میں کیا خیالات ہوں گے۔

اسی رات چار بجے کی فلائٹ سے مجھے ایک سیمینار کے سلسلے میں ملک سے باہر جانا پڑا تھا۔۔۔ اور وہیں شعیب نے فون کر کے تمہاری اور رومیل کی شادی کی اطلاع دی تھی۔ اور اس دن میرا زبردست قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے بچا۔۔۔ یہ ہی وجہ تھی کہ مجھے دیار غیر میں ایک ماہ لگ گیا تھا۔"

ان کی طبیعت کی ناسازی کا سن کر وہ متحیر رہ گئی تھی اور جانے اسے کیا ہوا کہ ایکدم سے رو پڑی۔

"ارے" اسے یوں زار و قطار روتے دیکھ کر وہ بوکھلا کر خاموش ہو گئے تھے۔

"آپ نے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا ہم میں سے کسی کو۔ دیار غیر میں تنہا اتنی اذیت سہتے رہے۔" اس نے روتے ہوئے شکوہ کیا تو وہ اس کے انداز پر ہنس پڑے۔ انہیں ہنستے دیکھ وہ غصے سے گھورنے لگی۔

"آپ کتنے خراب بچے ہیں، مجھے روتا دیکھ کر ہنس رہے ہیں؟" اس کی بات سن کر زرار کی ہنسی کو بریک لگے تھے۔ وہ فوراً "اپنے کان پکڑ کر بولے۔

"سوری مسز! غلطی ہو گئی آج کے بعد آپ جناب کو روتے دیکھ کر میں بھی رونے لگوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

وہ ان کے مسز کہنے پر پہلے ہی سرخ پڑ چکی تھی۔ اس لیے ان کی تائید لینے پر جھٹ سے سر ہلا دیا تھا۔

اس کے جھینپے ہوئے انداز پر وہ مزہ لے کر مسکرائے پھر اپنی کڑکڑاتی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر انہوں نے وہ سونے کا بریسلٹ نکال لیا تھا جو آج شام کو ہی خریدا تھا۔

چھوٹے سے گلابی کیس کو کھول کر انہوں نے ڈائمنڈز سے مزین جگمگاتا بریسلٹ نکالتے ہوئے اجازت طلب نظروں سے مشارب کی جانب دیکھا تھا۔ وہ بھی اس وقت ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نگاہوں کے تصادم پر ایک بہت ہی دلکش مسکراہٹ نے زرار ارسلان کے لبوں کو چھو لیا اور پھر بڑے ہی احتیاط کے ساتھ انہوں نے ہاتھ میں تھاما بریسلٹ مشارب سلطان کی سنہری و نازک کلائی میں پہنا دیا تھا۔

"اسے فی الحال میری طرف سے رونمائی کا تحفہ سمجھیں۔" بریسلٹ پہنانے کے بعد زرار نے دھیمے سے سرگوشی کی تو مشارب ان کی بات پر چھوئی موئی سے انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔

تب اس کی پلکوں پہ نمی دیکھ کر زرار کو یاد آیا تھا کہ آج سے پہلے ایک ایسی ہی چاندنی رات میں ان کے دل نے اس لڑکی کے سارے آنسو سمیٹ لینے کی خواہش کی تھی۔ مگر تب وہ اس خواہش کو اپنے دل میں دبا گئے تھے کیونکہ اس وقت زرار ارسلان ایسا کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔

لیکن آج وہ یہ خواہش دل میں دبا نہیں پائے تھے اور بڑے ہی استحقاق کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر انہوں نے مشارب سلطان کی پلکوں پہ چمکتے تمام آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں میں سمیٹ لیے تھے۔ کیونکہ یہ وہ لڑکی تھی جو زرار ارسلان کے دل کے ٹوٹے شیشے جوڑنے کی خاطر اپنے ہاتھ زخمی کر بیٹھی تھی۔

مشارب اس پل کھل کر ہنس پڑی تھی اور وہ کیوں نہ ہنستی اس کا چاند اس کی چوکھٹ پر جو کھڑا تھا۔

نوشین ناز اختر

دُھواں

"مانو یار! باربی کیو کا موڈ ہو رہا ہے۔"

"تم اپنی مصروفیت بتاؤ۔ اسی ویک اینڈ پر کریں؟"

باجی کا فون آیا تھا اور باجی کا فنکشن ہو یا پارٹی میرے بغیر کیسے ہو سکتی تھی؟

"باجی! آپ نیکسٹ ویک پر رکھ لیں۔ اس ویک اینڈ پر تو میری فرینڈ طوبیٰ کی طرف باربی کیو ہے۔"

جیسے ہی بقر عید گزری' بس ہر طرف سے باربی کیو کی دعوت تھی۔ پھر پارٹی کا تھیم بھی ضرور رکھتے تھے ہم لوگ۔ زیادہ تر جینز اور ٹاپ پہنتے تھے ہم لوگ۔ اس بار تو سردی بھی تھی تو لونگ کوٹ اور جینز کا ڈریس کوڈ طے ہوا تھا۔ ہم نے اس رات ٹھیک ٹھاک مزا کیا۔ لڑکوں نے کباب سیخ پر لگائے تھے۔ چند فین کے ذریعے آگ سلگائی جا رہی تھی۔ کئی بار آگ سلگانے میں آنکھوں سے پانی نکل پڑا' لیکن ہم ایڈونچر کے شوق میں لگے ہی رہے۔ بہت بھوک بھی لگی تھی' لیکن ہم نے صبر کیا۔ بالآخر جب باربی کیو تیار ہو گیا تو سب نے خوب مزے سے ڈنر کیا۔

عاطف ہمارے گروپ فرینڈ نے گٹار پر "منوا رے" کے گیت پر مزے کی دھن بجائی۔ لڑکوں نے باقاعدہ اٹھ کر ڈانس کیا۔ ہم لڑکیوں نے خوب ہوٹنگ کی۔ ایک یادگار باربی کیو پارٹی کا اختتام ہوا۔ جاتے ہی سب نے اپنی اپنی تصاویر فیس بک پر اپ لوڈ کیں۔ راتوں رات ایک دوسرے کی تصاویر شیئر ہوئیں اور لائیک کی گئیں۔

☼ ☼ ☼

جنوری 2011ء

"کمال ہے باجی! پکنک پر تو ایسے ہی ہوتا ہے' کھانا کھانے میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ ہم سب پکنک پر گئے ہوئے تھے۔ پروگرام تھا کہ سارا کھانا لکڑیوں پر پکایا جائے۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ موسم بھی گرم تھا۔ اچھی خاصی کھانسی اور گرمی لگی' لیکن ہم سارے میرڈ' ان میرڈ' بہن' بھائی پکنک پر تھے اور مزا کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

مئی 2011ء

دریائے کنہار کے کنارے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈالے فریز ہونا بہت اچھا لگا۔ ہم نے وہاں فشنگ بھی کی تھی۔ وہیں لکڑیاں جمع کر کے ہم نے مچھلی کو مسالا لگا کر گرلڈ کیا۔ کچی پکی فش کھا کر بھی ہم سب خوش تھے۔ حالانکہ اس میں کچھ بو بھی تھی' لیکن اس کی بھی کس کو پروا تھی۔ ہم سیر کے لیے ناردرن ایریاز آئے تھے۔ نیچر کے قریب رہ کر کھانا کھانے کا مزا ہی اور تھا۔

☼ ☼ ☼

دسمبر 2011ء

ہماری یونیورسٹی کا ٹرپ تھا۔ تھر کے علاقوں میں جا کر ہم نے وہاں کے مسائل پر ایک ڈاکومنٹری بھی بنائی تھی۔ اپنی اسائنمنٹ کی ذمہ داری الگ' لیکن وہ جو ہم سب میں ایک "پارٹی آل ٹائم" کا نشہ تھا۔ وہ ہر بار سامنے آ کر ہم سے ویسے ہی کام کرواتا تھا۔ ڈاکومنٹری بھی بنتی رہی۔ ہم نے تھر کی ریتیلی نائٹ میں بون فائر کیا۔ وہاں بھی کچے پکے کھانے کھائے' لیکن "فن ٹائم" تھا۔ کوئی پروا نہیں تھی۔ بہت مزا آیا۔ بہت ایڈونچر کیا لکڑیوں پر پکے کھانے کھا کر۔

☼ ☼ ☼

بر 2014ء

میری شادی کو تقریباً" تین سال ہو چکے ہیں۔ یونی ورسٹی اور کنوارے پن کی لائف ایک یاد بن کر رہ گئی ہے۔ میری شادی باجی کے دیور سے ہوئی ہے۔ یہ ہماری لو پلس ارینج میرج ہے۔ حامد مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ میرا پیارا سا ڈیڑھ سال کا بیٹا ہے۔ زندگی میں بس پیار ہے' کوئی مسئلہ نہیں ہے' لیکن۔ ہمارے گھر کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ آج کل بہت اذیت پکڑ چکا ہے۔

جیسے ہی سردی کا آغاز ہوا۔ گھر کے چولہوں سے گیس غائب ہو گئی تھی۔

"بھابھی جائے۔" حامد کھانے کی میز پر بیٹھے چلا رہے تھے۔

"کہاں سے دوں؟ گیس ہی نہیں ہے۔" باجی بولی تھیں۔

شاہان کے لیے دودھ گرم کرنا تھا۔ گیس غائب۔

"کیا مصیبت ہے۔" میں روہانسی ہو گئی تھی۔

"اف اللہ اتنی سردی ہے۔ گیزر نہیں چل رہا۔ مجھے نہا کر جانا ہے۔ میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔" باجی کے میاں بے زاری سے بولے تھے۔

☼ ☼ ☼

کتنے ہی دن میری نند جو ہالینڈ سے آئی تھیں۔ سب کو غصہ کرتے' حکومت کو گالیاں دیتے دیکھتی اور سنتی رہی تھیں۔ وہ ہماری باتیں ماتھے پر بل ڈال کر سنتی تھیں۔

"پاکستان میں رہنا کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔ نہ بجلی ہے اور نہ ہی پانی اور اب گیس کا مسئلہ۔" باجی غصے سے بڑبڑا رہی تھیں۔

دونوں وقت کھانا باہر سے آ رہا تھا۔

کبھی کڑاہی آرڈر ہو رہی تھیں۔ کبھی رات میں پزا برگر آرڈر ہو رہے تھے۔ ملازموں کو بھی یہ ہی کچھ کھانے کو ملتا تھا۔

میری ساس نان برے برے منہ بنا کر کھاتیں۔ ان کو ہاضمے کا مسئلہ ہوتا تھا۔ گھر کی پکی چپاتی کی کمی

شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اول تو گیس آتی نہیں' اگر آجاتی تو شعلہ اس قدر کم ہوتا تھا کہ روٹی توے پر اکڑ جاتی تھی۔ ہم سب بہت تنگ تھے۔ حکومت اور ملک کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میرا بس چلے تو ان سب حکمرانوں کو لائن میں کھڑا کر کے شوٹ کروں۔" حامد کو ایک بار پھر کالی نہ ملنے کا دکھ غصے میں نکلا تھا۔

میری بڑی نند جو پاس بیٹھی تھیں۔ ایک دم میری جانب متوجہ ہوئی تھیں۔ غصے میں حامد تھے۔ الٹا سیدھا وہ بول رہے تھے اور جواب باجی نے مجھے دیکھ کر دیا تھا۔

"تم دونوں بے حد ناشکرے لوگ ہو۔ اللہ کو ناراض کرو گے۔" وہ بولی تھیں۔

"کیا ناشکری کی ہے ہم نے؟" حامد بھی ان کے ہی بھائی تھے نا۔

"تم لوگوں نے ایک دن بھی ایسا گزارا جس دن ملک اور ملکی حالات کو برا بھلا نہ کہا ہو۔ یہ تمہارا ملک ہے' یہ تمہاری مٹی ہے' اس کو برا بھلا کیسے کہتے ہو تم۔" باجی نے بے حد بےزاری سے کہا تھا۔

"باجی! میں اس ملک کے سسٹم کو برا کہہ رہا ہوں۔" حامد نے اپنی صفائی پیش کی تھی۔

"سسٹم؟" باجی بڑبڑائی تھیں۔

"سسٹم کیا؟ کیا تم اس سسٹم کا حصہ نہیں ہو؟ پاکستان برا ہے تو ہم ہی برے ہوئے نا؟" باجی نے تحمل سے کہا۔

"چلو ایک اور قائداعظم آگئے۔" حامد نے ان کا مذاق اڑایا تھا۔

"حامد۔ قائداعظم کا مقام کیا تھا اور کیا ہے تم کبھی محسوس نہ کر سکو گے' کیونکہ ہمیں بتانے اور سکھانے والوں نے ہمیں قربانی کی کہانی سنانے کے بجائے بس "لینے کی کہانی" سنائی اور بتائی ہے۔" باجی بے حد افسردہ تھیں۔

حامد کچھ شرمندہ سے ہو گئے تھے اور یہ شرمندگی پاکستان اور اس کے سسٹم کو برا کہنے پر نہ تھی' بلکہ ان کی پروسن باجی افسردہ ہو گئی تھیں۔ اس بات پر۔

میں نے گہری سانس بھر کر دونوں بہن بھائی کو دیکھا تھا۔ ماحول میں ناراضی تھی۔

آج پھر دھوپ نہ نکلی تھی۔ میں بمشکل اپنے بیٹے کو سلا کر باہر آئی۔ اخبار پکڑے پکڑے میں ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھی تھی۔ آج پھر باہر سے ناشتا آیا تھا۔ یونہی حلوہ پوری پاٹ پاٹ میں نظر آرہی تھی۔ یعنی گیس آج بھی نہ تھی۔

"ہم چاند پر رہتے ہیں۔ بجلی' پانی' گیس سب غائب۔" میرے دماغ میں حامد کا جملہ گھوما تھا۔

"یا چاند پر روز حلوہ پوری کا ناشتا کل جاتا ہے؟"

اپنے دوسرے خیال پر خود ہی میرے چہرے پر مسکراہٹ در آئی تھی۔

اخبار کے پہلے صفحہ پر نظر ڈالتے ہی میری نظر جس خبر پر پڑی' میری ساری بھوک بھاپ بن کر اڑ گئی تھی۔ تھر میں آج پھر آٹھ بچے بھوک سے مر گئے تھے۔

"بھوک" وہ احساس ہے جو ہر انسان کو جانور بنا دیتا ہے۔ اس نے اس بھوک کو بھوکا نہ رکھو ورنہ کرائم کے جرائم اس معاشرے میں اور بڑھ جائیں گے۔'

مجھے برسوں پہلے اپنے استاد کی بات یاد آئی' جب ہم ڈاکومنٹری کے لیے تھر کے علاقوں میں وزٹ پر تھے۔

یا اللہ معاف کر دے۔ اپنے ہی ملک میں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔

میں نے گہری سانس بھری تھی۔ ایک نظر ٹیبل ڈالی تھی۔ بریڈ' مکھن' جیم' شہد' سیب' مالٹے' جوس کھلا ڈبا' پھر پاٹ پاٹ میں حلوہ پوری رکھی ہوئی تھی۔

اور میں جانتی تھی سب ناشتا کر کے نکلے تھے۔ انہوں نے اپنی "مرضی" کا کھا کر لیکن "شکر الحمدللہ" کہہ کر اللہ کے بجائے سب "گیس کی عدم فراہمی" اور ملک کو برا بھلا کہہ کر نکلے ہوں گے۔ گیس نہ ہونا ایشو تھا یا..

خوراک کی قلت بڑا ایشو تھا؟ بھرے پیٹ جینا اور خالی پیٹ جینا۔ گھر کے پکے کھانے سے خالی پیٹ بھرنا بڑا مسئلہ یا پھر خالی پیٹ مرنا بڑا پرابلم تھا؟

"پرابلم کہاں ہے؟" جیسے ہی یہ سوچ آئی' میرا دل ڈر گیا۔

آج پہلی بار میرا ناشکرا دل' اپنی ناشکری پر ڈرا تھا۔

☼ ☼ ☼

اتنے دن سے سورج نہ نکلا تھا' تا میں کپڑے دھوتی' ڈرائر میں سکھا کر پھر اوپر والے پورشن میں صوفوں پر کرسیوں پر جگہ جگہ ڈال کر سکھاتی۔ جرابیں سکھانا اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔ جرابوں کی روز ضرورت ہوتی تھی اور جرابیں دنوں نہ سوکھتی تھیں۔ بہت مسئلہ ہوتا تھا۔ کپڑے یہاں وہاں رلتے سوکھتے تھے۔

میں اپنے بیٹے کی جرابیں لینے اوپر آئی تھی۔ ایک ایک کپڑا ماسی الٹ پلٹ کر رکھ رہی تھی۔ اس کی بیٹی نم' نمی والے کپڑے کھڑی استری کر رہی تھی۔

"کیسی ہو رشیدہ بی بی!" میں نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔

"اللہ دا بڑا شکر اے باجی جی!" رشیدہ بی بی نے بڑے دل سے کہا تھا۔

اس کا اتنے دل سے شکر ادا کرنا مجھے متوجہ کر گیا تھا۔ شاید میری شرمندگی ابھی تازہ تازہ تھی اپنی ناشکری پر۔

"رشیدہ تمہارے گھر گیس آتی ہے؟" یہ بھی میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"باجی اسی تھے بل دین جوگے' آپ کے گھر کے لان سے سوکھی لکڑیاں لے کر جاتی ہوں درختوں کی وہ ہی جلاتے ہیں۔"

مجھے یاد آیا۔ واقعی رشیدہ تو بہت باقاعدگی سے لکڑیاں چن کر یا کاٹ کر لے جاتی تھی۔ "تو تم کیسے لکڑیوں پر کھانا پکا لیتی ہو روز؟" میں نے بہت حیرت سے کہا۔

جواباً" رشیدہ ہنس کر بولی۔ "جیسے تسی باربی کیو کر لہندے ہو۔

چولھا بھر پانی ہوتا تو میں ڈوب جاتی۔ رشیدہ جیسی ان پڑھ نے مجھے ایک آئینہ دکھا دیا تھا اور ایک نئی سوچ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

ایڈونچر۔۔۔ فن۔۔۔ پارٹی۔۔۔ موسم۔۔۔ چینج کے نام پر ہم بہت بار لکڑیاں جلا کر کھانا پکا لیتے ہیں۔ مزا کرتے ہیں۔ اس مزے میں مرضی شامل ہوتی ہے۔ کبھی گلہ نہ کیا ہم نے اور آج۔۔۔ ہم ایک مسئلے' ایک پرابلم' ایک قوم بن کر فیس کرنے کے بجائے بس اپنا اپنا رونا لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تیرے گھر کی گیس' میرے گھر کی گیس۔ تیرے علاقے کی بجلی' میرے علاقے کی بجلی۔ میرا درد۔۔۔ میری تکلیف۔۔۔ میرا مسئلہ ہے۔ ہم ایک قوم نہیں رہے۔ ہمیں بس اپنے مسائل نظر آتے ہیں سب کہاں ہیں' کیسے ہیں۔ جائیں بھاڑ میں۔ ہم اپنی زبانوں کو "ناشکری" کے وار سے آلودہ کر چکے ہیں۔

تصویر کا روشن پہلو بھی کبھی دیکھ لینا چاہیے' گھروں میں گیس کی قلت ہے' لیکن کارخانوں کو چوبیس گھنٹے گیس مہیا کی جا رہی ہے۔ لوگوں کو روزگار مہیا ہے۔ جس دن سورج نہ نکلے اس دن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی۔ زبان ناشکری سے آلودہ ہو جاتی ہے اور جب ہر دن سورج نکلتا ہے۔ روز دھوپ روشنی لے کر آتا ہے۔ ہم نے کب اور کس دن شکر ادا کیا ہے؟ روز کپڑے کیسے سوکھ جاتے ہیں۔

اس روشنی کی حدت سے کتنا اناج پکتا ہے اور کتنے جراثیم مرتے ہیں' کتنی غذائیت حاصل ہوتی ہے' کتنے وٹامن ملتے ہیں۔ کبھی نہیں سوچا' نہ شکر ادا کیا۔ لیکن چند دن سورج نہ نکلے' کپڑے نہ سوکھیں۔ سردی نے حال بے حال کر دیا۔ تو اف اف۔۔۔ ہائے ہائے۔۔۔ بوئی ہوئی برا نکلتا ہے منہ سے۔

میرا دل شرمندگی کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

آج کا دن بہت انوکھا اور روشن ہے۔ حالانکہ دھند ابھی بھی باہر ہے۔ نیا سال' نیا جذبہ بھی لایا ہے میرے

لیے۔

"میں نے سب کو بتا کر آج گھر میں کھانا بنایا ہے۔ کھچڑیاں، روٹیاں، رشید وے بنا کر دی ہیں۔"

کھانا بھی ایڈونچر کی طرح پکایا گیا۔ بنا کسی کو محسوس کرائے میں نے باجی کے بچوں اور نند کے بچوں کو بھی انوالو کر لیا تھا۔ آج کی کوکنگ میں سب نے انجوائے کیا تھا اور آج گھر کا کچا کھا کر کوئی ناراض بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

باتھ میں آخر میں مائیکروویو میں چائے بناتی تھی۔

کچھ دن تک جب تک گیس کی فراہمی ممکن نہیں تھی۔ ہم آج کل پکنک پر ہیں۔ میں نے کھلے دودھ کی چائے کے بجائے ٹی بیگ والی سب کو بنا کر دینی شروع کر دی۔ حامد کو چائے ملنے لگی ہے اب وہ کڑوے کڑوے بیان نہیں دیتے۔

"تم تو ھی رات کو کھڑی کپڑے کیوں استری کر رہی ہو۔ یہ کام ماسی کا ہے۔" حامد نے مجھے اپنی پینٹ استری کرتے دیکھ کر کہا۔ وہ ٹی وی پر کوئی فلم دیکھ رہے تھے۔

"وہ صبح ماسی کے آنے تک لائٹ نہیں ہوگی اور آپ کو صبح صبح جانا ہوگا تو مشکل ہو جائے گی۔" میں نے رسانیت سے کہا۔

"ایسے نہیں مشکل ہوگی؟" حامد نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"کیسی مشکل حامد! ساری زندگی نہ تو لائٹ کا یہ شیڈول رہنا ہے اور نہ اتنی قلت، کبھی تو وقت ٹھیک ہوگا نا۔ کبھی تو صبح سات بجے لائٹ آئے گی ہی۔" میں قہقہہ لگا کر ہنسی۔

حامد نے مجھے ایسے دیکھا کہ جیسے میری ذہنی حالت خراب ہو گئی ہے۔

"تم رات کے بارہ بجے کپڑے استری کرنے پر خوش ہو؟" حامد نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"بہت۔" میں نے جواباً "بہت" کو کھینچ کر کہا تھا۔ تھوڑا سا ایڈجسٹ تو کرنا پڑتا ہی ہے۔"

میرے اطمینان میں کوئی کمی نہ تھی۔

"چلو۔" "ایک اور قائداعظم آ گئے ہمارے گھر۔" حامد بڑبڑاتے باہر چلے گئے تھے۔

صبح جب میں اٹھی تو غیر معمولی چہل پہل تھی باہر۔ آج اتوار کا دن تھا۔ عموماً سب لیٹ اٹھتے تھے لیکن باہر سب کی آوازوں کے ساتھ حامد کی آواز بھی نمایاں تھی۔

میں اپنے بیٹے کو لیے باہر نکلی تو حیران کن منظر سامنے تھا۔ حامد لکڑیوں پر چائے بنا رہے تھے۔ سب کو انڈے فل فرائی کر کے دیے جا رہے تھے۔ ہر کوئی پاس کرسیاں، اسٹول ڈالے باتیں کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ناشتا ہو رہا تھا۔

سب کے چہروں پر اکٹھے بیٹھنے کی خوشی تھی۔ سب بنا کسی دھوئیں کی تکلیف محسوس کیے قریب بیٹھے تھے۔

بالینڈ سے آئے بچے ماہر شیف کی طرح بار بار لکڑیاں سلگا رہے تھے۔ مزا تھا۔ خوشی تھی۔

"حامد! یہ کیا ہے۔" میں نے سوال کیا تھا۔

"تم نے ہی تو کہا تھا۔ وہ چار دن ایڈونچر اور فن میں گزارتے ہیں۔" حامد ہنس پڑے۔

"ہیں۔" میں نے حیرت اور خوشی سے ان کو دیکھا۔

"ہاں بھئی۔" وہ ہنس پڑے۔ "اور باربی کیو کرتے ہیں شام میں، تم قیمہ کو مسالا لگاؤ۔" حامد فل مزے میں تھے۔

"کیا ایک اور قائداعظم پیدا ہو گئے گھر میں؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"پہلے ایک قوم تو بن جائیں۔ قائد بھی بن جائیں گے۔" باجی میری نند نے آ کر لقمہ دیا تھا جواباً۔

ہم تینوں کی ہنسی گونج اٹھی۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا، آج بھی سورج نہیں نکلا تھا۔

لگتا ہے کچھ دنوں میں دھند چھٹ جائے گی۔ کبھی دھند بھی سدا رہنے کے لیے پڑی ہے؟

میں کیوں کسی کا نہ ہو سکا؟

میں یہ سوچتا ہوں کبھی کبھی
کوئی خواب میں نے بُنا نہیں
کوئی چہرہ میں نے چُنا نہیں
کسی کی یاد کا کوئی پھول مجھ میں کھلا نہیں
جسے ڈھونڈتا تھا وہ ہم نشیں
کسی انجمن میں ملا نہیں
میں یہ سوچتا ہوں کبھی کبھی
یہی مہر و مہ، یہی کہکشاں، صفِ دوستاں
وہی گلستاں، وہی جون جاں وہی دشمنوں کے
میں درمیاں
وہی راستے وہی فاصلے، وہی زخمِ دل وہی نارسا
میری زندگی، میری بندگی، میرے ساتھ ایسی درندگی
جو ہوا ہے ساتھ میرے یہاں
کروں کس کے سامنے میں بیاں
کوئی ہے یہاں
جو میری محبتوں کا رقیب ہے
میں کہوں بھی کیا
کہ وہی جو میرا حبیب ہے
مرے دل کے اتنا قریب ہے
کہ میں یہ سوچتا ہوں کبھی کبھی
سبھی زخمِ دل، سبھی درد جو کہ بُھلا کے میں
کہ ابھی! انا کو مٹا کے میں
اُسے ڈھونڈ لوں
کبھی نیند میں کبھی خواب میں
کسی راستے کسی یاد میں
وہ ملے تو اس سے کہوں گا میں
مرے دوست میرے حبیب تو
ہے مری دعا
انہیں کر عطا مرا سوزِ غم، مری چشمِ دل
تو جو میرے دل کے قریب ہے
انہیں بخش دے
انہیں آہ دے انہیں راہ دے
انہیں درد و غم کی پناہ دے
میرے دوست میرے حبیب تو
یہ بتا بھی دے
کہ میں کیوں کسی کا نہ ہو سکا!

ڈاکٹر طاہر مسعود

نگاہ میں ہے یہ منظر جو شام ہونے کا
اشارہ ہے یہ سفر کے تمام ہونے کا

وہی فریب سا ہے صبح و شام ہونے کا
یہاں تو مجھ سے نہیں اب قیام ہونے کا

پھر ایک پل میں سب ہی کچھ لپیٹ میں آیا
کیا گیا تھا بڑا اہتمام ہونے کا

نہیں ہے اس کے سوا کچھ حقیقتِ ہستی
دیا گیا ہے نہ ہونے کو نام ہونے کا

مجھے تمام کی جانب سفر میں رکھتا ہے
خیال ہے جو مرے ناتمام ہونے کا

شکست دی ہے رخِ یار کی دمک نے اسے
جو دعوے دار تھا ماہِ تمام ہونے کا

نسیم آج کوئی یاد آ رہا ہے بہت
سو آج مجھ سے نہیں کوئی کام ہونے کا

نسیم سحر

یہ ڈر رہا ہوں کہ ایسے میں وہ نہ یاد آجائیں
یہ کالی کالی گھٹائیں یہ اودی اودی ہوائیں

ہیں گرچہ اہلِ نظر کو بڑے بڑے دعوے
کہیں وہ جلوہ نما ہو تو دیکھتے رہ جائیں

وصال و ہجر کا ایسوں کے کچھ ٹھکانا ہے
کہ جا کے بھی جو نہ جائیں اور آ کے بھی جو نہ آئیں

کریں تو کس سے کریں شوقِ نارسا کا گلہ
رکیں تو پاؤں نہ مانیں، چلیں تو منہ کی کھائیں

کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی، تو کیا مر جائیں؟

نہ ختم ہو جو کبھی، وہ بھی داستاں ہوئی ختم
جھپک رہی ہیں ستاروں کی آنکھیں، اب سو جائیں

فراق گورکھپوری

اشعار مرے یوں تو زمانے کے لیے ہیں
کچھ شعر فقط اُن کو سُنانے کے لیے ہیں

اب یہ بھی نہیں ٹھیک کہ ہر درد مٹا دیں
کچھ درد کلیجے سے لگانے کے لیے ہیں

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹے سے چُبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہیں

دیکھوں ترے ہاتھوں کو تو لگتا ہے ترے ہاتھ
دل میں فقط دیپ جلانے کے لیے ہیں

یہ علم کا سودا، یہ رسالے، یہ کتابیں
اک شخص کی یادوں کو بُھلانے کے لیے ہیں

جانثار اختر

پڑھاکو

نئے نئے کالج میں داخل ہونے اور پڑھائی کے شوقین بننے والے بیٹے سے باپ نے پوچھا۔

"رات تم کتنی دیر تک پڑھتے رہے؟"

"میں نے رات دو بجے تک اسٹڈی کی۔" بیٹے نے شو ماری۔

"لیکن رات گیارہ بجے تو بجلی چلی گئی تھی۔" باپ نے حیرت سے کہا۔

"میں پڑھائی میں اتنا مگن تھا کہ مجھے بجلی کے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔" بیٹے نے جواب دیا۔

ثمو جاوید۔۔۔ بسم اللہ پور

پسند

ایک شخص اپنے دوست کو بتا رہا تھا کہ

"مجھے ایک ایسی لڑکی مل گئی تھی جو بالکل میری امی کی طرح تھی۔ شکل و صورت، عادات و اطوار بالکل وہی حتیٰ کہ کھانا بھی امی کی طرح پکاتی تھی۔ امی نے اسے پسند کیا اور کہا کہ۔۔۔"

"ایسی اچھی لڑکی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔"

"تو کیا تم نے چپ چپ شادی کرلی، مجھے بتایا تک نہیں۔" دوست نے شکوہ کیا۔

"نہیں یار! اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

"وہ کیوں؟"

"پاپا نے کہا ایسی بدصورت، بدسلیقہ اور بدتمیز لڑکی سے شادی کروگے تو میری طرح تمہاری بھی زندگی جہنم بن جائے گی۔"

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کہروڑ پکا

جنت کا ٹکٹ

ایک دھوکے باز شخص نے یہ مشہور کردیا کہ جو شخص اسے ایک ہزار دے گا وہ اسے جنت کا ٹکٹ دے گا۔ جواب میں لوگوں نے اس سے بے تحاشا ٹکٹ خریدے۔

ایک دن وہ اپنے کمرے میں نوٹ سجائے اپنی دولت کا حساب کررہا تھا کہ کھڑکی سے ایک شخص اندر داخل ہوا اور ریوالور نکال کر بولا۔

"خبردار! ساری دولت میرے حوالے کردو ورنہ۔۔۔"

"اگر تم نے مجھے لوٹا تو یاد رکھو سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔"

دھوکے باز نے چلا کر کہا۔

"ناممکن۔" وہ شخص مسکرا کر بولا۔ "میں نے پہلے ہی تم سے جنت کا ٹکٹ خرید رکھا ہے۔"

نسبت سفیہ۔۔۔ کہروڑ پکا

دونوں کے صنم خاکی

صابر کرایہ دار کرایہ ادا نہ کرتا تھا۔ مالک مکان مرزا اسد نے بہت زور مارا مگر صابر ٹس سے مس نہ ہوا۔

مالک مکان مرزا اسد صاحب نے عاجز آکر ایک ترکیب سوچی، بند لفافے میں اپنی چھوٹی بچی کی ایک تصویر بھیجی جس پر لکھا تھا۔

"رقم کیوں چاہیے اس کی وجہ؟"

تیسرے دن مرزا اسد کو ایک خط کرایہ دار صابر کا ملا جس میں ایک حسین اداکارہ کی تصویر تھی نیچے لکھا تھا۔

"رقم کیوں نہیں ملتی اس کی وجہ؟"

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑپکا

فوج اور عورت

ایک فرانسیسی جرنیل کی ملاقات پیرس کی ایک مشہور اداکارہ سے ہوئی۔ جرنیل نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیا آپ کو خبر ہے کہ جتنا فرانسیسی فوج کا خرچ ہے اس سے دگنا فرانس کی عورتوں کا ہے۔"

اداکارہ بولی۔

"یہ تو ایسی تعجب کی بات نہیں، جتنے فرانسیسی فوج کے کارنامے ہیں اس سے دگنے فرانس کی عورتوں کے کارنامے ہیں۔"

ثریا شاد۔۔۔ کہروڑپکا

ذوق تماشا

چرچل کے ایک مداح نے ایک بار بڑی عقیدت سے پوچھا۔

"آپ یہ دیکھ کر خوش تو بہت ہوتے ہوں گے کہ جب بھی آپ تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو ہال کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔"

"ہاں مسرت تو ہوتی ہے مگر ہمیشہ ہی خیال آجاتا ہے کہ اگر تقریر کے بجائے پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہوتا تو خلقت تین گنا زیادہ ہوتی۔"

سیدہ نسبت زہرہ۔ کروڑپکا

قابل دید

دو دیہاتی دوستوں کا قریبی شہر میں صبح نو بجے انٹرویو تھا۔ شہر سے تقریباً" ایک کلومیٹر پہلے ہی گاڑی خراب ہو گئی۔ دونوں شہر کی طرف پیدل چلنے لگے اتفاق سے دونوں کے پاس گھڑیاں نہیں تھیں کہ ٹائم معلوم کر سکیں اتنے میں سائیکل پر سوار ایک ادھیڑ عمر گوالے پر نظر پڑی جو شہر دودھ بیچ کر واپس گاؤں آرہے تھے دونوں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"بزرگوار! ٹائم کیا ہوا ہے؟"

بزرگوار سائیکل سے نیچے اترے پھر اپنے دونوں بازو نیچے کی طرف کرتے ہوئے جھنجھوڑنے لگے۔ دونوں دوست حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ان کے دونوں بازوؤں میں گھڑیاں تھیں جنہیں موصوف نیچے لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب گھڑیاں کلائیوں پر آگئیں تو پھر انہوں نے اپنا چشمہ آنکھوں پر لگایا اور ٹائم بتانے لگے پہلے انہوں نے اپنے دائیں ہاتھ والی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولے۔

"بیٹا۔۔۔ چھ، سات، آٹھ، آٹھ۔ ہاں بیٹا! آٹھ بج کر، آٹھ بج کر۔"

پھر بائیں ہاتھ والی گھڑی پر نظر دوڑائی اور کہا۔

"بیٹا آٹھ بج کر چالیس، پینتالیس، پچاس، ہاں بیٹا! آٹھ بج کر پچاس منٹ ہو گئے ہیں۔ بیٹا! مجھے ذرا جلدی ہے۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔"

"ضرور بزرگوار، مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے گھنٹے دائیں ہاتھ والی گھڑی اور منٹ بائیں ہاتھ والی گھڑی سے کیوں بتائے ہیں؟"

"بیٹا! کیا بتاؤں؟ دائیں ہاتھ والی گھڑی پر منٹوں کی اور بائیں ہاتھ والی گھڑی پر گھنٹے کی سوئی نہیں ہے۔"

دعائے صحت

نبیلہ عزیز کی پھوپھی جو ان کے لیے ماں کی طرح ہیں۔ شدید علالت کا شکار ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کی صحت کاملہ کے لیے دعاگو ہیں۔

قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "میرے والد نے میرا سارا مال لے لیا ہے" تو آپ نے فرمایا۔

" تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے۔

" تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی میں سے ہے' اس لیے ان کے مال سے کھا لیا کرو۔"

(مسند احمد)

سمجھ کر فیصلہ کرو،

ایک آدمی کے چار بیٹے تھے۔ اس نے اپنے بیٹوں کو سفر پر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا اور دور دراز علاقے میں ناشپاتی کا ایک درخت دیکھنے کے لیے بھیجا۔

باری باری سب کا سفر شروع ہوا۔

پہلا بیٹا سردی کے موسم میں گیا۔ دوسرا بہار میں' تیسرا گرمی کے موسم میں اور سب سے چھوٹا بیٹا خزاں کے موسم میں گیا۔ جب سب بیٹے اپنا اپنا سفر ختم کر کے واپس لوٹ آئے تو اس آدمی نے اپنے چاروں بیٹوں کو ایک ساتھ طلب کیا اور سب سے ان کے سفر کی الگ الگ تفصیل کے بارے میں پوچھا۔

پہلا بیٹا جو جاڑے کے موسم میں اس درخت کو دیکھنے گیا' اس نے کہا۔ "وہ درخت بہت بدصورت جھکا ہوا اور ٹیڑھا سا تھا۔"

دوسرے بیٹے نے کہا۔ "نہیں' وہ درخت تو بہت ہرا بھرا تھا۔ ہرے ہرے پتوں سے بھرا ہوا۔"

تیسرے بیٹے نے ان دونوں سے اختلاف کیا۔

" وہ درخت تو پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کی مہک دور دور تک آرہی تھی اور یہ کہ اس سے حسین منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

سب سے چھوٹے بیٹے نے ' پنے سب بڑے بھائیوں سے اتفاق ظاہر کیا کہ "وہ ناشپاتی کا درخت تو پھل سے لدا ہوا تھا اور اس پھل کے بوجھ سے درخت زمین سے لگا زندگی سے بھرپور نظر آرہا تھا۔"

یہ سب سننے کے بعد اس آدمی نے مسکرا کر اپنے چاروں بیٹوں کی جانب دیکھا اور کہا "تم چاروں میں سے کوئی بھی غلط نہیں کہہ رہا۔ سب اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔"

بیٹے باپ کا جواب سن کر بہت حیران ہوئے کہ ایسا کس طرح ممکن ہے۔ باپ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تم کسی بھی درخت کو یا شخص کو صرف ایک موسم یا حالت میں دیکھ کر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ انسان کبھی کسی کیفیت میں ہوتا ہے' کبھی کسی کیفیت میں۔ اگر درخت کو تم نے جاڑے کے موسم میں بے رونق دیکھا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس پر کبھی پھل نہیں آئے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو تم لوگ غصے کی حالت میں دیکھ رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ برا ہی ہوگا۔ کبھی بھی جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کرو۔ جب تک اچھی طرح کسی کو جانچ نہ لو۔"

قوموں کی ترقی،

نادر شاہ نے جب دلی پر قبضہ کیا تو اسے ہاتھی

کی سواری پیش کی گئی۔ ہاتھی پر بیٹھ کر اس نے مہاوت سے کہا "اس کی لگام میرے ہاتھ میں دے دو۔"

مہاوت نے عرض کی "حضور! اس کی لگام نہیں ہوتی بلکہ یہ میرے اشارے پر چلتا ہے۔" نادر شاہ یہ سن کر ہاتھی سے اتر آیا اور کہنے لگا۔

"میں ایسی سواری پر نہیں بیٹھتا جس کی لگام کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔"

حجاج اور اعرابی کا مکالمہ

سعید بن عروہ کا بیان ہے۔

حجاج بن یوسف ایک مرتبہ مکہ مکرمہ جا رہا تھا۔ راستے میں پڑاؤ ڈالا۔ اس نے اپنے دربان سے کہا۔

"دیکھو! اگر کوئی اعرابی (بدو) نظر آئے تو اسے لاؤ تاکہ وہ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے۔"

حجاج کی یہ عادت تھی کہ جب کھانے پر بیٹھتا تو لازما کسی دوسرے شخص کو بھی دسترخوان پر ساتھ بٹھاتا۔

دربان کی نگاہ ایک اعرابی پر پڑی۔ جو دو چادریں لپیٹے ہوئے تھا۔ اس نے اعرابی کو مخاطب کر کے کہا۔

"گورنر کی دعوت قبول کرو۔"

جب اعرابی حجاج کے پاس آیا تو حجاج نے کہا۔

"قریب آؤ اور میرے ساتھ کھانا تناول کرو۔"

اعرابی:۔ "مجھے اس ہستی نے دعوت دے رکھی ہے جو تجھ سے بہتر ہے۔"

حجاج:۔ "کون ہے وہ ہستی؟"

اعرابی:۔ "اللہ عزوجل نے مجھے روزہ رکھنے کی دعوت دی ہے۔ سو میں روزے سے ہوں۔"

حجاج:۔ "اس شدید گرمی میں روزہ؟"

اعرابی:۔ "جی ہاں، میں نے اس دن کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے جو اس سے کئی گنا زیادہ گرم ہوگا۔"

حجاج:۔ "چلو آج کھا لو، کل روزہ رکھ لینا۔"

اعرابی:۔ "مجھ پر تعجب ہے اے حجاج! کیا کل تک میری زندگی کا تو ضامن ہو سکتا ہے؟"

حجاج:۔ "یہ تو میرے بس میں نہیں ہے۔"

اعرابی:۔ "پھر تو کیوں آج کا عمل کل پر ڈالنے کی بات کر رہا ہے جس کا اختیار ہی تیرے پاس نہیں ہے۔"

حجاج:۔ "بھئی یہ بڑا ہی لذیذ اور اچھا کھانا ہے۔"

اعرابی:۔ "نہ تو تو نے کھانا اچھا بنایا ہے اور نہ ہی یہ باورچی کے ہاتھوں کا کمال ہے، بلکہ صحت و عافیت نے اس کی لذت کو دوبالا کیا ہے۔ اگر صحت و عافیت نہ ہو تو پھر کوئی لذیذ سے لذیذ کھانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ اے حجاج! میں تجھے اور تیرے کھانے کو چھوڑتا ہوں، تو مجھے میرے رب کے ساتھ چھوڑ دے۔"

یہ کہہ کر اعرابی چل پڑا اور حجاج کے ساتھ کھانا تناول نہ کیا۔

(سنہرے اوراق سے انتخاب)
صدف عران۔ کراچی

ردِ عمل

ہم اپنی زندگی اپنے خود ساختہ خیالات اور رجحانات سے خریدتے ہیں۔ اور باقی کے دکھ ان سب کا ردِ عمل ہیں۔

یوم

کوئی لمحہ واپس نہیں آتا۔ کوئی دن دوبارہ نہیں آتا نہ یوم پیدائش نہ یوم وصال دوبارہ آتا ہے پھر کسی یوم کو منانے کا تصور غور طلب ہے۔

(واصف علی واصف)

کامیاب

جس شخص کے بیوی بچے اس سے راضی ہوں، اس کی دنیا کامیاب ہے اور جس کے ماں باپ راضی ہوں اس کا دین کامیاب ہے۔

مدیحہ نورین مہک۔ برنالی

راہ کے دیپ

- طویل دوستی کا ایک ہی راز ہے۔ دوست کی خامیوں کو نظر انداز کرتے رہیے۔ کیونکہ آپ کے حوالے سے وہ بھی تو ایسا کر رہا ہے۔

- رشتے خلوص کے ہوں یا محبت کے۔ بالآخر ٹوٹ جاتے ہیں۔ خواہ کتنے ہی مضبوط ہوں ہمیشہ ذرا سے شک یا معمولی بدگمانی انہیں نفرت میں بدل دیتی ہے۔ پھر اعتماد، فخر اور مان کیسا؟
- سو طرح کے پھول چنو، سو طرح کے رنگ دیکھو، خوشبو وہی حاوی ہوگی جو بہتر ہے، رنگ وہی غالب آئے گا جو حقیقی ہے۔
- رومان زندگی کی کتاب کا ایک ورق ہو سکتا ہے مگر پوری کتاب نہیں اور یہ سیاہ ورق۔ پوری زندگی کی کتاب بن جاتا ہے جسے نہ پھاڑنا ممکن ہوتا ہے نہ چھپانا۔

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

ہے سچ یہ بھی کہ...

- انسان پھول کی مانند ہے جسے توڑا جا سکتا ہے، سونگھا جا سکتا ہے، مسلا جا سکتا ہے مگر سمجھا نہیں جا سکتا۔
- زندگی کے سفر میں کہیں بھی جانے سے پہلے دس دفعہ سوچ کہ بیچ راستے سے پلٹنا کٹھن ہے بہت کٹھن۔
- انسان محو گفتگو اس لیے بھی رہنا چاہتا ہے تاکہ سناٹے جیسے عذاب کو دور کر سکے۔
- انسان کے سارے غم اور ساری مصیبتیں صرف خواہشوں کے باعث ظہور میں آتی ہیں۔
- آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ آپ کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

سخاوت

عرابہ اوسی کی سخاوت مشہور تھی۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ان کا ایک عقیدت مند ان کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔
نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ عرابہ بوڑھے تھے۔ نابینا ہو چکے تھے۔ نماز کے لیے گھر سے نکل رہے تھے۔ دو غلاموں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ اس آدمی نے کہا۔

"میں مسافر ہوں! میرا زاد راہ ختم ہو گیا ہے۔ مدد کا طالب ہوں۔"

عرابہؓ نے اپنے دونوں ہاتھ غلاموں کے کندھوں سے ہٹائے اور بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر زور سے مار کر کہنے لگے۔

"عرابہ نے اپنا تمام مال و دولت تو خرچ کر دیا ہے مگر یہ دونوں غلام باقی ہیں۔ تم ان کو لے جاؤ۔"

یہ کہنے کے بعد آپؓ دیوار کا سہارا لے کر ٹٹولتے ہوئے مسجد کی طرف چل دیے۔

پیاری باتیں

- انسان پریشانیوں کی گنتی کرنے کا ماہر ہے۔ لیکن نعمتوں کا حساب رکھنا بھول جاتا ہے۔
- دنیا کے ہر میدان میں ہار جیت ہوتی ہے لیکن اخلاق میں کبھی کبھار اور تکبر میں کبھی جیت نہیں ہوتی۔
- اچھے انسان کی نشانی یہ ہے کہ وہ اس شخص سے بھی اچھا سلوک کرتا ہے جس سے اسے کسی قسم کا فائدہ پہنچنے کی امید نہیں ہوتی۔
- زندگی برف کا ایک ٹکڑا ہے۔ جو ہر لمحے پگھل رہی ہے۔
- ایمان کا کمال حسن خلق ہے۔

نور صبۃ السلام۔ نواب شاہ

مدیحہ خان ـــــــ لاہور

ذرا سا بات کرنے کا سلیقہ سیکھ لو تم بھی
ادھر تم بات کرتے ہو، ادھر دل ٹوٹ جاتا ہے

صنوبر ملک ـــــــ راولپنڈی

ہم پرندے ہیں نہ مقتول ہوائیں پھر بھی لے دوست
آ کسی روز، کسی دکھ پہ اکٹھے رو دیں

ثمرہ کاظمی ـــــــ کراچی

چاہیے اک نگاہ شوق ورنہ بساطِ دہر پر!
میری خلش کے نرخ کیا، تیری تڑپ کے دام کیا

زینب خان ـــــــ کوئٹہ

میری برشتِ درد کا سُن کردہ لفظ لفظ
گویا ہوئے کہ قصے یہ شام و سحر کے ہیں

امبر اکرم ـــــــ حیدرآباد

لفظ کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا
لفظ سہنے والے کمال کرتے ہیں

بسریٰ علی ـــــــ چکوال

داستان ختم ہونے والی ہے
تم میری آخری محبت ہو

فریال منصور ـــــــ پشاور

صبح کے تخت نشیں شام کے مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھ

مریم اکبر ـــــــ ملتان

عمرِ رواں پھر کبھی نہ مسکرائی بچپن کی طرح
میں نے گڑیا بھی خریدی، کھلونے بھی لے کے دیکھے

حمنیٰ بیگ ـــــــ کراچی

ہم اپنے عہد میں جس بانکپن سے زندہ ہیں
اسے ہم اہلِ محبت کا حوصلہ کہیے

عطیہ سعد ـــــــ کراچی

عکس بے نقش ہو گئے امجد
لوگ پھر آئینوں کے ڈر میں ہیں

سدرہ آصف ـــــــ شیخوپورہ

گزر گیا کبھی ایسا بھی وقت مجبوری
کہ ہم بھی رو نہ سکے وہ بھی مسکرا نہ سکے

رخسانہ جمیل ـــــــ بیاری

ہر چوٹ ابھری جاتی ہے، ہر زخم ہرا ہو جاتا ہے
مدت میں جب کوئی ملتا ہے غم اور سوا ہو جاتا ہے

علیزے احمد ـــــــ نواب شاہ

دامن ملے کسی کا تو جی بھر کے رو لیے
مٹی میں آنسوؤں کو ملانا گناہ ہے

سعدیہ کفیل ـــــــ راولپنڈی

وہی روشنی کے نقیب ہیں، وہی تیرگی کے رقیب ہیں
شبِ آگہی تیری راہ میں جو چراغ ہم نے جلا دیے

بینش اسد ـــــــ گوجرانوالہ

ہیں پتھر نہیں مجھ پر دہکتے انگارے برساؤ
میرا جرم یہ ہے، میں روشنی کا ساتھ دیتا ہوں

روبینہ حنیف ـــــــ کراچی

کئی اور اہلِ طلب ملے مجھے راہِ شوق میں ہم قدم
جنہیں کر رہا تھا تلاش میں وہی لوگ مجھ کو ملے نہیں

عالیہ وحید ـــــــ پشاور

شاید کبھی تو دیکھے گا وہ تم کو جھانک کر
اس کی گلی میں روز تماشا کیا کرو

اسماء شفیق ـــــــ پنڈ دادن خان

ایک ستم ظریف نے صبحِ طرب کے نام پر
اپنا دیا بچا لیا، سب کے دیے بجھا دیے

نادیہ سرور ___ لاہور

گم صم سی رہتی ہوں اب اُسے کہنا
وہ شرارتی سی لڑکی اب ٹوٹ گئی ہے

حرا قریشی ___ ملتان

سودا ہے عمر بھر کا، کوئی کھیل تو نہیں
اے چشم یار! مجھ کو ذرا سوچنے تو دے
اُس حرف "کن" کی ایک امانت ہے میرے پاس
لیکن یہ کائنات مجھے بولنے تو دے

سعدیہ حسام محمود ___ مردان

قیامت خیز منظر گو ہزاروں ہم نے دیکھے ہیں
جو دل پہ ٹوٹتی ہے وہ قیامت اور ہوتی ہے

آمنہ حسین ___ شہداد پور

وہ محبتوں کی کہانیاں، جو غبار بن کے بکھر گئیں
انہیں رائیگاں نہ سمجھ انہی سے جہانِ غم کا جمال ہے

حمزہ اقرا ___ کراچی

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری، راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

ثنا عبدالقیوم ___ بیگہ چیمہ

شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی
ہو بھی تو میرے گھر نہیں ہوتی
زندگی تو ہی مختصر ہو جا
شبِ غم مختصر نہیں ہوتی

فوزیہ ثمر بٹ ___ گجرات

پھر یوں ہوا کہ نکلے کسی کی تلاش میں
پھر یوں ہوا کہ خود کو بھی نہ پا سکے تمام عمر
پھر یوں ہوا کہ اور نہ کسی کے ہو سکے
پھر یوں ہوا کہ وعدے نبھائے تمام عمر

نورین مسکان سرور ___ ڈسکہ

سلیقہ عشق میں میرا، کمال کا تھا
کہ اختیار بھی دل پر عجب مثال کا تھا
محبتوں میں، میں قائل تھی لب نہ کھلنے کی
جواب ورنہ مرے پاس ہر سوال کا تھا

فیصل قریشی

"کیسے ہیں جی... بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں؟"

"جی الحمدوللہ... بس کیا کریں... مصروفیات ہی ماشاءاللہ کسی سے بات کرنے کا وقت نہیں دیتیں۔"

"حال ہی میں آپ کا سیریل "قرار" ختم ہوا۔ "عشق پرست" آن ایر ہے اور جیت کا دم بھی... سب سے زیادہ کیا پسند کیا جا رہا ہے؟"

"یہ مجھ پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ میں نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا' اس نے مجھے کامیابیاں عطا کیں... اداکاری میں سنجیدہ اداکاری ہو یا کامیڈی... مارننگ شو یا کوئز ٹائپ کے پروگرام... تو اللہ کا شکر ہے کہ جس روپ میں بھی اسکرین پہ آیا کامیاب ہی رہا اور میرے چاہنے والے ناظرین نے مجھے پسند کیا۔"

"ماشاءاللہ سے کئی سال ہو گئے' آپ کو اس فیلڈ میں' میرے خیال سے تیئس' چوبیس سال تو ہو ہی گئے ہوں گے۔ فریش اور نوجوان نظر آنے کا کیا راز ہے؟"

ہنستے ہوئے... "اپنے آپ کو اچھا دکھنے کے لیے اور فیلڈ میں "ان" رہنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ اسمارٹ ہوں۔ اس لیے میں ڈائٹنگ بھی کرتا ہوں اور ایکسرسائز بھی... ڈائٹنگ کا طریقہ یہ ہے کہ پانی اور جوسز کا استعمال زیادہ کرتا ہوں۔ ڈائیٹ بھی ہو جاتی ہے اور فریش بھی رہتا ہوں۔"

"اتنا خیال رکھتے ہیں اپنا... کبھی بے احتیاطی کرنے کو بھی تو دل چاہتا ہوگا یا مار دیا ہے اپنے دل کو؟"

"ارے نہیں' ایسا کچھ نہیں ہے۔ جب لاہور جاتا ہوں تو تھوڑی بے احتیاطی کرنے کو دل چاہتا ہے' کیونکہ لاہور کی کئی ایسی چیزیں ہیں جو یہاں کراچی میں نہیں ملتیں تو پھر انہیں ضرور کھاتا ہوں اور ہاں کبھی کبھار سالوں میں ایک آدھ بار ایسا کردار مل جائے جس میں مجھے موٹا نظر آنا ہو تو پھر کردار کی خاطر تھوڑی بے احتیاطی کر لیتا ہوں۔"

"دیسی کھانے پسند ہیں؟"

"جی... دیسی کھانوں کا بہت شوقین ہوں۔"

"مارننگ شو کا تجربہ کیسا رہا... کافی مقبول رہا آپ کا مارننگ شو؟"

"بہت اچھا... بہت سیکھا ہے میں نے اور اگر آپ نے میرے مارننگ شو دیکھے ہوں تو آپ کو خود بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ میرا مارننگ شو دیگر شوز سے کافی مختلف ہوتا تھا اور اسی لیے کافی پسند کیا جاتا تھا۔"

دستک دستک دستک

شاہین رشید

"جی جی۔ بالکل ناچ گانا اور شادی بیاہ سے محفوظ تھا اور گانوں میں بھی آپ نے نئی آوازوں کے درمیان مقابلے کرائے۔"

"میں نے جب مارننگ شو کرنے کی ہامی بھری تھی تو یہ بات واضح کر دی تھی کہ نہ شادی بیاہ کے پروگرام ہوں گے۔ نہ ناچ گانا ہوگا اور نہ ہی انڈین فلموں اور اداکاروں کا بہت زیادہ ذکر ہوگا اور الحمدللہ میں نے زیادہ سے زیادہ اپنے پاکستان کی بات کی تو پروگرام بہت پسند کیا جاتا تھا اور ہمیں بہت اچھا فیڈ بیک بھی ملتا۔ ایسے پروگرام جو ساری دنیا میں دیکھے جاتے ہیں' ان میں ہمیں اپنے پاکستان کی بات کرنی چاہیے۔"

"ویسے مارننگ شو کرنا آسان کام ہے یا مشکل؟"

ہر وہ کام آسان ہوتا ہے جس کو آپ دل سے کریں اور نئے نئے پروگرام کرنے سے نئے نئے تجربات میں اضافہ ہوتا ہے اور مجھے مارننگ شو کر کے بہت اچھا لگا اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملا۔ بہت سے نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی' کچھ ملکی مسائل کچھ معاشرتی مسائل پہ بات ہوتی تھی تھوڑی تفریح۔ تو اچھا تجربہ رہا مارننگ شو کرنے کا۔"

"مارننگ شو کرنے کی وجہ سے آپ اداکاری سے تھوڑے دور ہو گئے تھے۔ شاید وقت کی کمی کی وجہ سے؟"

"جو لوگ مجھے اداکاری میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو بہت محسوس کیا اور تھوڑا احساس مجھے بھی ہوا۔ لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ میں تھوڑا چوزی ہوں۔ اچھے کام کو اچھے رول کو ترجیح دیتا ہوں اور اپنے پسندیدہ کردار کے لیے وقت بھی نکال ہی لیتا ہوں۔ جیسے "بشر مومن" کا کردار بہت مختلف تھا میرے اب تک کیے گئے کرداروں میں۔"

"آپ کو تعریف سننے کی اتنی عادت ہو گئی ہوگی کہ شاید اب آپ تنقید برداشت نہیں کر پاتے ہوں گے؟"

"ارے نہیں' ایسا کچھ نہیں اور یہ سچ ہے کہ گھر سے باہر بہت تعریف سننے کو ملتی ہے۔ مگر گھر میں میری بیگم اور میری ماں تنقید کرتی رہتی ہیں' چونکہ امی خود اس فیلڈ سے وابستہ ہیں تو وہ بہترین تنقید کرتی ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ جب امی شوق سے میرا ڈراما دیکھتی ہیں تو مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ میں نے اچھا پرفارم کیا ہے۔"

"ہوں۔ اب تو خیر آپ خود بھی بہت اچھی ڈائریکشن کر سکتے ہیں تو کیا فیوچر میں اس جانب آنے کا کوئی ارادہ ہے۔"

"دل تو بہت چاہتا ہے' مگر میرے مخلص لوگوں کا مشورہ ہے کہ میں اداکاری تک محدود رہوں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگر میں ڈائریکشن کی طرف آگیا تو پھر وہ مجھے اسکرین پہ نہیں دیکھ سکیں گے۔"

"اوہ اچھا۔ فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"فلمیں دیکھنا اور ان پر ڈسکس کرنا میرا فارغ وقت کا مشغلہ ہے۔"

"ہوں۔ چلیں پھر بات کریں گے۔"

☼ ☼ ☼

بلال قریشی

"کیسے ہیں بلال قریشی؟"

"جی۔ آپ سنائیں۔"

"شادی مبارک ہو' کب ہوئی؟"

"خیر مبارک' 14 فروری 2015ء کو ہوئی ہے شادی' ہم نے شادی اور ویلنٹائن ڈے ایک ساتھ منایا۔"

"تو میرے خیال میں ہمیشہ ایک ساتھ ہی منائیں گے؟"

قہقہہ۔ "خیال کیا۔ سچ میں منائیں گے۔"

"ان شاء اللہ۔ "بندھن" کے لیے آپ کا انٹرویو چاہیے ہوگا' دیں گے؟"

"میں تو دینے کو تیار ہوں' مگر ہماری بیگم نہیں دیں گی۔"

"کیوں؟"

"نہیں شاید انٹرویو دینے میں دلچسپی نہیں ہے بس اسی لیے نہیں دیں گی' سوری۔"

بلال قریشی کی بیگم بھی معروف فنکارہ ہیں۔ "عروسہ قریشی" ان کا نام ہے۔ ان شاء اللہ دیگر سلسلوں کے لیے ان کا انٹرویو ضرور کریں گے۔

"ڈراما۔۔۔ مکمل ہونے کے بعد اس کے آن ایر آنے کا انتظار کرتے ہیں کیا؟"

"بالکل کرتا ہوں' ایسا نہیں ہے کہ ڈراما مکمل ہوا اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ چلو میرا کام تو ہو گیا' اب جب بھی آن ایر آئے' میں نہ صرف آن ایر ہونے کا انتظار کرتا ہوں' بلکہ آخری قسط تک اپنا کام بھی دیکھتا ہوں۔"

"فیڈ بیک کس طرح ملتا ہے' پریس کے ذریعے یا میل ملاقات سے؟"

"اب فیڈ بیک کا ذریعہ ملنا یا تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کے لیے پریس تو ہے ہی' مگر اب فیس بک اور انٹرنیٹ نے بھی کام آسان کر دیا ہے اور اب تو لوگ بھی بہت صاف گو ہو گئے ہیں' جو چیز اچھی لگتی ہے اس کو کھلے دل سے بیان کر دیتے ہیں اور جو چیز بری لگے اس کے بارے میں بھی بتا دیتے ہیں۔"

"ناکامی کی صورت میں الزام کس کو دیتے ہیں؟"

"کسی کو نہیں۔۔۔ سب کا حصہ ہوتا ہے۔ ڈراما ایک ٹیم ورک ہوتا ہے' کسی ایک کی وجہ سے کبھی سیریل ناکام نہیں ہوتا۔"

"اسکرپٹ دیکھتے ہیں یا صرف اپنا کردار دیکھتے ہیں۔"

"میں پورے اسکرپٹ کا مطالعہ کرتا ہوں اور جب تک پورا اسکرپٹ پڑھ نہ لوں مجھے اطمینان حاصل نہیں ہوتا' پھر اپنے کردار کا مطالعہ کرتا ہوں جو خود کو اچھا لگتا ہے' کچھ کرنے کی گنجائش ہوتی ہے تو پھر ہامی بھرتا ہوں' ورنہ انکار کر دیتا ہوں۔"

"ایک اداکار کا پڑھا لکھا ہونا کتنا ضروری ہے؟"

"کتنا ضروری ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ بہت ضروری ہے۔ ایک پڑھا لکھا انسان ہی ہر بات کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اب ہماری ڈراما انڈسٹری ترقی ہی اسی وجہ سے کر رہی ہے کہ اس فیلڈ میں پڑھے لکھے لوگ آ گئے ہیں۔"

"صرف اداکاری کا شوق ہے یا کچھ اور بھی کرنے کا شوق اور ارادہ ہے؟"

"کرنے کا ارادہ تو بہت کچھ ہے' مگر اب تک جو کر چکا ہوں اس میں اداکاری کے علاوہ ہوسٹنگ بھی ہے' میں پی ٹی وی کے لیے اور اے ٹی وی کے لیے ہوسٹنگ کر چکا ہوں۔"

"گھر والے خوش ہیں آپ کے اس فیلڈ میں آنے سے؟"

"بہت خوش ہیں اور میرے گھر والوں نے ہمیشہ سے ہمیں فری ہینڈ دیا ہے کہ اپنا فیوچر خود بناؤ' اور ایسی تربیت کی کہ ہم سب سیلف میڈ ہیں اور میرے خیال میں جو سیلف میڈ ہوتے ہیں پھر وہی ترقی بھی کرتے ہیں اور جب میں اس فیلڈ میں آیا تو گھر والوں نے مجھے سپورٹ کیا' اور بھرپور طریقے سے کیا۔"

"فنکار کتنے بھی کردار کر لیں' پھر بھی کسی ایک کردار کو کرنے کی خواہش رہتی ہی ہے تو؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ واقعی میری بھی ایک کردار کرنے کی خواہش ہے اور وہ کردار فوجی اور سپاہی کا ہے' بہت خواہش ہے کہ یہ رول کروں۔"

"اور کس کردار کو کرنے میں بہت ایزی فیل کرتے ہیں؟"

قہقہہ۔۔۔ "آپ ہنسیں گی۔۔۔ مجھے رومینٹک رول کرنے میں بہت مزہ آتا ہے' کیونکہ یہی کردار تو انسان کی شخصیت کے قریب ہوتا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ پھر تو آج کل۔۔۔ چلیں چھوڑیں۔۔۔ ان شاء اللہ آپ کے نئے سیریلز آنے پر بات کریں گے۔"

"او کے جی۔۔۔"

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں

آپ کی عافیت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط حافظ آباد سے صائمہ مشتاق ثاقب لکھتی ہیں۔

صائمہ اکرم اور نگہت سیما کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ پہلی قسط وتعارفی سی تھی۔ پھر بھی مزا آیا۔ عبداللہ کا کردار بہت اچھا لگا۔ مجھے لگتا ہے پہلے منظر میں دونوں کردار عبداللہ اور عدنہ کے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے خالق کردار ہوں اور کہانی میں موجود سب کرداروں کے حالات کی جھلک دکھا رہے ہوں "خواب تھا کوئی" ۔ عبدالرحمٰن حبیب کے کردار نے بہت مایوس کیا۔ ایسا بھی بیوی کی باتوں میں کیا آنا کہ سگی اولاد کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جائے۔

تسیہ جی! آپ تو جانتی ہیں شعاع آپ کی بھی اور میری بھی۔

اتنی روانی، تسلسل، برجستگی اور شائستگی بھری ہوتی ہے آپ کی کہانی میں کہ ایک بار شروع کر کے چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ "پہلی بار" پڑھتے پڑھتے کل کھانا نیٹ بنایا میں نے۔ اتنا مزہ آتا ہے آپ کو پڑھتے ہوئے یوں جیسے کوئی جھرنا گر رہا ہے الفاظ کا اور میں بھی بہے چلی جا رہی ہوں اور آخر میں یہ سوچ "ارے! ختم بھی ہو گیا" اس ناول کی سب سے مزے کی چیز وہ گانے تھے جو بی اماں نے سنائے۔ خصوصاً "میں نے رات کہرا خوب سنا رہے" نے ایسا گدگدایا کہ مزا آ گیا۔ فجر کا کردار بہت اچھا لگا۔ دبنگ مگر حساس۔ تسیہ جی! آپ کے کرداروں کی یہ خاصیت بہت بھاتی ہے کہ وہ سچے کھرے اور دبنگ کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ فجر اور لاڈلی بیگم کی تکرار نے بہت مزہ دیا اور اثر کیسا کھنا نکلا۔ بی بی۔ زرمین آرزو کی "مسکرائی ہے زندگی" تھوڑی روایتی بلکی پھلکی کہانی اچھی تھی۔ زرمین! کیا آپ کے بچے اب بھی پیٹ بیٹے ہوئے ہیں؟ میں نے آپ کی تصویر دیکھی تھی۔ "وہ" یاں لمبے بال۔

نازیہ کنول نازی! سب سے پہلے آپ کو شادی کی مبارک باد۔ "تمہر خواب" اچھا ناولٹ تھا۔ افسانے اس بار سب ٹھیک ہی تھے۔

آپ کو پتا ہے آج یکم اپریل ہے اور آج پورے چھ ماہ دس دنوں بعد میرا دن خوشیوں سے بھرپور گزرا۔ بہت سے خوشگوار سرپرائز ملے۔ آج کل دل سے بجی نہیں میری۔ چپ سادھ کے بیٹھ ہے۔ لیکن آج اتنے ماہ بعد مجھے خوش دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگا۔ آپ پلیز ثانیہ سعید کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں۔ میری موسٹ فیورٹ اداکارہ ہیں۔ اور آپ مجھ سے ملنے کب آ رہی ہیں۔

پیاری صائمہ! 26 مئی کو آپ کی سالگرہ ہے۔ ہماری جانب سے مبارک باد قبول کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کا ہر دن خوشیوں سے بھر دے۔ دل کے ساتھ ہمیشہ دوستی رہے۔ آپ خوش تو وہ بھی خوش۔

شعاع پر تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ! بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے۔

میرپور خاص سے ماہم حمید شریک محفل ہیں لکھا ہے

اس ماہ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ سب سے پہلے ایک ننھی مثال "پڑھا اور سچ کہوں تو یہ ناول بہت سلو تھا اور میری سمجھ

میں نہیں آیا کہ آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے' کبھی افسانہ نگار کو غائب کر دیتی ہیں اور کبھی نبیلہ جی کو! خیر اس ماہ ثمرہ اکرم کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ نازیہ کنول کا ناولٹ بس ٹھیک رہا۔ اس ماہ سب سے اچھا افسانہ سائرہ کا ہی تھا۔ نگہت سیما کا مکمل ناول "خواب تھا کوئی" کے ساتھ واپسی سب سے اچھی لگی آخر میں ایک فرمائش سائرہ رضا اور ثمرہ بخاری کو بھی واپس بلالیں۔ سچ میں بہت کمی محسوس ہوتی ہے دونوں کی!

پیاری ماہم! سائرہ رضا کو تو ہم شامل کرتے رہتے ہیں۔ آئندہ ماہ جون کے شمارے میں سائرہ رضا کا مکمل ناول شامل ہوگا۔

البتہ ثمرہ نے کافی عرصے سے نہیں لکھا ان کی کمی ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے۔ قسط غائب ہوتی ہے تو ہمیں بھی اچھا نہیں لگتا' لیکن مجبوری ہوتی ہے نبیلہ عزیز کی پھوپھی جنہوں نے انہیں ماں کی طرح پالا ہے۔ شدید بیمار رہیں۔ اس لیے وہ لکھ نہیں پائیں۔ اس ماہ بھی قسط مختصر ہے۔ لکھ نہیں پاتیں تو قسط شامل نہیں ہوتی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رداشبیر' دیہ ڈگری ضلع' میرپور خاص سے لکھتی ہے

شعاع اور خواتین میرے موسٹ فیورٹ رسالے ہیں' سمیرا حمید کی تحریر "پیرم" ناقابل فراموش۔ اس ماہ "صائمہ اکرم چوہدری" کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ باقی سب سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔ افسانوں میں تیرہ کاشف کا "چابی" "ضمیر کو چابی" دے گیا۔

پیاری ردا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

حمیرا قریشی۔۔۔ حیدر آباد

ہمیشہ کی طرح شعاع بیسٹ رہا بہت مزا آیا اور غصہ بھی' آپی کیا شعاع میں نئے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟

پیاری حمیرا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عابد بشیر عالی احمد نے سکریالی تحصیل کھاریاں سے لکھا ہے

تسنیمہ رزاقی نام دیکھتے ہی مزا آگیا۔ نجانے کیا جادو (سب ہماری رائٹرز کے پاس) تسنیمہ رزاقی کے اس قدر سادہ جملے اور بڑی بڑی باتیں پیش۔ صائمہ اکرم چوہدری "سیاہ حاشیہ" باشیہ اپنی یہ تحریر بھی زبردست ہوگی۔ (ان شاء اللہ) میں نے تو کچھ اندازے لگا بھی لیے ہیں۔

"شب خواب" نازیہ کنول نازی نے بھی قلم کا حق ادا کر دیا (ہمیشہ کی طرح) افسانوں کے بارے میں کچھ اتنا سیدھا نہیں کہہ سکتی۔ سب ہی اپنی جگہ پر پرفیکٹ تھے۔ "مسکراتی ہے زندگی" زرمین ارزو شاید نئی رائٹر ہیں انہوں نے خوب لکھا۔

سمیرا حمید' سائرہ رضا' نگہت سیما' صائمہ اکرم' نازیہ کنول نازی' رخسانہ نگار' تسنیمہ رزاقی' قلب کے قلم گشتہ ہونے سے صدا ابھری۔ واقعی' بیک وقت' اتنے نام اکٹھے۔

اردو ہے جس کا نام سائرہ رضا نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہماری آنکھیں کھول دیں۔ (ہمارے تعلیمی نظام میں اردو کی اتنی اہمیت) روبرو میں سمیرا حمید کو دیکھ کر دل بیوں اچھل پڑا۔

عابدہ! فرحین اظفر کے ناول کے بارے میں آپ کا اندازہ درست تھا اور ہم نے اس کے بارے میں کسی خط کے جواب میں لکھا بھی تھا۔ شاید وہ خط شائع نہ ہو سکا۔ صائمہ اکرم کے ناول کے بارے میں آپ کے اندازے درست ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ آپ نے اپنا فون نمبر لکھا ہے۔ ہم آپ کو فون کر کے بتا دیں گے۔

اقرالیاقت' شاہ کوٹ پٹھان چک '51

سمیرا جی! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی' وریا کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا مرحہ کے ساتھ وہ کتنا مخلص تھی' ہر موڑ پر اس کی مدد کی کاش کچھ زور کر دیتا تو اچھا لگتا۔ بہرحال آپ بہتر جانتی ہیں' تعریف جتنی بھی کی جائے کم ہے "ایک تھی مثال" کہیں پہ لگتا ہے بہت اچھا ہونے لگا ہے اور پھر کہانی الگ موڑ پہ رخ جاتی ہے "رقص بسمل" نبیلہ جی آپ ہم سے کس بات ناراض ہیں۔ پلیز کوئی تو راز کھولیے اور ذرا رفتار بھی بڑھائیے۔ باقی پورا رسالہ بیسٹ ہے۔ انٹرویوز

شعاع کے سب سلسلے پہلی شعاع سے خوب صورت بننے تک بہت اچھے تھے۔ آپ کے شعاع میں ایک کمی کی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ آپ شعاع میں اسلامی تاریخ یعنی اسلامی عمارتوں کی تاریخ کے حوالے سے کوئی سلسلہ ضرور شروع کریں۔

ایک اور واقعہ تو دس محرم کے حوالے سے آج تک امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ کے بارے میں صحیح معلومات شروع سے لے کر آخر تک شائع کریں تاکہ ہم لوگ جان سکیں کہ اصل لڑائی تھی کیا۔ اس لیے کہ "ہمیں پڑھنے میں آتا ہے کہ حق اور باطل کی لڑائی تھی حق کے بارے میں ہمیں علم ہے اور وہ باطل کیا تھا یزید چاہتا کیا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے سنا ہے کہ حضرت نوح کی کشتی دریافت ہوئی ہے، کب کیسے اور کس طرح اس کی تصویر کے ساتھ معلومات دیں۔ نیز فرعون کی ممی جو مصر کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ نگنبس کی ترکیب بھی شائع کریں اور ہمیں بڑا کی آسان ترکیب لکھیں۔ نیز فریج میں بغیر اوون کے گھر میں کیک تیار کرنے کی آسان تراکیب بھیجیں۔ آپ ہمیں کریم والا کیک۔ چاکلیٹ کیک۔ آئس کیک کی تراکیب بھی بتائیں۔

پیاری سمیرا! دنیا کتنی بھی فاسٹ ہو جائے، زمانہ کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے۔ محبت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ کائنات محبت کے دم سے ہی قائم ہے۔ محبت کی کوئی ایک شکل نہیں ہوتی۔ ویرا کو امرحہ سے جو محبت تھی وہ کارل کو عالیان سے جو لگاؤ تھا دادا جان جو امرحہ کو اپنی جان بنائے ہوئے تھے۔ یہ سب محبت کی شکلیں تھیں جن کی سمیرا نے بڑی خوب صورتی سے تصویر کشی کی۔ عالیان اور امرحہ تو مرکزی کردار تھے۔ اس لیے وہ آپ کی توجہ کا مرکز بنے اور آپ نے لکھا کہ اس فاسٹ دور میں اس طرح کی محبتیں نہیں ہوتیں۔ محبتیں تو ہوتی ہیں عالیان اور امرحہ بھی ہوتے ہیں لیکن ہم اس فاسٹ دور میں ان کو دیکھ نہیں پاتے ہیں۔ سمیرا نے ہمیں انہیں دکھایا۔

آپ کی تمام تجاویز نوٹ کرلی ہیں۔ بہت اچھی تجاویز ہیں۔ واقعہ کربلا پر ہم پہلے مضمون دے چکے ہیں۔ آپ کی فرمائش پر دوبارہ شائع کردیں گے۔

ملالہ اسلم نے خانیوال سے لکھا ہے

میں نے مختلف میگزینز خصوصاً بچوں کے میگزین میں بھی لکھا ہے۔ ایک تحریر لکھی ہے۔ پھر سوچا شعاع والے میرا نام ہی شامل نہیں کرتے تو تحریر کیوں کریں گے۔ آپی! جو آپ سے محبت کرتے ہیں ان کا اتنا تو حق بنتا ہے کہ آپ محبت سے جواب بھی دیں۔ میرے کمپیوٹر کے سر وقاص کی بیٹی میری کلاس فیلو ہے اور سر خود اپنی بیٹی کو شعاع اور خواتین لا کر دیتے ہیں اور صاف مجھے ہر ماہ خواتین ادھار دیتی ہے۔ شعاع کا ٹائٹل اچھا لگا۔ پہلی شعاع کے بعد حمد و نعت اور نبی کی باتوں سے دل و دماغ کو منور کیا۔ روبرو میں سمیرا آپی سے مل کر اچھا لگا "ایک تھی مثال" اب تو پڑھ کر دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ نازی آپی تھینک یو سو مچ۔ آپ نے بہت خوش کر دیا۔ علیزہ کا کردار پسند آیا۔ احراز کا مطلب بھی بتا دیں۔ نگہت سیما کا ناول بیسٹ تھا۔ بادی کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ نیر کاشف نے اپنی کاوش کے ذریعے بہت اچھا میسج دیا۔ نیز ارم چوہدری ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بازی لے گئیں۔ تسنیم ریزلی کے ناول میں دادی کے گیت دل کو چھو گئے۔ "مسکراتی ہے زندگی" اچھا لگا۔ پلیز آپی نمرہ اور سمیرا شریف طور کو بھی شعاع میں شامل کریں۔

پیاری ملالہ! آپ کا ہمارے اوپر پورا حق ہے۔ آپ کی تحریر شامل نہ ہو سکی۔ اس کا ہمیں دلی افسوس ہے۔ تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر بھی کچھ خط شامل نہیں ہو پاتے۔ آپ ہمیں کہانی ضرور بھجوائیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپکے والد صاحب کو صحت و تندرستی عطا فرمائے اور آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

سعدیہ طور نے مردان سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین ڈائجسٹ چھ، سات سال سے باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے تو سمیرا حمید کو شاہکار ناول "یارم" تخلیق کرنے پر ڈھیر ساری مبارکباد۔ سمیرا آپی کے قلم سے الفاظ کی صورت قیمتی موتی جھڑتے ہیں۔ "یارم" کے ایک ایک لفظ، ایک ایک جملے اور ایک ایک کردار نے تو مہینے ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ بند حسن میں غازی مراد اور مریم مراد سے ملاقات اچھی

تھی۔ "ایک تھی مثال" ناول تو اچھا ہے۔ لیکن بہت ہی آہستہ جارہا ہے اور یہ کیا... رقص بسمل میں تو ابھی انٹرسٹ لگا تھا۔ ایک مہینہ پھر انتظار... باقی دونوں مکمل ناول اور ناولٹ بھی پسند آئے۔ "سیاہ حاشیہ" بہت ہی دلچسپ لگا۔ اب دیکھیں آگے آگے کیا ہوتا ہے۔ افسانے چاروں اچھے تھے۔ ایمل رضا کا یہ جملہ بہت پسند آیا۔

"عورت پر سازش تی کا ستارہ تو پچھلے سات قرنوں سے چمک رہا ہے۔ پھر وہ ساحلوں کے دیپ کیسے دیکھ سکتی ہے۔ اور محبت کے گیت کیسے سن سکتی ہے؟"

باقی سارے سلسلے بھی اچھے تھے۔ مجھے "تاریخ کے جھروکوں سے" کا سلسلہ بہت پسند ہے۔

ج: پیاری سعدیہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید ہمیں احساس ہے کہ آپ کو خط پوسٹ کرنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ پھر بھی ہم یہی کہیں گے کہ آپ ہمیں خط ضرور لکھیں تاکہ ہم آپ کی رائے جان سکیں۔

تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کی پڑھنے کی رفتار جتنی تیز ہے، تبصرہ بھی اتنا ہی اچھا کیا ہے۔ سمیرا حمید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

خالقہ سراج، بیلا، تلوکراں سے لبنیٰ اریحام تلوکر نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع دل کے شوق اور آنکھوں سے پڑھتی ہوں۔ ماڈل بھی سوہنی تھی، ڈریسنگ بھی دلکش۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح پیاری۔ روبرو میں سمیرا سے مل کر راحت اور عجب سی شادمانی ملی۔ "پہلی بار" بہت اچھی تھی۔ ایک تھی مثال اور خواب تھا کوئی زبردست۔ ناولٹ دونوں اچھے تھے۔ افسانے بھی بہترین تھے۔ مگر "کام کی چیز ان چاہا من چاہا" نے دل لوٹ لیا۔

ج: پیاری لبنیٰ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کے گاؤں سے پہلی بار خط ملا ہے۔ جب کسی ایسے دور دراز علاقے سے خط ملتا ہے، جس کا نام بھی ہم نے نہیں سنا ہوا ہوتا تو ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے۔ خوب صورت لکھائی میں لکھے ہوئے آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب گاؤں میں بھی لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

ایبہا، سکان سعید، قلعہ دیدار سنگھ

میرے تین خط آپ نے ردی کی ٹوکری کی نذر کیے ہیں۔ میرے دل کے بے شمار ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے اور اب پھر سے ٹکڑوں کو یکجا کر کے دل مکمل کیا اور خط لکھنے بیٹھ گئی۔ کچھ باتیں آپ سے شیئر کرنی ہیں۔ پہلے آپ خدارا یہ بتائیں۔ "کیا خوش ہو تم" کے لیے آپ کی کیا رائے ہے۔ مراز پر میرا طویل انتظار تو ختم ہوا میں نے سب سے [illegible] شہرت کیا ہے۔ مجھے کامیابی کی دعائیں ملی۔ جاننے والے کہتے ہیں بغیر استاد کے تم کیسے کامیاب ہو سکتی ہو۔ آپ نے کہا تھا آپ مصنفین کا انٹرویو خواتین میں دیں گی۔ پلیز خواتین میں نہیں شعاع میں دیں۔ پلیز پلیز اور یہ خواہش صرف میری ہی نہیں ان سب قارئین کی ہے جو صرف شعاع پڑھتی ہیں۔

ج: پیاری ایبہا! آپ نے واقعی کافی ناول، ناولٹ بھجوائے ہیں۔ ہم نے پڑھے بھی ہیں۔ اچھا لکھتی ہیں آپ لیکن تھوڑی اصلاح کی ضرورت ہے۔ دراصل ہمیں اصلاح کے لیے وقت نہیں مل رہا لیکن آپ سے وعدہ ہے کہ وقت نکال کر اصلاح کریں گے اور آپ کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور شائع ہوگی۔

شعاع میں مصنفین سے کوئی سلسلہ جلد شروع کریں گے۔ فی الحال ہم نے خواتین ڈائجسٹ میں مصنفین سے سوال و جواب کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔

ملائکہ کوثر بسم اللہ پور سے تشریف لائی ہیں لکھتی ہیں

گزشتہ تین سال سے اس سعی میں ہوں کہ آپ کو خط لکھوں۔ پانچ چھ کو رسالہ ملتا ہے تو اسے پڑھنے میں مہینہ ختم۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ دیہی زندگی کی روٹین خاصی ٹف ہوتی ہے۔ پھر میری لائف کی ذمہ داریاں۔ "پہلی شعاع" سے پڑھنا شروع کرتی ہوں۔ اس کے خوب صورت احساس مند حروف جیسے دل میں گھر کر جاتے ہیں۔ پھر "حمد و نعت" اور "پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں" سے قلب و نظر کو منور کرتے ہیں۔ "ایک تھی مثال" رخسانہ نگار اور رقص بسمل نبیلہ عزیز کا یہ دونوں ناول زبردست ہیں۔ مگر اتنی مختصر قسط ہوتی ہے کہ ادھر شروع ادھر ختم "شام خزاں" طویل سہی "فرح بخاری کی 70 صفحوں کی طویل ترین کہانی پہلے طوالت کی وجہ سے بھی چھوڑ دی۔ کہانی میں بچوں کا ذکر تھا جس کی وجہ سے

- "حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ" مصنفین سے سروے،
- عمیرہ احمد کا ناول "آبِ حیات"،
- عنت سحر طاہر کا ناول "بن مانگی دعا"،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول "نمل"،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول "عہد الست"،
- نبیلہ ابر راجہ اور حیا بخاری کے مکمل ناول۔
- اُم ایمان قاضی اور عمرین ولی کے ناولٹ،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، علیشبہ احمد، غزالہ روشن اور ازکیٰ اخلاق بٹ کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ "صباحت بخاری" سے ملاقات،
- نوجوان نسل کے نمایاں فنکار "آغا وحید قریشی" سے باتیں،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا مئی 2015 کا شمارہ آج ہی خریدلیں۔

میں پڑھ چکی ہوں کسی اور ڈائجسٹ میں "خواب تھا کوئی" بہترین کہانی ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے۔ جو زفین مشاغل ہے اور غلام مصطفیٰ ہادی ناولٹ میں "شہر خواب" اچھی کاوش تھی۔ موجودہ دور کی آزادانہ سوچ کی حامل لڑکیوں کے لیے بہت ہی سبق آموز۔

ج - پیاری عائشہ! آپ کا خط پڑھا۔ بہت اچھا خط لکھا آپ نے تفصیلی تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ "سانزہ ستی" پر آپ کا اعتراض بجا ہے۔ زینب کو بہت کچھ حاصل تھا، جس کے سہارے وہ زندہ رہ سکتی تھی۔ لیکن بات حوصلے اور ہمت کی ہوتی ہے اور یہ بھی کہ آپ جذبات کے کس مقام پر ہیں۔ کسی بھی جذبے کی شدت انسان کو تکلیف دیتی ہے۔ خواہ محبت ہو یا نفرت۔ زینب محبت میں ناکامی کے بعد زندگی سے سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی۔ انسان ٹوٹ جائے، مایوس ہو جائے تو ہمت اور حوصلہ جواب دے جاتا ہے اور یہ تو آپ مانیں گی تاکہ کہانیوں میں جو اینڈ ہوتے ہیں وہ حقیقی زندگی میں نہیں ہوتے۔ انصاف کے لیے تبدیلی کے لیے خوش حالی کے لیے جدوجہد کرتے نسلیں گزر جاتی ہیں۔ قدرت انصاف کرتی ہے، لیکن بہت انتظار کے بعد جبکہ کہانیوں میں تو چالیس پچاس صفحات میں سارے کرداروں کو انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا مضمون کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37-اردو بازار کراچی

مریم بنت ارشاد، رحیم یار خان سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

خط شائع نہ ہوا، سوچا ادارے والوں نے تو ناراضی بنتی ہے، سو گھر بیٹھ کر خود ہی سے ناراض رہنے سے بہتر ہے کہ خط لکھ کر ناراضی کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اگر اب بھی میرا خط شائع نہ ہوا تو پھر بھی کوشش نہیں کرنی بس... سمیرا حمید! اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہترین تخلیقی ذہن سے نوازا۔ لفظ موتیوں کی صورت اوراق پر سج گئے۔ قصہ گوئی، واقعات کا تسلسل، کرداروں کی خوبیاں، منظر کشی، برجستگی، دارا، پوتی کی بے مثال محبت، اردو ادب پر بہترین گرفت منظر نگاری کا تارچ ھاؤ، محبت کا درس دیتی ہوئی۔

ج - پیاری مریم! آپ کی ناراضی سر آنکھوں پر، ناراضی گلے شکوے اپنوں سے ہی ہوتے ہیں۔ آپ سو بار ناراض ہوں ہم آپ کو سو بار منائیں گے۔ سمیرا حمید تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- نیہا علی
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا

پریشانی

لیجیے جناب اب خواتین کے لیے ایک نئی فکر۔
ایک برطانوی ریسرچ کے مطابق خواتین کے ہینڈ بیگز میں کسی ٹوائلٹ کے مقابلے میں زیادہ بیکٹیریا پرورش پاتے ہیں۔ (ہائیں۔۔۔ ارے جلدی سے اپنا بیگ۔۔۔) اور ہر پانچ میں سے ایک ہینڈ بیگ میں اتنے بیکٹیریا موجود ہوتے ہیں جو انسانی صحت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ (چھوڑیں۔۔۔ یہ تو برطانویوں کے چونچلے ہیں ہمارے یہاں تو۔۔۔) انشیل ہائی جین کے ٹیکنیکل مینجر پیٹر بیرٹ کے مطابق خواتین کے ہینڈ بیگ میں موجود ہینڈ کریم میں سب سے زیادہ بیکٹیریا موجود ہوتے ہیں اور اگر خواتین اپنے چمڑے کے بنے ہینڈ بیگز کو دھونا معمول نہ بنائیں تو انہیں صحت کے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

انکشاف

سویڈن کے سائنس دانوں نے ایک تحقیق میں انکشاف کیا ہے کہ پالک کے استعمال سے وزن کم ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا جوس ایک مخصوص مقدار میں روزانہ نہار منہ پیا جائے تو یہ بھوک کی انتہا کو کم کرتا ہے اور یوں وزن کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ایک نئی تحقیق کے مطابق پالک کھانے سے دماغ بھی تیز ہوتا ہے۔ امریکی ریسرچ کے مطابق ہرے پتوں والی سبزیاں زیادہ سے زیادہ کھانے سے الزائمر کی شکایت کو بھی تادیر روکا جا سکتا ہے۔

اعزاز

یوں تو دنیا بھر میں فنکاروں کو بہت سے اعزازات اور ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے' لیکن ایک پاکستانی گلوکار

کو امریکا کے ایک قانون نافذ کرنے والے ادارے کا رکن بنایا گیا ہے۔ مزے کی بات ہے کہ اس گلوکار نے اس کی کوئی ٹریننگ حاصل نہیں کی ہے۔ جی! ہم بات کر رہے ہیں عدنان سمیع خان کی امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر ہوسٹن میں پرفارم کرنے پر ٹیکساس

پولیس ڈیپارٹمنٹ نے انہیں ٹیکساس کا اعزازی ڈپٹی شیرف بنا دیا ہے۔ (لو جی! یہ اعزاز بھی حاصل ہو گیا عدنان کو؟) جبکہ ٹیکساس کاؤنٹی شیرف کو انتخابات کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے' لیکن عدنان کو یہ عہدہ اعزازی طور پر دیا گیا ہے۔ ٹیکساس میں کسی بھی ایشیائی اور پاکستانی کو اعزازی طور پر ڈپٹی شیرف بنانے کا یہ پہلا موقع ہے۔ عدنان سمیع خان نے اس موقع پر ٹیکساس پولیس ڈیپارٹمنٹ اور ریاست کے موجودہ شیرف مسٹر ایڈرین گارشیا کا بھی شکریہ ادا کیا۔

انکار

پاکستان میں شوبز کی دنیا کا ہر فنکار بھارتی انڈسٹری میں کام ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کا چہرہ (کام تو بعد میں دکھایا جاتا ہے)

کسی بھارتی ڈائریکٹر کی نظر میں آجائے تو اس کی نیا پار لگ جائے' ایسے میں علی ظفر نے (جو بالی ووڈ میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں) تین مقبول فلم ساز اداروں کو فی الحال منع کر دیا۔ (حیرت ہے نا کسے) علی ظفر اس سال خود فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ مختلف اسکرپٹ پر غور کر رہے ہیں۔ (لیجیے جناب اب رائٹرز کسی نہ کسی طرح علی ظفر تک اپنا اسکرپٹ پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ زور کس پر ہو گا کریں گی "پیسہ")

بالی عمریا

اسٹیج اور فلم کی اداکارہ نرگس شوبز کو خدا حافظ کہہ کر کینیڈا چلی گئی تھیں اور ظاہر یہ کیا تھا کہ وہ تائب ہو گئی ہیں مگر (چھٹتی نہیں منہ کو یہ کافر لگی ہوئی) اب نرگس نے شوبز میں واپسی کا اعلان کر دیا ہے۔ (کیونکہ اب انہیں انڈسٹری میں جان پڑتی محسوس جو ہو رہی ہے ٹی وی والوں کی وجہ سے) اور ان کی واپسی ہدایت کار پرویز رانا کی فلم "دشمن رانی" کے ذریعے ہو رہی ہیں۔ نرگس اس فلم میں سولہ سالہ لڑکی کا کردار کر رہی ہیں۔ (دھڑام۔۔۔ دھڑام۔۔۔ بھئی جو انڈسٹری اب ذرا اٹھی تھی اس فلم کے بعد تو۔۔۔) نرگس نے اس فلم کے لیے باقاعدہ ورزش شروع کر دی ہے۔ پرویز رانا کو پوری

امید ہے کہ نرگس کی محنت رنگ لائے گی۔ (ہائے یہ بے چارے ہدایت کار اور ان کی امید؟ جب ہی تو یہ نرگس۔۔۔؟)

کچھ ادھر اُدھر سے

☆ چوہدری سرور "تاریخ ساز" گورنر تھے۔ گورنر صوبے میں وفاق کا نمائندہ ہوتا ہے' لیکن آپ صوبے میں ایک مولانا صاحب (طاہر القادری) کے نمائندے تھے۔ یوں انہوں نے تاریخ بنائی۔ مزید "تاریخ" نہ بن سکی کہ دھرنے سمٹ گئے اور آپ کی گورنری نپٹ گئی۔

(عبداللہ طارق سہیل۔۔۔ نئی بات)

☆ شیخ رشید صاحب کے بارے میں نجومیوں نے پیش گوئی کی ہے کہ اس سال ان کی شادی ہو جائے گی۔ کئی لوگ اس پیش گوئی کا اعتبار نہیں کر رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شیخ صاحب کی ساری ہم سنیں بلکہ ان کے دور کی کم سنیں بھی دادی نانی بن چکیں کچھ تو جہاں سے کوچ بھی کر گئیں۔ اب شیخ رشید بٹ کے لیے "تو ٹیکھنسی" والا ماجرا ہے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

آلو کا رائتہ

اجزا:

آلو	دو عدد (اُبلے ہوئے)
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
پودینہ	ایک گٹھی
ہری مرچ (باریک کٹی ہوئی)	تین سے چار
دہی	ایک پاؤ
زیرہ، کڑی پتہ	بگھار کے لیے
کٹی مرچ، کالی مرچ	حسب ذائقہ

ترکیب:

آلو اُبال کر میش کرلیں پھر اس میں حسب ذائقہ نمک، کٹی مرچ، کالی مرچ، ہرا دھنیا، پودینہ اور تھوڑی سی کٹی ہوئی پیاز ملا کر ان کو چھوٹی چھوٹی پاٹز کی شکل دے دیں۔

ایک پیالے میں دہی ڈال کر پھینٹ لیں پھر اس میں آلو کی پاٹز ملا لیں۔ ہرا دھنیا، ہری مرچ اور پودینہ پیس کر کے پیسٹ بنائیں۔

اب فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے پہلے زیرہ گول اور کڑی پتا ڈالیں پھر اس کے ساتھ پیسٹ ڈال دیں اور پھر اس بگھار کو دہی کے اوپر ڈال دیں۔ مزیدار آلو کا رائتہ چاہیں تو روٹی یا پھر چاول کے ساتھ تناول فرمائیں۔

کیری کا اچار

اجزا:

کیری (کچے آم)	چار کلو
	چار چار ٹکڑوں میں تقسیم کر لیں۔
میتھی دانہ	سو گرام
رائی	ایک سو پچیس گرام
ثابت سرخ مرچ	سو گرام پیس لیں
سونف	ایک سو پچیس گرام
کلونجی	ایک سو پچیس گرام
ہلدی	سو گرام
نمک	دو سو پچاس گرام
سرسوں کا تیل	تین سے چار لیٹر

ترکیب:

آم کے ٹکڑوں کو دھولیں اور صاف کاٹن کے کپڑے پر پھیلا دیں تاکہ خشک ہو جائیں۔ جب خشک ہو جائیں تو اس میں ہلدی اور نمک اچھی طرح ملا دیں اور مرتبان میں ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ اوپر سے ململ کا دوہرا کپڑا باندھ کر چوبیس گھنٹوں کے لیے رکھ دیں۔ دوسرے دن مرتبان کھولیں اور کیری کے ٹکڑوں کو باہر نکال کر صاف کر کے کاٹن کے کپڑے پر پھیلا کر خشک کر لیں۔ اسی دوران مرتبان دھو کر خشک کر لیں۔ کسی برتن میں تیل اچھی طرح گرم کر کے ٹھنڈا کر لیں۔ کیری کے ٹکڑے جو خشک کیے تھے ان میں تمام خشک مسالا اچھی طرح ملا کر مرتبان میں ڈال دیں اور اوپر سے ٹھنڈا کیا ہوا تیل ڈال دیں۔ مرتبان ڈھک کر اوپر صاف ململ کا دوہرا کپڑا باندھ دیں۔ ایک ہفتے تک مرتبان دھوپ میں رکھیں۔ ایک ہفتے بعد اچار تیار ہے گا۔

آم کا مربہ

اجزا :

کچے آم	دو کلو
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
چینی	ڈیڑھ کلو
عرق گلاب	آدھا کپ

ترکیب :

آم دھو کر چھیل لیں۔ گٹھلی نکال کر آدھ انچ موٹی قاشیں کاٹ لیں اب ان کو ایک برتن میں رکھ دیں اور اتنا پانی ڈالیں کہ قاشیں ڈوب جائیں لیموں کا رس شامل کر کے دو سے تین گھنٹے تک ڈوبا رہنے دیں۔ اس کے بعد ایک دیگچی میں سادہ پانی ڈال کر قاشیں اس میں ابال لیں۔ خیال رہے زیادہ گلنے نہ پائیں۔ ابل جانے پر پانی پھینک دیں۔ اب الگ سے چار گلاس پانی میں چینی ملا کر شیرہ تیار کریں۔ اب اس میں آم کی قاشیں ملا کر پکائیں۔ جب شیرے میں تار بننے لگے تو چولہا بند کر دیں اور عرق گلاب شامل کرنے کے بعد ٹھنڈا ہونے پر جار میں محفوظ کر لیں۔

کیری کا شربت

اجزا :

کیری	ایک کلو
لیموں	چار عدد
پانی	دو لیٹر
چینی	ایک کلو
کالا نمک	چٹکی بھر
پودینہ	چند پتے

ترکیب :

سب سے پہلے کیریاں چھیل کر ایک تام چینی یا اسٹین لیس اسٹیل کی دیگچی میں پانی کے ساتھ اچھی نرم ابال لیں۔ جب کیریاں گل جائیں تو اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ اسی پانی میں کیریوں کا گودا بنا لیں اندر کی گٹھلی پھینک دیں پھر بلینڈر میں ڈال کر پیس لیں۔ بلینڈ ہوئی کیریوں کو دیگچی میں ڈال کر ساتھ میں چینی ڈال کر ہلکی آنچ میں پکائیں۔ جب چینی گل جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو لیموں کا رس ڈال دیں اور کالا نمک چھڑک دیں۔ اور بوتل میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں۔ جب پیش کرنا ہو تو دو کھانے کے چمچے گلاس میں ڈال کر ٹھنڈا پانی ملا کر پودینے کے پتے اوپر سے سجا کر پیش کریں۔

کیری کی چٹنی

اجزا :

کیریاں	آدھا کلو
ثابت لال مرچ	دس عدد
سفید سرکہ	آدھا کپ
کلونجی	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لیموں	دو عدد
کشمش	بارہ عدد
چینی یا گڑ	ڈیڑھ کپ
ادرک	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ (باریک کٹی ہوئی)

ترکیب :

کیریاں چھیل کر کدو کش کر لیں۔ اسٹیل کے پین میں کیری، ثابت لال مرچیں، کشمش، سرکہ، چینی یا گڑ، کلونجی، نمک اور ادرک ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھک کر پکائیں۔ جب چینی یا گڑ کا شیرہ بن جائے تو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ جب چٹنی ٹھنڈی ہو جائے تو لیموں کا جوس شامل کر کے اچھی طرح ملا لیں۔ کسی صاف جار میں ڈال کر محفوظ کر لیں۔ لیموں سے چٹنی کبھی خراب نہیں ہو گی۔ چٹنی پکاتے ہوئے لکڑی کا چمچ استعمال کریں۔

ہاتھوں اور پیروں کی خوشنمائی کے لیے

خوب صورتی میں جس قدر اہمیت چہرے کو حاصل ہے۔ اتنے ہی اہم ہمارے ہاتھ اور پاؤں بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم محض لاپروائی کی بنا پر نظر انداز کردیتے ہیں۔ ہم آپ کو نہایت آسان اور کم وقت طلب چند گھریلو ٹوٹکے بتاتے ہیں جو آپ کے ہاتھوں اور پیروں کو خوب صورت بناسکتے ہیں۔

آپ کے ہاتھ

اپنے برتن دھونے کی جگہ پر ہی ایک کھلے منہ کی ایسی شیشی یا جار میں ایک لوشن بنا کر رکھ لیں جو برتن دھونے کے بعد آسانی سے انگلیاں ڈبو کر لگایا جاسکے یہ بہترین اسکن ٹانک و موسچرائزر ہے جو آپ گھر پر بناسکتی ہیں۔

اجزا:

لیموں کا رس ــــــ آدھا کپ
گلیسرین ــــــ آدھا کپ
گلاب کا عرق ــــــ ایک کپ
وٹامن ای کیپسول ــــــ تین عدد

ترکیب:

ان تمام اشیا کو ملا کر ایک محلول تیار کرلیں اور شیشی میں بھرلیں اور برتن دھونے کے بعد ہاتھوں پر ملیں۔ یہ ایک بہترین لوشن ہے جو نہ صرف خشک اور پھٹی ہوئی جلد کی مرمت کرتا ہے بلکہ رنگت کو نکھارتا اور ملائم بناتا ہے۔

ہر روز جب آپ کام سے فارغ ہوں عموماً "رات کے وقت عشاء کے وضو سے قبل صرف دس منٹ اپنے ہاتھوں اور پیروں کو دیجیے۔

آپ کے ہاتھ پیر

اجزا:

سرسوں کا تیل ــــــ دو چائے کے چمچے
لیموں کا رس ــــــ ایک چائے کا چمچہ
چینی ــــــ آدھا چائے کا چمچہ
میٹھا سوڈا ــــــ ایک چٹکی
سرکہ ــــــ چند قطرے

ترکیب:

ایک پیالی میں یہ چیزیں ملا کر ایک اسکرب سا بنالیں۔ اب اس سے اپنے ہاتھوں پر ہلکا ہلکا مساج کریں اور ٹھیک اسی طرح پیروں پر دونوں طرف رگڑیں۔ جب چینی گھس کر ختم ہوجائے (ایسا پانچ منٹ کے مساج سے ہوجائے گا (خیال رہے چینی زیادہ موٹی نہ ہو) تو ایک جالی کے کپڑے کا گولا سا بنا کر اسی کام کے لیے مخصوص کرلیں۔ اب اس جالی پر کوئی سا بھی سوپ پانی کے ساتھ لگائیں اور ذرا مسل کر خوب جھاگ بنالیں۔ اب اس گولے سے اپنے ہاتھ اور پاؤں رگڑ کر صاف کریں۔ خصوصاً "ناخن کے اطراف' پھر نیم گرم پانی سے دھولیں اور جو لوشن آپ نے بنا کر رکھا ہوا ہے' اسے ہاتھوں' پیروں پر سونے سے قبل لگائیں' آپ کے ہاتھ اور پیر سدا جوان اور حسین رہیں گے۔

ہاتھوں کی روزانہ کی ورزش

صبح نماز فجر کے بعد اپنے ہاتھوں پر پیٹرولیم جیلی مل کر نرم کرلیں۔ پھر ایک میز پر انہیں کھول کر رکھیں اور انگلیاں خوب کھول کر پورا پنجہ پھیلا دیں۔ ایک سے دس تک گنتیں' پھر انگلیاں سکیڑیں ہمٹھی بند

کریں، پھر کھولیں، یہ عمل کم از کم پانچ بار کریں۔ آپ کے کھلے ہوئے ہاتھ کا بوجھ میز پر پورا رہنا چاہیے۔ جیسے آپ میز کو دبا رہی ہوں۔ پھر اپنے ہاتھ ڈھیلے کرکے نیچے کو لٹکائیں، دس تک گنتی گنیں اور ایک دم اوپر کو سیدھے اٹھائیں۔ دس تک گنیں اور جھٹک کر نیچے گرائیں، یہ عمل بھی کم از کم پانچ بار کریں اور دن میں دو، تین بار کام سے فراغت کے دوران اپنے ہاتھوں کو سینے ذرا اکڑائیں، پھر انگلیوں کو کبھی کھولیں، کبھی بند کریں۔ کبھی نیچے جھٹکیں، کبھی اوپر اٹھائیں۔۔۔ ایسا کرتے رہنے سے ایک تو آپ کی انگلیاں سڈول رہیں گی، دوسرا کبھی ہاتھ تھکن کا شکار نہیں ہوں گے۔ تیسرا آپ کے کندھے اور بازو نہیں دکھیں گے۔

آپ کے پیروں کی ورزش

اسی طرح صبح ہاتھوں کی ورزش کے بعد پیروں کے بل بالکل سیدھی کھڑی ہوں اور پھر اپنی ایڑیاں اوپر اٹھالیں اور پنجوں کے بل چلنا شروع کردیں، دس قدم لے کر رکیں اور پاؤں دھیرے سے زمین پر رکھ دیں۔ پانچ بار یہ عمل کریں۔ اس کے بعد بیٹھ کر اپنی ٹانگیں بالکل سیدھی کرلیں، یہاں تک کے آپ کے پیر اکڑ محسوس کرنے لگیں، اب ان پر توجہ مرکوز کرکے انہیں اسی حالت میں دائیں بائیں حرکت دیں اور سامنے کرکے پاؤں کی انگلیوں کو حرکت دیں۔ کھولیں، بند کریں، نیچے اوپر کریں۔ پانچ بار یہ عمل دہرائیں، پھر دھیرے سے انہیں ڈھیلا کریں اور اٹھ کھڑی ہوں۔ ایک ٹانگ پر کھڑی ہوکر تین بار دایاں پاؤں جھٹکیں۔ پھر تین بار بایاں۔ اب آپ دن بھر کے کام کاج کے لیے اپنے پیروں اور ٹانگوں میں ایک قدرتی طاقت اور لچک محسوس کرنے اور تازہ دم رہنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ ورزشیں آپ کے ہاتھوں اور پیروں کے پٹھوں کو لچک دار اور مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ ان میں دوران خون کو متحرک رکھتی ہیں جو خوب صورتی اور تازگی کا باعث ہوتی ہیں۔

چھوٹی چھوٹی باتیں

☆ ہر رات سونے سے پہلے اپنے ہاتھوں پر کوئی کریم یا لوشن لگا کر مساج ضرور کریں۔

☆ ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور ہاتھوں کا فیشل کریں اور ان پر ماسک بھی لگائیں۔

☆ اپنے ناخن صاف رکھیں، ان کے اطراف کو پرانے ٹوتھ برش کے ساتھ ہلکی رگڑ کے ساتھ صاف ضرور کریں۔

ہاتھوں اور پیروں کا فیشل

اجزا:

سرسوں کا تیل	آدھا چمچہ
زیتون کا تیل	آدھا چمچہ
گلیسرین	آدھا چمچہ
بالائی	ایک چمچہ

ترکیب:

انہیں آپس میں مکس کرکے اپنے ہاتھوں اور پیروں پر پانچ منٹ تک مساج کریں، اب ایک کھلے ٹب میں گرم پانی ڈالیں اور اس میں چند قطرے لیموں کا رس چند قطرے برتن دھونے کا لیکوئیڈ اور چند قطرے کوئی شیمپو ڈالیں۔ ڈیڑھ چمچہ نمک اور چٹکی بھر میٹھا سوڈا بھی ڈال دیں۔ اب اس گرم پانی میں اپنے ہاتھ اور پیر ڈبو دیں۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد ہاتھوں کو جالی دار کپڑے سے رگڑیں اور پیروں کی ایڑیوں کو جھانویں یا پھر ایک استعمال شدہ پرانے اسکاچ برائٹ سے رگڑیں، تاکہ مردہ کھال اتر جائے۔ پرانے ٹوتھ برش سے انگلیوں کے درمیان اور اطراف کو صاف کریں اور دھولیں۔ بعد ازاں ایک لیموں کا استعمال شدہ چھلکا لے کر ہاتھوں پر خصوصاً اس کی انگلیوں کے پچھلے پوروں پر رگڑیں اور چھوڑ دیں۔ یہی عمل پیروں کے ٹخنوں اور ایڑیوں پر کریں۔